مواعظِ عثمانی

اصلاحی تقاریر و مضامین کا موضوع وار مجموعہ

(حصہ اول)

ایمان، عقائد و نظریات

جلد: ۱

مفتی محمد تقی عثمانی

مکتبۂ معارف القرآن کراچی

(Quranic Studies Publishers)

مواعظِ عثمانی

ایمان، عقائد و نظریات

جلد اول

مفتی محمد تقی عثمانی

ترتیب و تخریج
مولانا عنایت الرحمٰن

مکتبہ معارف القرآن کراچی
(Quranic Studies Publishers)
Karachi, Pakistan.

پیش لفظ

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ

الحمد لله رب العالمين، والصلاة والسلام على رسوله الكريم وعلى آله وأصحابه أجمعين، وعلى كل من تبعهم بإحسان إلى يوم الدين

میرے والد ماجد حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب قدس اللہ سرّہ نے بندے کو دارالعلوم ۱۹۵۹ء میں دورۂ حدیث کی تکمیل کے بعد ہی سے جمعہ کی تقریر کرنے پر مقرر فرمادیا تھا، شروع میں اپنے لسبیلہ ہاؤس والے گھر کے قریب عزیزی مسجد میں کئی سال جمعہ کی تقریر کرتا رہا، پھر حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی علالت کے بعد جامع مسجد نعمان لسبیلہ ہاؤس میں سالہا سال جمعے کی تقریر کی نوبت آتی رہی۔ ۱۹۹۹ء میں میرے استاد گرامی حضرت مولانا سحبان محمود صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی وفات ہوئی جو جامع مسجد بیت المکرم میں جمعہ پڑھایا کرتے تھے اور ان کی تعلیمات کا فیض دور تک پھیلا ہوا تھا، اس موقع پر مجھے جامع مسجدِ نعمان لسبیلہ ہاؤس سے بیت المکرم منتقل کیا گیا اور وہاں ۱۹۹۹ء سے ۲۰۲۰ء تک جمعہ کی تقریر کا سلسلہ رہا۔

میرے شیخ مکرم حضرت ڈاکٹر عبد الحی عارفی صاحب قدس اللہ سرہ کی

وفات کے بعد میرے استاذ حضرت مولانا سحبان محمود صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے حکم پر میں نے لسبیلہ ہاؤس کی جامع مسجد نعمان میں اور پھر بیت المکرم میں اتوار کے دن عصر کے بعد ایک اصلاحی مجلس کا سلسلہ شروع کیا، اس وقت میری تقریریں محفوظ کرنے کا کوئی انتظام نہیں تھا اور نہ میں انہیں اس قابل سمجھتا تھا کہ انہیں شائع کیا جائے، لیکن میرے انتہائی مشفق دوست حضرت پروفیسر شمیم احمد صاحب (جو اس وقت ''معارف القرآن'' کا انگریزی ترجمہ کر رہے تھے) نے میرے معاون مولانا عبداللہ میمن صاحب سے یہ خواہش ظاہر کی کہ وہ ان تقریروں کو ریکارڈ کر کے قلمبند کر لیا کریں، چنانچہ انہی کی تحریک پر ان اصلاحی بیانات اور کسی قدر جمعے کے خطبوں پر مشتمل ایک طویل سلسلہ ''اصلاحی خطبات'' کے نام سے منظرِ عام پر آ گیا جس کی اب غالباً ۲۵ جلدیں ہو چکی ہیں۔

تجربے سے معلوم ہوا کہ بفضلہ تعالیٰ ان کی اشاعت مفید ہوئی اور حضراتِ ائمہ و خطباء بھی اپنی تقاریر میں ان سے مدد لینے لگے اور عام مسلمانوں کو بھی عام فہم انداز میں دین کی بنیادی معلومات آسانی سے پہنچنے لگیں، اس کے علاوہ بندہ کو مختلف مواقع پر کراچی یا کسی اور شہر میں، بلکہ کسی اور ملک میں بھی اس طرح کی تقریروں کا موقع ملتا رہا اور متعدد احباب انہیں قلمبند کر کے شائع کرتے رہے اور کسی خاص موضوع کے بارے میں انہی تقاریر سے متعدد مجموعے بھی مرتب کر کے شائع کیے گئے۔

مجھے ایک فکر ہمیشہ دامن گیر رہی کہ اصلاحی بیانات میں بسا اوقات واقعات اور احادیث میں صحت کا اتنا اہتمام نہیں ہوتا جتنا مستقل تالیفات میں ہوتا ہے، اس لیے میں نے اپنے احباب میں سے مولانا عنایت الرحمن صاحب کو اس پر

نامزد کیا کہ وہ میری تقاریر میں بیان کردہ احادیث یا سلف کے واقعات کی تحقیق وتخریج کریں اور جہاں غلطی ہوئی ہو، اس کی اصلاح کریں۔ میرے مشورے سے وہ یہ کام ماشاء اللہ قابلیت کے ساتھ کرتے رہے۔ مولانا عنایت الرحمن صاحب نے اس پر یہ اضافہ کیا کہ ''اصلاحی خطبات''، ''اصلاحی مجالس'' اور بیانات کے مختلف مجموعوں کو بھی عنوانات و مضامین کی ترتیب سے مرتب کیا اور جو تقاریر ''البلاغ'' میں یا کسی دوسرے رسالے میں شائع ہوئی تھیں یا کسی کتاب کا جز تھیں ان کا بھی استقصاء کر کے ایک نیا مجموعہ ''مواعظِ عثمانی'' کے نام سے مرتب کردیا اور اس لحاظ سے یہ بندہ کی تقاریر، مواعظ اور بیانات کا سب سے زیادہ جامع مجموعہ ہوگیا ہے اور حسبِ استطاعت اس میں تخریج و تحقیق کا بھی اہتمام ہے جس سے اس کے درجۂ استناد میں بھی اضافہ ہوگیا ہے۔

دل سے دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ عزیزِ موصوف کی اس کاوش کو اپنی بارگاہ میں قبول فرما کر اس بے عمل کے لیے ذخیرۂ آخرت بنادیں اور اس سے عام و خاص مسلمانوں کو فائدہ پہنچے۔ آمین

دارالعلوم کراچی ۱۴

بندہ

محمد تقی عثمانی عفی عنہ

۱۵/محرم ۱۴۳۳ھ

عرضِ مرتّب

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نحمدہٗ ونصلّی علٰی رسولہ الکریم اما بعد!
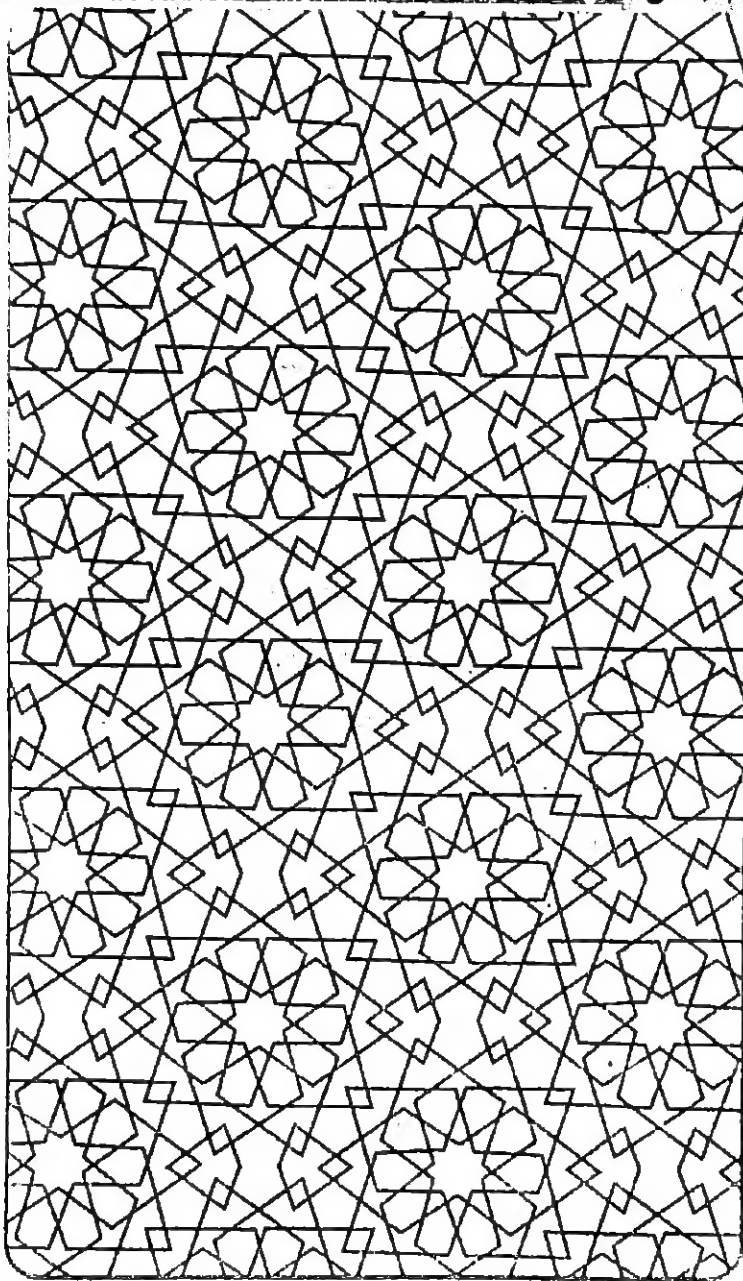
کچھ عرصے قبل بندے کو مکتبہ معارف القرآن کراچی کی طرف سے ایک علمی وتحقیقی مشورے کی مجلس میں مدعو کیا گیا، جس میں یہ طے کیا گیا کہ شیخ الاسلام حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب دامت برکاتہم کے مختلف کتب ورسائل میں بکھرے ہوئے بیانات کو موضوع وار یکجا کیا جائے اور ہر موضوع کا مواد ایک ساتھ ایک ہی جلد میں رکھا جائے تاکہ عوام الناس، طلبہ، علماء اور خصوصاً خطباء، واعظین اور محققین کے لیے ان تک رسائی آسان ہوجائے۔

چنانچہ بندے نے اللہ تعالیٰ پر توکل کرتے ہوئے اس کی حامی بھرلی اور حضرت والا دامت برکاتہم کے بیانات ومضامین کو جمع کرنا شروع کیا، اس کے لیے بندہ نے دار العلوم کراچی کے ترجمان ماہنامہ ''البلاغ'' کے تقریباً تیس سالہ شماروں کی ورق گردانی کی اور موضوع کی جامعیت کے لیے دارالعلوم کراچی کے عظیم کتب خانے میں وقتاً فوقتاً حاضری ہوتی رہی اور دیگر کتب خانوں سے طبع شدہ رسائل اور مجموعوں کو بھی سامنے رکھا گیا۔

اس طرح زیرِ نظر مجموعہ میں حضرت والا دامت برکاتہم کے جملہ بیانات

ومضامین کو شامل کیا گیا ہے جن میں:

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ۞ اصلاحی خطبات ۞ اصلاحی مواعظ

۞ اصلاحی مجالس ۞ خطباتِ عثمانی ۞ خطبات دورۂ ہند

۞ درس شعب الایمان ۞ نشری تقریریں ۞ فردکی اصلاح

۞ اصلاح معاشرہ ۞ تربیتی بیانات ۞ ذکر وفکر

۞ کا مکمل استیعاب کیا گیا ہے اور

۞ اسلام اور ہماری زندگی ۞ انعام الباری تقریر ترمذی

۞ جہانِ دیدہ ۞ سفر در سفر دنیا مرے آگے

۞ اسلام اور جدید معاشی مسائل ۞ اسلام اور ہمارا معاشی نظام

کے منتخب مضامین شامل ہیں۔

مجموعہ کی تکمیل کے لیے حضرت والا دامت برکاتہم کے بیانات ومضامین پر مشتمل دیگر کتب خانوں کے شائع کردہ مجموعوں اور غیر طبع شدہ بیانات (جن میں بعض بیانات ومضامین کسی رسالے میں شائع ہو چکے تھے اور بعض صوتی صورت میں محفوظ تھے جنہیں مرتب کر کے کتابت سے آراستہ کیا گیا) کا جائزہ لے کر متعلقہ مضامین زیرِ نظر مجموعہ میں شامل کئے گئے ہیں۔ ماہنامہ البلاغ کے شماروں کے ساتھ ساتھ دیگر جرائد ومجلات کی بھی ورق گردانی کی گئی ہے۔ اور اس دوران بعض کتب خانوں اور اداروں کی جانب سے حضرت والا دامت برکاتہم کے جو دیگر بیانات مختلف مجموعوں کی صورت میں شائع ہوتے رہے ان

کی بھی ورق گردانی کر کے اور جائزہ لے کر متعلقہ مضمون کو زیرِ نظر مجموعہ میں شامل کیا گیا ہے، تاکہ حتی الامکان حضرت والا دامت برکاتہم کا کوئی بیان یا مضمون اس مجموعہ میں آنے سے رہ نہ جائے۔اس سلسلے میں رفیقِ محترم جناب مولانا شاکر جکھورا صاحب زید مجدہم نے بھی معاونت فرمائی ہے۔ اللہ تعالی انہیں جزائے خیر عطا فرمائے آمین۔بندہ نے شعبہ "موسوعۃ الحدیث" کی مصروفیات کے ساتھ ساتھ یہ مجموعہ تیار کیا ہے۔اس میں بعض بیانات کی کمپوزنگ اور پروف ریڈنگ بھی بندہ نے کی ہے۔

سیدی وسندی ومرشدی حضرت والا دامت برکاتہم کو اللہ ربّ العزت نے جو بے پناہ مقبولیت عطا فرمائی ہے وہ محتاج تعارف نہیں۔حضرت والا دامت برکاتہم بیک وقت مفسر، محدث، فقیہ، ماہر معاشیات اسلامی، مؤرخ، محقق، شاعر، ادیب اور مبلغ و داعی اسلام ہیں۔اسی دعوت وارشاد کا سلسلہ عرصۂ دراز سے ہفتہ وار مجلس کی صورت میں تاحال جاری ہے اور الحمد للہ اس سے بلا مبالغہ لاکھوں انسانوں کو فائدہ ہورہا ہے جن میں غیر مسلم حضرات بھی شامل ہیں۔اور اسی دعوت وارشاد کی برکت سے بہت سارے غیر مسلم حلقہ بگوشِ اسلام ہوئے ہیں اور آج ایک کامیاب زندگی گزار رہے ہیں۔حضرت والا دامت برکاتہم کے انہی بیانات ومواعظ سے علماء طلباء اور خطباء کرام استفادہ کرتے چلے آرہے ہیں۔

حضرت والا دامت برکاتہم کا سلسلۂ دعوت وارشاد اس وجہ سے بھی نمایاں اور مفید تر ہے کہ حضرت والا دامت برکاتہم ایک ہی مجلس میں ایک موضوع کے تحت قرآن وسنت کے تمام ضروری مضامین سامعین کے سامنے

رکھ دیتے ہیں اس کے لئے تمام اکابرِ دیوبند خصوصاً حضرت حکیم الامت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی رحمہ اللہ، عارف باللہ حضرت ڈاکٹر عبد الحیٔ عارفی رحمہ اللہ اور مفتی اعظم پاکستان حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمہ اللہ کے علوم وفیوض کو اس دور کے تقاضوں کے مطابق سہل انداز میں سامعین کے سامنے پیش کرتے ہیں۔ اور حضرت والا دامت برکاتہم کو اللہ تعالیٰ نے یہ خاصہ عطا فرمایا ہے کہ حضرت والا دامت برکاتہم کی مجلس میں شرکت کرنے والا کوئی شخص تہی دامن نہیں رہتا۔ چاہے وہ مدارس وکالج کے طلبہ ہوں یا عام شعبہ زندگی سے تعلق رکھنے والے افراد ہوں۔ ان تمام خوبیوں کا اندازہ زیرِ نظر مجموعہ سے بخوبی لگایا جاسکتا ہے۔

زیرِ نظر مجموعہ کی چند نمایاں خصوصیات یہ ہیں:

① حتی الامکان موضوع کی جامعیت کا خیال رکھا گیا ہے تا کہ قاری کو کسی بھی موضوع سے متعلق حضرت والا دامت برکاتہم کے بیانات و مضامین یکجا مل سکیں۔

② بیانات ومضامین کا تکرار ختم کیا گیا ہے یعنی اگر ایک ہی بیان مختلف کتب خانوں سے مختلف ناموں کے ساتھ شائع ہوا ہو تو اس میں صرف جامع بیان کو لیا گیا ہے۔

③ جو بیان یا مضمون جس کتاب سے لیا گیا ہے اس کا حوالہ بھی درج کیا گیا ہے تا کہ بوقت مراجعت کسی قسم کی دشواری نہ ہو۔

④ بعض غیر شائع شدہ بیانات کو بھی شامل کیا گیا ہے۔ اس سلسلے میں ادارہ "مکتبہ معارف القرآن کراچی" نے ایک طویل فہرست تیار کی ہے اس میں متعلقہ مضمون تلاش کر کے زیرِ نظر مجموعہ میں مناسب مقام پر رکھا

گیا ہے۔

⑤ آیات واحادیث کی مکمل تحقیق کی گئی ہے اور حسب ارشاد حضرت والا دامت برکاتہم اس مجموعہ کی اصل خصوصیت یہی ''تحقیق'' ہے۔ اور تحقیق وتخریج میں وقتاً فوقتاً حضرت والا دامت برکاتہم سے بغرضِ مشورہ استفادہ ہوتا رہا ہے اور بوقت ضرورت حضرت والا دامت برکاتہم نے بعض مفید ترامیم بھی فرمائی ہیں۔ اور بندۂ پرتقصیر کو خصوصی دعاؤں سے بھی نوازا ہے۔ وللہ الحمد۔ دورانِ تحقیق بعض قابلِ مشورہ امور بندہ نے بالمشافہہ حضرت والا دامت برکاتہم کی خدمت میں پیش کئے ہیں اور بعض امور کی مراجعت رفیق محترم جناب مولانا شاکر جکھورا صاحب زید مجدہم کے توسط سے ہوئی ہے۔ اس طرح یہ مجموعہ الحمد للہ سابقہ تمام مجموعوں کا جامع ہے اور امتیازی خصوصیت کا حامل ہے۔

⑥ طبع شدہ بیان میں کسی قسم کی تبدیلی نہیں کی گئی بلکہ اصل کتاب کے مطابق انہیں رکھا گیا ہے۔ البتہ کتابت کی اغلاط سے انہیں پاک کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اور بوقت ضرورت اصل ماخذ یعنی محفوظ کردہ صوتی بیان کی بھی مراجعت کی گئی ہے۔

⑦ پروف ریڈنگ کا خاص اہتمام کیا گیا ہے خصوصاً آیاتِ قرآنیہ اور عربی عبارات کو خاص توجہ دی گئی ہے۔

اور اس پر ادارہ ''مکتبہ معارف القرآن کراچی'' نے زرِ کثیر خرچ کیا ہے۔

⑧ زیر نظر مجموعہ میں تحقیقی مقالات کو شامل نہیں کیا گیا اس کے لیے ایک

الگ سلسلہ شروع کیا گیا ہے وہ ان شاء اللہ الگ مجموعے کی زینت بنیں گے۔

تخریج و تحقیق میں مندرجہ ذیل امور کی رعایت رکھی گئی ہے

① حاشیہ میں ہر کتاب کا حوالہ جلد، صفحہ، حدیث نمبر، اور مطبع کا نام لکھا گیا ہے۔ تاہم مطبع کا نام صرف پہلے حوالے کے ساتھ لکھا گیا ہے، ہر حوالہ میں اس کا اعادہ نہیں کیا گیا۔ البتہ اگر کسی وجہ سے کسی دوسرے مطبع کی کتاب کا حوالہ لینے کی ضرورت پیش آئی ہے تو اس کے ساتھ طبع کی صراحت کردی گئی ہے۔
② بوقت ضرورت بعض حوالوں میں سندی حیثیت کو بھی نمایاں کیا گیا ہے۔
③ مضمون سے متعلق متبادل احادیث و روایات بھی حاشیے میں درج کی گئی ہیں۔
④ تخریج میں اصل مصادر کو سامنے رکھا گیا ہے اور انہی کا حوالہ دیا گیا ہے۔
⑤ حدیث کی جرح و تعدیل اور استنادی حیثیت میں متقدمین پر اعتماد کیا گیا ہے۔
⑥ تخریج میں چند حوالوں پر اکتفاء کیا گیا ہے، استیعاب نہیں کیا گیا تاہم ایک بات اگر متعدد روایات کا مجموعہ ہو تو حاشیہ میں ان متعدد حوالوں کو درج کیا گیا ہے۔
⑦ بعض مقامات پر صریح حوالہ نہ ملنے کی وجہ سے مؤیدات کو نقل کیا گیا ہے۔
⑧ زیر نظر مجموعہ میں کچھ واقعات قابلِ تحقیق ہیں جن کا کوئی حوالہ فی الوقت بندہ کو نہیں ملا اور انہیں حضرت والا دامت برکاتہم کی ہدایت پر برقرار

رکھا گیا ہے، کیونکہ یہ واقعات انہوں نے مستند علماء سے سنے تھے۔

⑨ تخریج وتحقیق کے سلسلے میں ممکنہ وسائل وذرائع سے کام لیا گیا ہے جن میں سر فہرست المکتبۃ الشاملۃ اور جوامع الکلم ہے۔ بعض مقامات کی تحقیق کے لئے مختلف ویب سائٹس اور پروگرامز سے بھی مدد لی گئی ہے۔ اور بعض عربی واردو مخطوطات کی بھی ورق گردانی کی گئی ہے۔

اس طرح اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم سے یہ مفید مجموعہ جامع تحقیق کے ساتھ آپ حضرات کے ہاتھوں میں ہے۔

اللہ تبارک وتعالیٰ سے دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس حقیری سی کاوش کو اپنے بارگاہ میں قبول فرمائے اور اس کاوش کو بندہ اور بندہ کے والدین اور اس کی طرف رہنمائی کرنے والے رفیق محترم ابن شیخ الاسلام ڈاکٹر مولانا حسان عثمانی اور مولانا شاکر صدیق جکھورا زید مجدہم اور اس میں خصوصی دلچسپی رکھنے والے ادراہ مکتبہ معارف القرآن کے ناظم جناب خضر اشفاق قاسمی صاحب اور ادارہ کے ذمے دار جناب محمد ایاز صاحب اور جن حضرات نے کسی بھی صورت میں اس مجموعہ کی تیاری میں معاونت فرمائی ہے، ان سب کے لئے ذخیرہ آخرت بنادے آمین۔ اور اللہ تبارک وتعالیٰ حضرت والا دامت برکاتہم کا سایہ عاطفت تادیر بخیر وعافیت ہمارے سروں پر قائم ودائم رکھے اور حضرت والا دامت برکاتہم کے علوم وفیوض سے زیادہ سے زیادہ بہرہ ور فرمائے۔ آمین۔

آخر میں گزارش اور استدعا ہے کہ زیر نظر مجموعہ کو حتی الامکان اغلاط سے پاک کرنے کی کوشش کی گئی ہے، لیکن بشری تقاضے کے پیشِ نظر غلطی کا رہ جانا ممکن ہے۔ قارئین کو اس قسم کی کوئی فروگزاشت نظر آئے تو حسبۃً للہ ادارہ

معارف القرآن کو مطلع فرمائیں تاکہ تحقیق کے بعد آئندہ کی طباعت میں اسے صحیح اور درست کیا جاسکے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کا حامی وناصر ہو۔

والسلام

از بندہ ابوسفیان عنایت الرحمن عفی عنہ

باحث شعبہ موسوعۃ الحدیث/ جامعہ دار العلوم کراچی

۳۰ ذی القعدۃ ۱۴۴۲ھ

فہرستِ عنوانات

اجمالی فہرست عنوانات

تفصیلی فہرست

صفحہ	عنوان

صفحہ	عنوان
۲۴۳	سب سے افضل ذکر "لا الہ الا اللہ"
۲۴۴	حضرت مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا تکیہ کلام

صفحہ	عنوان
۲۹۳	۞ مومن زندگی کیسے گزارتا ہے

توحیدِ باری تعالیٰ

نثری تقریریں ص (۵۵)
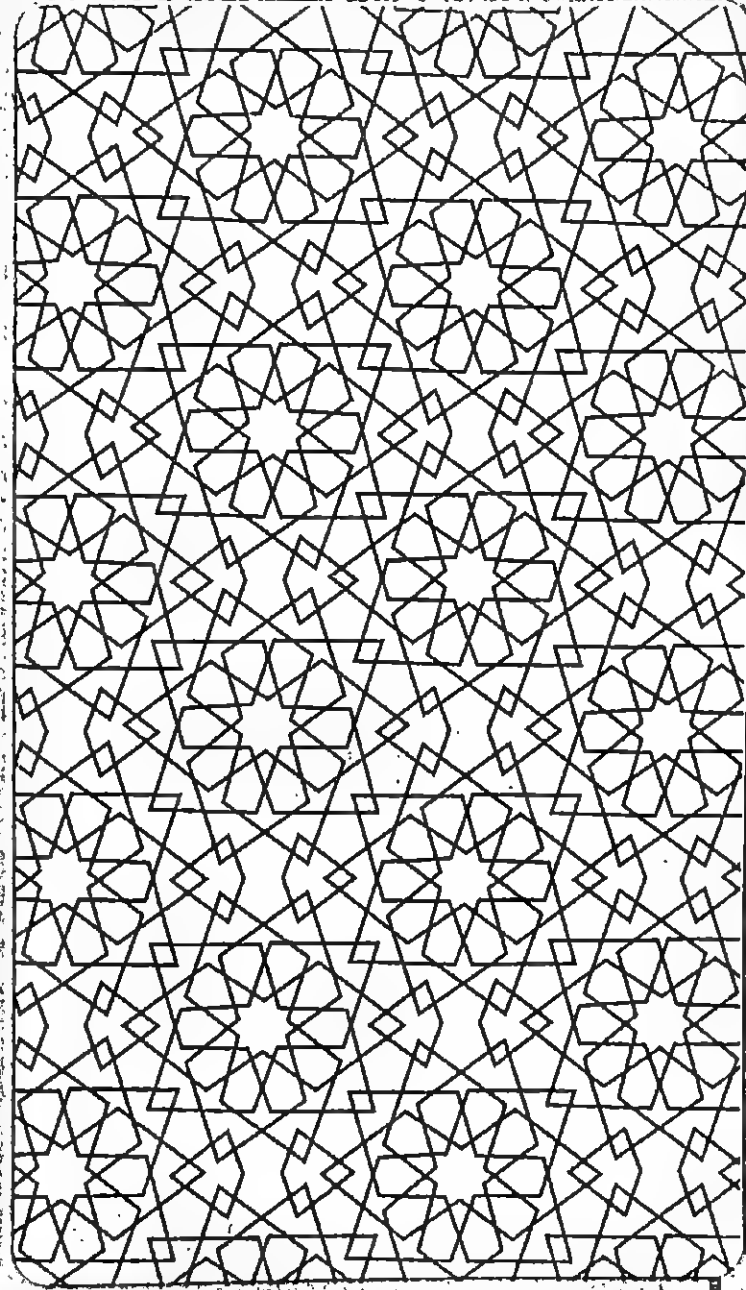
بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

توحیدِ باری تعالیٰ

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَنَسْتَعِيْنُهٗ وَنَسْتَغْفِرُهٗ وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّئَاتِ اَعْمَالِنَا، مَنْ يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهٗ وَمَنْ يُّضْلِلْهُ فَلَاهَادِيَ لَهٗ، وَاَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَاشَرِيْكَ لَهٗ وَاَشْهَدُ اَنَّ سَيِّدَنَا وَنَبِيَّنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَعَلٰى اٰلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ وَبَارَكَ وَسَلَّمَ تَسْلِيْمًا كَثِيْرًا كَثِيْرًا۔ اَمَّا بَعْدُ!

فَاَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيْمِ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

هُوَ اللّٰهُ الَّذِيْ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ عٰلِمُ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ ۚ هُوَ الرَّحْمٰنُ الرَّحِيْمُ ﴿۲۲﴾ (۱)

---

(۱) سورۃ الحشر، آیت (۲۲)۔

آمنت باللہ صدق اللہ العظیم، وصدق رسوله النبی الکریم، ونحن علیٰ ذٰلك من الشاهدین والشاکرین، والحمد للہ رب العالمین۔

بزرگانِ محترم اور برادرانِ عزیز! آج کی محفل میں ہمیں اسلام کے سب سے بنیادی عقیدے ''توحید'' کے بارے میں چند ضروری باتیں کرنی ہیں، ہر مسلمان جانتا ہے کہ اسلام کی بنیاد کلمۂ توحید پر ہے جو شخص بھی اسلام کے دائرے میں داخل ہوتا ہے، وہ کلمۂ توحید پڑھ کر یعنی لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ کا اقرار کر کے داخل ہوتا ہے، اس کلمۂ توحید کی انقلابی حیثیت بھی ہر مسلمان کو معلوم ہے اور اس کا یہ عجیب نتیجہ بھی کہ اس ایک کلمہ کو پڑھ لینے کے بعد انسان کی زندگی میں ایک عظیم الشان انقلاب رونما ہو جاتا ہے، یعنی جو شخص کہ اس کلمہ کو پڑھنے سے پہلے کافر تھا، وہ اس کلمے کے پڑھ لینے کے بعد مسلمان ہوجاتا ہے، پہلے جو شخص اللہ تعالیٰ کا مبغوض تھا، اس کلمے کے پڑھنے کے بعد اللہ تعالیٰ کا محبوب بن جاتا ہے، پہلے جو شخص جہنم اور دوزخ کا مستحق تھا، اس کلمے کے پڑھنے کے بعد جنت کا اور اللہ کی رحمتوں کا سزاوار بن جاتا ہے اور اگر میں یہ کہوں تو اس میں مبالغہ نہیں ہوگا کہ یہ ایک ایسا کلمہ ہے جو انسان کو ایک ہی لمحے میں جہنم کے ساتوں طبقے سے نکال کر جنت الفردوس کے اعلیٰ ترین درجے میں داخل کر دیتا ہے اور یہ کوئی شاعرانہ مبالغہ نہیں، بلکہ ایک ناقابلِ انکار واقعہ ہے، جس کی بے شمار مثالیں تاریخ اسلام میں ملتی ہیں۔

ذرا سی تشریح کے لیے ایک واقعہ آپ حضرات کے گوشِ گزار کرنا چاہتا ہوں، غزوۂ خیبر کا واقعہ جس میں نبی کریم سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم صحابہ کرام رضی اللہ عنہم

کی جماعت کے ساتھ یہودیوں کے سب سے بڑے قلعے پر حملہ آور ہوئے تھے اور وہاں کا محاصرہ کیا تھا، کیونکہ ان یہودیوں کی طرف سے مسلمانوں کے خلاف طرح طرح کی سازشیں کی جاتیں تھیں، نبی کریم سرکار دو عالم ﷺ نے جب اس قلعے کا محاصرہ کیا تو یہ محاصرہ کئی روز تک جاری رہا۔

اس محاصرے کے دوران خیبر کے شہر کا ایک چرواہا جس کا نام تاریخ میں اسود راعی ہے، وہ ایک روز اپنے شہر سے باہر نکلا اور اس کے دل میں یہ خیال پیدا ہوا کہ میں ذرا یہ معلوم کروں کہ یہ محمد رسول اللہ (ﷺ) جو اتنا بڑا لشکر لے کر اتنا بڑا فاصلہ طے کر کے اور مشقتیں اٹھا کر اس خیبر پر حملہ آور ہو رہے ہیں، ان کی بنیادی دعوت کیا ہے؟ اور ان کا پیغام کیا ہے؟ وہ کیا چاہتے ہیں؟ یہ معلوم کرنے کی غرض سے وہ چرواہا باہر نکلا اور مسلمانوں کے پڑاؤ کی طرف بڑھا، مسلمانوں کے پڑاؤ میں ایک شخص سے ملاقات ہوئی، اس سے اس نے یہ پوچھا کہ میں جاننا چاہتا ہوں کہ تم لوگ خیبر پر حملہ کرنے کے لیے کیوں آئے ہو؟ اور وہ کیا وجہ ہے کہ ہمارے شہر کے رہنے والے تمہارے دشمن ہیں؟ اور تمہاری بنیادی دعوت اور تمہارا بنیادی پیغام کیا ہے؟ وہاں ایک صحابی تھے انہوں نے خود اسلام کے عقائد کی تشریح کرنے کی بجائے اسود چرواہے سے کہا کہ تم ہمارے سردار یعنی محمد رسول اللہ ﷺ سے جا کر خود مل لو اور انہی سے یہ سوال کرو، وہ جواب میں تمہیں تفصیل کے ساتھ اپنی بنیادی دعوت اور پیغام بتا دیں گے۔

اسود راعی کے لیے یہ بات انتہائی حیرت انگیز تھی، اس لیے کہ وہ کبھی تصور بھی نہیں کر سکتا تھا کہ کسی لشکر کا سپہ سالار، کسی فوج کا بڑا افسر یا کسی مملکت کا

فرمانروا، اسے بنفسِ نفیس اپنے دربار میں حاضر کرے اور باریابی کا شرف بخشے، وہ تو ساری عمر یہ دیکھتا آیا تھا کہ وہ تو ایک چرواہا ہے، جس کے ساتھ کوئی بھی معزز انسان، کوئی بھی دولت مند انسان، کوئی بھی صاحبِ منصب انسان بات کرنے کو بھی ذلت اور حقارت سمجھتا ہے۔

اس لیے اسود راعی نے کہا کہ میں تمہارے سردار کے پاس کیسے جاسکتا ہوں، جب کہ وہ تمہاری مملکت کے فرمانروا ہیں، تمہاری فوج کے سپہ سالار ہیں اور میں ایک ادنیٰ چرواہا ہوں۔ ان صحابی نے جواب میں کہا کہ ہمارے سردار نبی کریم سرکارِ دو عالم محمد مصطفیٰ ﷺ غریبوں کے انتہائی ہمدرد اور غم گسار ہیں اور ان کی بزم اور محفل میں غریب و امیر کے درمیان اور حاکم محکوم کے درمیان، راعی اور رعیت کے درمیان کوئی فرق، امتیاز نہیں ہوتا۔ وہ حیرانی کے عالم میں نبی کریم ﷺ کی طرف بڑھا اور آپ کی خدمت میں حاضر ہوا اور ڈرتے ڈرتے یہ سوال کیا کہ میں آپ سے یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ آپ کی بنیادی دعوت کیا ہے؟ اور آپ کیوں اس جگہ پر تشریف لائے؟

نبی کریم ﷺ نے اس کو جواب میں مختصراً عقیدۂ توحید سمجھایا اور یہ بتایا کہ ہم بار بار اس عقیدے کی وضاحت کر چکے ہیں۔ اسود راعی نے جب اس عقیدۂ توحید کی تشریح سنی تو نبی کریم ﷺ سے پوچھا کہ اگر کوئی شخص اس عقیدے کا قائل ہو جائے اور آپ کے ساتھ شامل ہو جائے تو اس کا کیا انجام ہوگا؟ آپ نے فرمایا کہ اگر تم اس عقیدے کو قبول کر لو اور اسلام کے دائرے میں داخل ہو جاؤ تو تم ہمارے بھائی ہو گے، ہم تمہیں اپنے سینے سے لگائیں گے اور تمہیں وہی حقوق حاصل ہوں گے جو تمام مسلمانوں کو حاصل ہیں۔

اسود راعی نے بڑی حیرانی کے عالم میں کہا کہ مجھے کیسے وہ حقوق حاصل ہو سکتے ہیں، جبکہ میں ایک معمولی درجے کا چرواہا ہوں، میرا رنگ سیاہ ہے، میں سیاہ فام ہوں، میرے جسم سے بدبو اٹھ رہی ہے، میرے جسم پر میل کچیل جمع ہے، ایسی حالت میں آپ لوگ مجھے کیسے سینے سے لگائیں گے؟ اور مجھے اپنے برابر کا درجہ اور مقام کیسے دیں گے؟ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے یقین دلایا تو اس نے کہا کہ اگر یہ واقعہ ہے کہ آپ مجھے اپنے برابر حقوق دینے کے لیے تیار ہیں اور آپ کے اس عقیدۂ توحید کے پیغام میں بھی اتنی کشش ہے کہ میں اپنے دل میں اس کی طرف ایک غیر معمولی انسیت محسوس کر رہا ہوں، میں اتنی بات اور پوچھنا چاہتا ہوں کہ میری اس سیاہ فامی اور میرے جسم کے میل کچیل اور بدبو کا علاج کیا ہوگا؟

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب میں فرمایا کہ میں اس بات کی گواہی دیتا ہوں کہ اگر تم اس عقیدۂ توحید کو قبول کر لو تو چاہے دنیا میں تمہارے اس چہرے کی سیاہی کا کوئی علاج نہ ہو سکے، لیکن جب آخرت میں تم اٹھائے جاؤ گے تو تمہارا چہرہ چمک رہا ہوگا اور اللہ تعالیٰ تمہارے اس چہرے کی سیاہی کو نور سے بدل دے گا اور تمہارے جسم کی بدبو کو خوشبو سے بدل دے گا۔ اس نے کہا کہ اگر یہ بات ہے تو پھر «أشهد أن لا إله إلا الله وأشهد أن محمدا رسول الله» کہہ کر وہ مسلمان ہو گیا۔ پھر پوچھا کہ اب مجھے بتائیے کہ میرے ذمے کیا فریضہ عائد ہوتا ہے؟ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ یوں تو اسلام کے بہت سے فرائض ہیں، لیکن اس وقت نہ تو نماز کا وقت ہے کہ تمہیں نماز کا حکم دیا جائے، نہ روزے کا مہینہ ہے کہ روزہ رکھوایا جائے، نہ زکوٰۃ تم پر واجب ہے کہ تم سے زکوٰۃ دلوائی جائے، نہ حج کا موسم ہے کہ تم سے حج کرایا جائے، اس وقت تو ایک ہی عبادت اللہ کے لیے انجام دی جا رہی ہے، وہ یہ کہ خیبر کے میدان میں حق

و باطل کا معرکہ برپا ہے اور اللہ تعالیٰ کے راستے میں دینِ اسلام کے جاں نثار اپنی جانیں قربان کر رہے ہیں، اس وقت تو تمہارا فریضہ یہ ہے کہ اس جہاد میں شامل ہو جاؤ۔ اسود راعی نے کہا کہ اگر میں اس جہاد میں شہید ہو گیا، تو میرا انجام کیا ہوگا؟ نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ میں اس بات کی ضمانت دیتا ہوں کہ اگر تم جہاد میں شہید ہو گئے تو اللہ تبارک و تعالیٰ تمہیں سیدھا جنت الفردوس میں پہنچائے گا، تمہارے چہرے کی سیاہی نور میں تبدیل ہو جائے گی، تمہارے جسم سے بدبو کی بجائے خوشبوئیں مہکیں گی، میں اس کی ضمانت دیتا ہوں۔

یہ سن کر اسود راعی نے بکریوں کو شہر کی طرف ہنکایا اور لشکرِ اسلام میں شامل ہو گیا، لڑائی کافی دیر تک جاری رہی، جب جنگ کا اختتام ہو گیا اور خیبر فتح ہو گیا اور نبی کریم ﷺ شہداء کی لاشوں کا معائنہ کرنے کے لیے نکلے، تو انہی لاشوں میں سے ایک لاش اسود راعی کی لاش بھی تھی، جب وہ آپ ﷺ کی خدمت میں لائی گئی تو آپ ﷺ کی مبارک آنکھوں میں آنسو آ گئے، آپ ﷺ نے فرمایا کہ یہ عجیب و غریب شخص ہے یہ ایک ایسا شخص ہے جس نے اللہ تعالیٰ کے راستے میں کوئی سجدہ بھی نہیں کیا، یہ وہ شخص ہے جس نے اللہ تعالیٰ کے راستے میں کوئی ایک پیسہ خرچ نہیں کیا، یہ وہ شخص ہے جس نے اللہ کے راستے میں کوئی اور عبادت انجام نہیں دی، لیکن میں اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا ہوں کہ یہ شخص سیدھا جنت الفردوس میں پہنچ گیا ہے اور میں اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا ہوں کہ اللہ تعالیٰ نے اس کے چہرے کی سیاہی کو نور سے بدل دیا ہے، اس کے جسم کی بدبو اور میل کچیل کو خوشبو سے مہکا دیا گیا ہے۔ (۱)

(۱) دلائل النبوۃ للبیہقی ج ۱ص ۲۲۰ باب ماجاء فی قصۃ العبد الاسود الذی اسلم یوم خیبر علی باب خیبر و قتل (طبع دار الکتب العلمیہ)۔

یہ جو میں نے عرض کیا تھا کہ یہ کلمہ: "لا الہ الا اللہ" ایک لمحے میں انسان کو جہنم کے ساتویں طبقے سے نکال کر جنت الفردوس کے اعلیٰ ترین درجے میں پہنچا دیتا ہے، یہ کوئی مبالغہ نہیں ہے، بلکہ اس واقعے سے اس کا ایک عملی ثبوت فراہم ہوتا ہے کہ صرف ایک "لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ" نے اس شخص کے انجام میں اتنا حیرت انگیز انقلاب برپا کر دیا۔

اب سوچنے کی بات یہ ہے کہ یہ زبردست انقلاب جو انسان کی زندگی میں بھی اور اس کے انجام میں بھی اس حکم کی بدولت پیدا ہوتا ہے، اس کی وجہ کیا ہے؟ کیا یہ کلمہ کوئی منتر ہے یا کوئی طلسم ہے کہ اس کے پڑھ لینے کے بعد انسان جہنم سے اور اللہ کے عذاب سے، اللہ کے غضب سے محفوظ ہو جاتا ہے؟

واقعہ یہ ہے کہ یہ کوئی منتر نہیں، کوئی طلسم نہیں، حقیقت یہ ہے کہ کلمہ "لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ" ایک معاہدہ، اقرار ہے جو انسان اپنے پروردگار سے کرتا ہے۔ جب کوئی شخص یہ کہتا ہے کہ "لا الہ الا اللہ" تو اس کے معنی یہ ہیں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں، میں اللہ کے سوا ہر معبود سے بری ہوتا ہوں اور ہر معبود کی معبودیت سے انکار کرتا ہوں اور محمد رسول اللہ کو اللہ کا سچا پیغمبر مانتا ہوں۔ اس معاہدے کا مطلب یہ ہے کہ میں پوری زندگی جو گزاروں گا وہ تمام تر اللہ تعالیٰ کی رضا کے مطابق اور اس کی خوشنودی کے مطابق گزارنے کی کوشش کروں گا، اسی معاہدہ کی بدولت اس کی زندگی میں یہ انقلاب برپا ہوتا ہے کہ پہلے وہ اللہ کا مبغوض تھا تو اب محبوب بن گیا، پہلے کافر تھا تو اب مسلمان بن گیا، پہلے جہنمی تھا تو اب جنتی بن گیا، یہ سارا انقلاب اس معاہدے کی بدولت پیدا ہوتا ہے، اسی معاہدے کا نام شریعت میں "توحید" ہے۔

آپ جانتے ہیں کہ حضرت آدم علیہ السلام کے وقت سے لے کر سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے تک جتنے بھی انبیاء علیہم السلام تشریف لائے، ان سب نے ایک ہی بنیادی دعوت دی، وہ توحید کی دعوت تھی، جتنی قوموں پر عذاب نازل ہوئے وہ اسی توحید سے روگردانی کی بنیاد پر نازل ہوئے، انبیاء علیہم السلام نے جو مشقتیں اور صعوبتیں اٹھائیں، وہ اسی توحید کی نشر و اشاعت کے لیے اٹھائیں، یہ ایک ایسا بنیادی عقیدہ ہے جو اسلام کے اور اللہ تعالیٰ کے دین کا بنیادی پتھر کہلانے کا مستحق ہے،اور اسلام کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کو معبود قرار دے کر اس کے سوا ہر معبود سے نفی کی جائے، ہر معبود سے براءت کا اظہار کیا جائے اور اللہ کے سوا کسی کے حکم کی تعمیل نہ کی جائے۔

علماء نے لکھا ہے کہ توحید کی دو قسمیں ہوتی ہیں،ایک توحیدِ اعتقادی، دوسری توحیدِ عملی۔ توحیدِ اعتقادی کا مطلب یہ ہے کہ انسان اس بات پر یقین رکھے کہ اللہ تعالیٰ کے سوا اس کائنات کا نہ کوئی خالق ہے نہ کوئی معبود ہے اور نہ کوئی عبادت کے لائق ہے اور اللہ تعالیٰ کی ذات اور صفات میں کسی کو شریک نہ ٹھہرائے، اللہ کی ذات میں کسی کو شریک نہ ٹھہرانے کا مطلب یہ ہے کہ اس کی جتنی ایسی صفات ہیں جو اسی کے ساتھ مخصوص ہیں ان میں کسی اور کو اس کا شریک نہ بنائے۔

مثلاً اللہ تعالیٰ رزق دیتا ہے، وہ رزّاق ہے، اس رزّاقیت کی صفت میں کسی اور کو شامل نہ کرے، اللہ تبارک و تعالیٰ کے قبضے اور قدرت میں ہر انسان کا نفع اور نقصان ہے۔ اس نفع اور نقصان کو اللہ تعالیٰ ہی کے قبضۂ قدرت میں سمجھے، اس کے سوا کسی اور کو نفع اور نقصان کا ذمہ دار قرار نہ دے، اللہ تعالیٰ کے قبضۂ قدرت میں شفا اور مرض ہے، تو شفا اور مرض کو اللہ تعالیٰ کے سوا کسی اور کی طرف

منسوب نہ کرے، لہٰذا جتنی بھی اللہ تعالیٰ کی صفات ہیں ان میں سے کسی میں بھی دوسرے کو شریک نہ ٹھہرائے۔

اس بات کی وضاحت اس لیے ضروری ہے کہ جہاں تک اللہ تعالیٰ کی ذات میں شریک ٹھہرانے کا تعلق ہے، دنیا کے بیشتر مذاہب اس کے قائل رہے ہیں، وہ کافر اور مشرک لوگ جن کی طرف نبی کریم ﷺ کو مبعوث کیا گیا اور آپ نے ان کو توحید کی دعوت دی، وہ بھی اس بات کو مانتے تھے کہ پیدا کرنے والا اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی نہیں۔ وہ بھی اس بات کو مانتے تھے کہ اللہ تعالیٰ نے ساری کائنات کو پیدا کیا ہے اور ہمیں بھی اسی نے پیدا کیا ہے، لیکن ان کا شرک یہ تھا کہ وہ اللہ کی صفات میں کچھ دیوتاؤں کو شریک مانتے تھے، وہ کہتے تھے کہ رزق کا شعبہ اللہ تعالیٰ نے فلاں دیوتا کے سپرد کر رکھا ہے، بارش کا شعبہ اللہ تعالیٰ نے فلاں دیوتا کے حوالے کر دیا ہے، شفا کا شعبہ اللہ تعالیٰ نے فلاں دیوتا کو سونپ دیا ہے، اس طرح وہ صفاتِ باری تعالیٰ کے اندر دوسرے دیوتاؤں کو شریک ٹھہرانے کے مجرم تھے۔ اس وجہ سے ان کو مشرک قرار دیا گیا، ورنہ خود قرآنِ کریم کہتا ہے کہ

> اگر آپ ان سے پوچھیے کہ کس نے آسمان اور زمین کو پیدا کیا تو وہ جواب میں کہیں گے کہ اللہ تعالیٰ نے پیدا کیا۔

اس کے بعد اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ

ءَاِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ (۱)

تم مانتے ہو کہ اللہ کے سوا کوئی خالق نہیں۔ کیا اس کے باوجود اس کی

---

(۱) سورة النمل الآية (٦٠).

صفات میں تم دوسروں کو شریک ٹھہراتے ہو؟ یہ تو کوئی عقلمندی اور دانش مندی کی بات نہیں۔

اس لیے ''توحیدِ اعتقادی'' اس وقت کامل ہوتی ہے جب اللہ تعالیٰ کی ذات میں بھی کسی کو شریک نہ ٹھہرایا جائے، اس کی صفات میں بھی کسی کو شریک نہ ٹھہرایا جائے، یعنی عبادت کرے انسان تو صرف اللہ کی کرے، معبود مانے تو اللہ کو مانے، پوجے تو اللہ کو پوجے، مانگے تو اللہ سے مانگے اور مشکل کشا، رزاق اور تمام بیماریوں کو دور کرنے والا اللہ تعالیٰ کے سوا کسی اور کو نہ سمجھے، یہ ہے توحیدِ کامل۔ جس کی دعوت حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے تک تمام انبیاء نے دی ہے۔

توحید کی دوسری قسم ''توحیدِ عملی'' ہے۔ توحیدِ عملی کا مطلب یہ ہے کہ یہ اعتقاد کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں ہے یہ انسان کی عملی زندگی میں اس طرح رچ بس جائے کہ ہر آن اس کو یہ حقیقت مستحضر رہے کہ اللہ کے سوا کوئی شخص مجھ کو نہ نقصان پہنچا سکتا ہے اور نہ نفع پہنچا سکتا ہے اور نہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی واجب الاطاعت ہے، مجھے اللہ کے حکم کی اطاعت کرنی ہے، اللہ کے حکم کی اطاعت میں کسی بڑی سے بڑی قربانی پیش کرنے سے بھی دریغ نہیں کروں گا، یہ اعتقاد جب انسان کی زندگی میں رچ بس جاتا ہے تو اس کو صوفیاء کی اصطلاح میں یہ کہا جاتا ہے کہ اس کو توحیدِ عملی کا مقام حاصل ہو گیا۔

اس ''توحیدِ عملی'' کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ انسان اپنی زندگی کے ہر شعبے میں ہر موقع پر اللہ تبارک و تعالیٰ کے احکام کو پیشِ نظر رکھتا ہے، وہ یہ دیکھتا ہے کہ

میرے اس قدم سے اللہ راضی ہوگا یا ناراض ہوگا، کہیں ایسا تو نہیں کہ میرے اس عمل سے اللہ کی نافرمانی ہو جائے، اگر نافرمانی کا اندیشہ ہو تو وہ اس قدم سے باز رہتا ہے اور اللہ کے سوا کسی سے خوف نہیں کھاتا، کسی سے امید نہیں رکھتا، اللہ تعالیٰ کے حکم کے خلاف اگر کوئی شخص اس کے قدموں میں ساری دنیا جہاں کی دولت لا کر ڈھیر کر دے تو بھی وہ دولت اس کے پائے استقامت کو لغزش میں نہیں لا سکتی، وہ اللہ تعالیٰ کے احکام سے روگردانی نہیں کر سکتا، کوئی شخص زور اور زبردستی کی انتہا کر دے اور اس کو اپنے سامنے موت ناچتی نظر آ رہی ہو، لیکن اس کے باوجود وہ جانتا ہے کہ موت اور زندگی، شفاء اور مرض اللہ کے قبضۂ قدرت میں ہے، اگر اس نے میرے لیے یہی وقت مقرر کیا ہے تو اس کو کوئی نہیں ٹال سکتا اور اگر میری زندگی باقی ہے تو کوئی شخص مجھے موت کے حوالے نہیں کر سکتا، اس لیے وہ کبھی بھی کسی ڈر اور خوف کی بنا پر اللہ تبارک وتعالیٰ کے حکم سے روگردانی پر آمادہ نہیں ہوتا۔

اسی کو شیخ سعدیؒ فرماتے ہیں:

موحد چہ برپائے ریزی زرش\
چہ شمشیر ہندی نہی بر سرش\
امید و ہراسش نباشد زکس\
بریں است بنیادِ توحید و بس

(گلستان ص ۳۴۲)

موحد کا مقام یہ ہوتا ہے کہ اگر تم اس کے پاؤں پر دنیا جہاں کا سونا ڈھیر کر دو یا اس کے سر پر ہندی تلوار لٹکا دو،

اسکو خدا کے سوا نہ کسی اور سے امید قائم ہوتی ہے، نہ خدا
کے سوا کسی کا خوف ہوتا ہے اور یہی توحید کی بنیاد ہے۔

سرکارِ دو عالم ﷺ کا واقعہ آپ نے سنا ہوگا کہ ایک غزوے کے موقع پر آپ ایک جگہ دوپہر کے وقت ایک درخت کے سائے میں آرام فرما رہے تھے کہ اتنے میں دشمن کا ایک شخص ادھر آ نکلا، آپ کی تلوار درخت سے لٹکی ہوئی تھی، اس نے اس تلوار پر قبضہ کیا اور نبی کریم ﷺ کو جگایا اور آپ سے کہا کہ اب تمہیں میری تلوار سے کون بچا سکتا ہے؟ نبی کریم ﷺ نیند سے بیدار ہوئے، اچانک یہ منظر سامنے آیا کہ تلوار اس شخص کے ہاتھ میں ہے، ایسے موقع پر جبکہ موت نگاہ کے سامنے ناچتی نظر آ رہی ہو، ظاہر ہے کہ وہ شخص دشمن ہے، آپ کے خون کا پیاسا ہے، اس کے ہاتھ میں تلوار بھی ہے، بازو میں طاقت بھی ہے اور وہ نبی کریم ﷺ پر بری نیت سے حملہ کرنے آیا ہے، لیکن اس کے باوجود نبی کریم ﷺ نے بڑے اطمینان سے یہ جواب دیا کہ ''مجھے بچانے والا اللہ ہے'' مطلب یہ تھا کہ اگر اللہ کو اس وقت مجھے مارنا منظور ہے تو دنیا کی کوئی طاقت مجھے نہیں بچا سکتی اور اگر اللہ تعالیٰ نے میری زندگی اور لکھی ہے تو تمہاری یہ تلوار اور تمہاری یہ عداوت میرا بال بیکا نہیں کر سکتی، یہ جواب آپ نے اس اعتماد اور بھروسے کے ساتھ دیا کہ اس اعتماد اور بھروسے سے دشمن پر لرزہ طاری ہو گیا اور اس حالت میں تلوار اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر گر پڑی، اب تلوار نبی ﷺ کے ہاتھ میں تھی، آپ نے تلوار اٹھا کر فرمایا کہ تمہیں اس تلوار سے اور میرے حملے سے کون بچا سکتا ہے؟ اس شخص کے پاس کوئی جواب نہیں تھا، اس نے نبی کریم ﷺ کے اس اعتماد اور توکل کو

دیکھ کر اسلام قبول کر لیا اور مسلمان ہو گیا۔ (۱)

عرض کرنے کا منشا یہ تھا کہ توحیدِ عملی اس وقت کہلاتی ہے جب انسان اپنی زندگی کے ہر شعبے میں اس بات کو پیشِ نظر رکھ کر کہ میں نے "لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ" پڑھنے کے بعد اپنے پروردگار سے ایک معاہدہ کیا ہے اور اقرار اور معاہدے کا تقاضا یہ ہے کہ میں زندگی کے کسی بھی قدم پر اس کے کسی بھی حکم کی خلاف ورزی نہ کروں، جب یہ مقام انسان کو حاصل ہو جاتا ہے تو یہ توحیدِ عملی کہلاتی ہے اور یہی وہ مقام ہے جو درحقیقت انسان کی زندگی میں انقلاب برپا کرتا ہے اور یہی وہ چیز ہے جو انسان کو جہنمی سے جنتی بناتی ہے اور اللہ کے مبغوض سے محبوب بنا دیتی ہے۔

اس توحیدِ عملی کو حاصل کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ انسان سب سے پہلے یہ معلوم کرنے کی کوشش کرے کہ اس معاہدے کے بعد میرے اوپر کیا ذمے داریاں عائد ہوتی ہیں، اللہ تبارک وتعالیٰ نے کیا احکام مجھے دیے ہیں اور کن باتوں سے مجھے روکا ہے، سب سے پہلا مرحلہ انہی باتوں کو معلوم کرنے کا ہے، اس واسطے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

«طَلَبُ الْعِلْمِ فَرِيْضَةٌ عَلٰى كُلِّ مُسْلِمٍ»(۲)

---

(۱) صحیح البخاری ۳۹/٤ (۲۹۱۰) طبع دار طوق النجاة، وراجع للتفصيل وشرح الحديث فتح الباري لابن حجر ج۷ ص٤۲۸۔

(۲) سنن ابن ماجه ج۱ ص۲۱٤ (۲۲٤) طبع دار الجيل. ومسند البزار ج ۱۳ ص ۲٤۰ (٦۷٤٦) طبع مكتبة العلوم والحكم. والحديث ذكره السخاوی فی "المقاصد الحسنة" ص ٤٤۰ رقم ٦۰- طبع دار الكتاب العربی- وقال: ابن ماجه فی سننه، وابن عبد البر فی العلم له، من حديث حفص بن سليمان، عن كثير بن شنظير، عن محمد =

ہر مسلمان پر ایمان لانے کے بعد سب سے پہلا فریضہ یہ عائد ہوتا ہے کہ وہ علم کی طلب کرے، یعنی یہ معلوم کرے کہ اللہ کی مرضی کیا ہے؟ اور اس کی نافرمانی کیا ہے؟ جب یہ باتیں انسان کو معلوم ہو جاتی ہیں تو پھر اس بات پر اس کو قدرت حاصل ہو جاتی ہے کہ وہ اپنی زندگی کے اندر اللہ تعالیٰ کے احکام کی پیروی کرے اور اس کی نافرمانی سے بچنے کی کوشش کرے، اللہ تعالیٰ ہم سب کو توحید کے صحیح تقاضوں کو سمجھنے کی توفیق عطا فرمائے اور ان پر پوری طرح عمل پیرا ہونے کی توفیق عطا فرمائے اور اس کے تمام ثمرات اور نتائج سے بہرہ ور فرمائے۔ آمین۔

وَآخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ

= ابن سيرين، عن انس، مرفوعاً به ... وحفص ضعيف جدا، بل اتهمه بعضهم بالكذب والوضع، وقيل عن احمد: انه صالح، ولكن له شاهد عند ابن شاہين فی "الافراد"، ورويناه فی "ثانی السمعونيات" من حديث موسى بن داود، حدثنا حماد بن سلمة، عن قتادة، عن انس، به، وقال ابن شاہين: انه غريب، قلت: رجاله ثقات، بل يروى عن نحو عشرين تابعيا عن انس... الخ۔

اخلاص پیدا کیجیے

خطبات دورۂ ہندص ۹۷
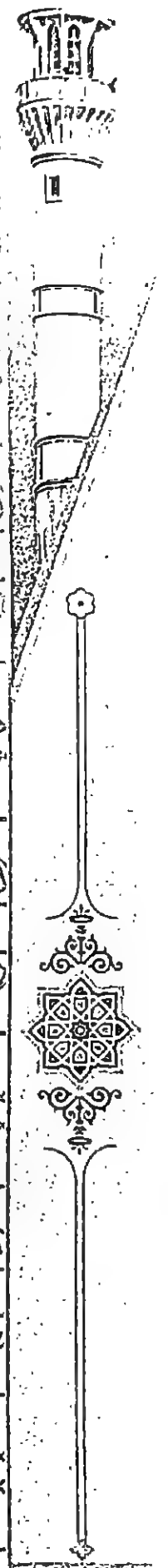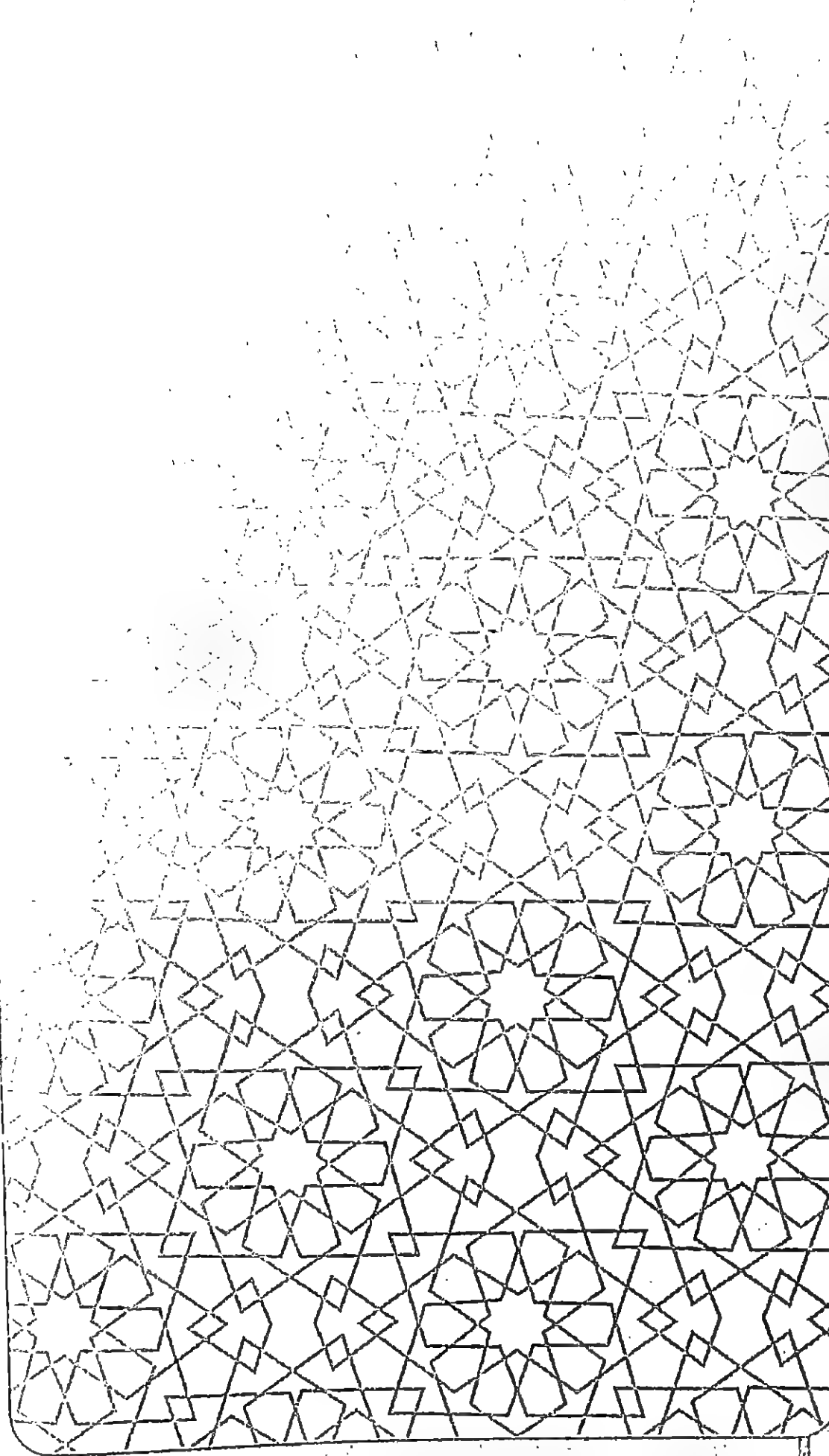
بسم اللہ الرحمن الرحیم

اخلاص پیدا کیجیے

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ، وَالصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی سَیِّدِ الْمُرْسَلِیْنَ وَعَلٰی اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ اَجْمَعِیْنَ وَعَلٰی کُلِّ مَنْ تَبِعَھُمْ بِاِحْسَانٍ اِلٰی یَوْمِ الدِّیْنِ اَمَّا بَعْدُ!

ایک قیمتی تحفہ

حضرات علماء کرام اور میرے عزیز طالبِ علم ساتھیو!

اس وقت بخاری شریف کی آخری حدیث پڑھنی مقصود ہے، لیکن اس سے پہلے مجھے یہ خیال آیا کہ جو حضرات اجازتِ حدیث چاہتے ہیں، ان کی خدمت میں ایک تحفہ بھی پیش کردوں اور وہ تحفہ ایک حدیث ہے جس کو حدیث ''مسلسل بالاوّلیہ'' کہا جاتا ہے اور ہم سے لے کر حضرت سفیان ابن عیینہ رحمۃ اللہ علیہ تک یہ معمول رہا ہے کہ جب بھی کوئی شاگرد کسی استاذ کے پاس حدیث پڑھنے کے لیے جاتا تھا تو استاذ اپنے شاگرد کو سب سے پہلے وہ حدیث سنایا کرتے تھے جس کو ''مسلسل بالاوّلیہ'' کہا جاتا ہے اور اس تسلسل میں شامل ہونا برکت کی چیز ہے، تو

خیال آیا کہ بخاری شریف کی آخری حدیث پڑھنے سے پہلے میں وہ حدیث آپ کو سنا دوں۔

بِسْمِ اللهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْم

حَدَّثَنِی بِهٰذَا الْحَدِیْثِ الشَّیْخُ حَسَنُ الْمَشَّاطُ الْمَکِّی اَلْمَالِکِیُ رَحِمَهُ اللهُ تَعَالٰی، فِی الْمَسْجِدِ الْحَرَام، سَنَةَ اَلْفٍ وَتِسْعِ مِئَةٍ وَثَلَاثٍ وَسِتِّیْنَ، كَمَا حَدَّثَنِی بِهِ الشَّیْخُ مُحَمَّدُ یَاسِین اَلْفَادَانِیُ رَحِمَهُ اللهُ تَعَالٰی فِی مَکَّةَ الْمُکَرَّمَةِ، وَالشَّیْخُ النَّاجِیُّ رَحِمَهُ اللّٰه تَعَالٰی بِجِدَّةَ، كُلُّ وَاحِدٍ مِنْهُمْ یَرْوِیْهِ بِاِسْنَادِهٖ اِلٰی سَیِّدِنَا عَبْدِ اللهِ بْنِ عَمْرِبْنِ الْعَاصِ رضی اللہ عنہما قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ الله ﷺ: «اَلرَّاحِمُوْنَ یَرْحَمُهُمُ الرَّحْمٰنُ تَبَارَكَ وَتَعَالٰی، اِرْحَمُوْامَنْ فِی الْاَرْضِ یَرْحَمْكُمْ مَنْ فِی السَّمَاءِ».

(پھر ایک مرتبہ حضرت والا نے مذکورہ حدیث طلباء کو پڑھائی۔

اجازتِ حدیث

دورۂ حدیث کے تمام طلبہ، اساتذہ اور دوسرے مدارس سے آنے والے علماءِ کرام کو اس حدیث ''مسلسل بالاولیہ'' کی روایت کی اجازت دیتا ہوں۔ یہ صحیح

بخاری کا آخری باب ہے، اس کے تحت امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی مقدس کتاب کی آخری حدیث روایت فرمائی ہے، اس باب کا عنوان قرآن کریم کی اس آیت کو قرار دیا ہے، جس میں باری تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

وَنَضَعُ الْمَوَازِيْنَ الْقِسْطَ لِيَوْمِ الْقِيَامَةِ فَلَا تُظْلَمُ نَفْسٌ شَيْئًا(۱)

ہم ترازو قائم کریں گے قیامت کے دن انصاف قائم کرنے کی خاطر کسی بھی جان پر ظلم نہیں ہوگا۔

اس باب پر امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی کتاب کو ختم فرمایا۔

تراجم بخاری ان کے تفقّہ کے آئینہ دار ہیں

آپ حضرات نے صحیح بخاری کے درس کے دوران یہ بات دیکھی ہوگی کہ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے مختلف احادیث پر جو تراجم قائم فرمائے ہیں وہ ان کے تفقّہ کے آئینہ دار ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو کچھ عجیب وغریب حکمتوں سے نوازا تھا، جس کے تحت وہ یہ تراجم قائم فرماتے تھے اور عموماً ان تراجم کے پس منظر میں کوئی نہ کوئی عجیب وغریب حکمت یا کوئی نکتہ ہوتا ہے، تو یہ باب جو حضرت امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے قائم فرمایا ہے یہ کتاب التوحید کا حصہ ہے اور اس میں امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے مختلف باطل نظریات کی تردید فرمائی ہے، جیسے جہمیہ، معتزلہ، قدریہ، جبریہ، خوارج وغیرہ، معتزلہ جو وزنِ اعمال کے منکر تھے، امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے ان کی تردید کے لیے قرآنِ کریم کی یہ آیت لاکر یہ باب قائم فرمایا۔

---

(۱) سورۃ الانبیاء آیت (۴۷)۔

اس کے ساتھ ساتھ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ اس بات کی طرف توجہ دلانا چاہتے ہیں کہ یہ سارے اعمال جو آپ نے اس کتاب میں پڑھے ہیں جیسے ایمان، طہارت، فرائض، وصایا، غرض یہ کہ تمام احکامِ شریعت، چاہے وہ عقائد کے قبیل سے ہوں یا عبادات، معاملات، اخلاقیات، معاشرت کے قبیل سے ہوں، تمام اعمال کا اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں وزن کیا جائے گا، جب تک ان میں وزن نہیں ہوگا اس وقت تک نتیجہ یعنی ثوابِ آخرت ظاہر نہیں ہوگا، لہٰذا کتاب کے آخر میں یہ باب قائم فرما کر حضرت نے اس بات کی طرف توجہ دلائی کہ سارے اعمال کے بارے میں تو تم نے پڑھ لیا اب ان اعمال میں وزن پیدا کرنے کی کوشش کرو۔

اعمال کی کمیت نہیں کیفیت کا اعتبار ہوگا

اللہ کے یہاں اعمال کی کمیت نہیں، بلکہ کیفیت دیکھی جائے گی کہ اعمال کیسے ہیں، فرمایا:

الَّذِیْ خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَیٰوةَ لِیَبْلُوَکُمْ اَیُّکُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا[1]

اس میں یہی فرمایا گیا: ''لِیَبْلُوَکُمْ اَیُّکُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا'' کہ کس کا عمل زیادہ اچھا اور بہتر تھا لہٰذا تمام انسانی زندگی کی دوڑ دھوپ، جد وجہد کی انتہا وزنِ اعمال پر ہوتی ہے۔ انسان کے اعمال، عبادتیں، معاملات، معاشرت، افعال، اقوال ان سب کی انتہا بالآخر وزنِ اعمال پر ہوتی ہے، اسی لیے ہر مسلمان کو چاہیے کہ اس بات کی فکر کرے کہ اپنے اعمال میں وزن کیسے پیدا ہو؟ اس کے لیے امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کی پہلی حدیث پر چلے جائیے جہاں سے انہوں نے کتاب کا آغاز کیا ہے اور وہ ہے:

---

(۱) سورۃ الملك الاية (۲)۔

"اِنَّمَا الْاَعْمَالُ بِالنِّیَّاتِ وَاِنَّمَا لِامْرِءٍ مَانَوٰی"(۱)

یعنی تمام اعمال کا دارومدار نیتوں پر ہے اور بات یہ ہے کہ نیت میں اخلاص جتنا زیادہ ہوگا اتنا ہی عمل میں وزن زیادہ پیدا ہوگا۔ اعمال میں وزن اخلاص سے پیدا ہوتا ہے، اس کی جسامت سے نہیں اور اللہ تبارک وتعالیٰ ثواب کا فیصلہ بھی اسی پر فرماتے ہیں، اسی لیے بعض اعمال ایسے ہوتے ہیں کہ دیکھنے میں بالکل معمولی اور ان کی کوئی خاص قدر و قیمت نظر نہیں آتی، لیکن وہ اخلاص کے ساتھ کیے جاتے ہیں، اس لیے اللہ کے یہاں ان کی بڑی قدر و قیمت ہوتی ہے اور میزانِ عمل میں ان کا وزن بہت زیادہ ہوتا ہے اور بعضے اعمال ایسے ہیں جو دیکھنے میں بہت بڑے معلوم ہوتے ہیں اور گنتی میں بھی زیادہ نظر آتے ہیں، لیکن چونکہ ان میں اخلاص مفقود ہوتا ہے، اس لیے اللہ تبارک وتعالیٰ کے یہاں پرِ زاغ(۲) کے برابر بھی ان کی قدر و قیمت نہیں ہوتی۔

کتے کو پانی پلانے کا واقعہ

آپ نے بخاری شریف ہی میں ایک حدیث پڑھی ہوگی کہ حضورِ اقدس سرورِ دوعالم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ ایک آدمی کسی وقت ایک کنویں کے پاس سے گزرا، اُسے پیاس لگی، اس نے پانی پیا اور وہاں دیکھا کہ ایک کتا پیاس کی شدت سے کیچڑ والی مٹی کھا رہا ہے اور اسی سے اپنی پیاس بجھانے کی کوشش کر رہا ہے، تو اس اللہ کے بندے کو خیال آیا کہ جس طرح میں پیاسا تھا اور بے چین تھا، اسی طرح یہ اللہ کی مخلوق بھی پیاس سے بے چین ہے، تو اس نے اس کتے کو پانی

(۱) صحیح البخاری ۶/۱ (۱)۔
(۲) کوے کے پر کے برابر۔

پلانے کا ارادہ کیا، اب چونکہ اس کے پاس کوئی ڈول وغیرہ نہیں تھا تو اس نے اپنے چمڑے کا موزہ نکالا اور اس میں پانی بھر کر کتے کو پلا دیا۔ ایک روایت میں ہے کہ یہ قصہ کسی عورت کا ہے، خیر واقعہ کسی کا بھی ہو، روایتوں کا اختلاف ہوسکتا ہے، لیکن حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہ واقعہ بیان فرما کر ارشاد فرمایا:

"فَشَكَرَ اللّٰهُ لَهُ فَغَفَرَ لَهُ"(۱)

اللہ نے اس آدمی کے عمل کی اتنی قدردانی فرمائی کہ اس بنا پر اس کی مغفرت فرمادی۔

یہ عمل خالص اللہ کے لیے تھا

لہٰذا اب آپ دیکھیے کہ کتے کو پانی پلا دینا دیکھنے میں کوئی اتنا بڑا عمل نظر نہیں آتا، لیکن چونکہ اس وقت اس آدمی کے دل میں اتنا بڑا اخلاص پیدا ہوا اور یہ خیال آیا کہ میں اللہ کو راضی کرنے کے لیے یہ کام کردوں، تو اللہ تبارک وتعالیٰ نے اپنے فضل وکرم سے اس کی مغفرت فرمادی۔ یہ تو مثال ہے اس بات کی کہ اخلاص سے اعمال میں وزن پیدا ہوتا ہے، معلوم ہوا کہ عمل میں جتنا زیادہ اخلاص ہوگا، اللہ تبارک وتعالیٰ کے پاس اس کی اتنی ہی قدر و قیمت زیادہ ہوگی۔

حضرت جنید بغدادی رحمۃ اللہ علیہ کا واقعہ

میں نے اپنے والدِ ماجد حضرت مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے کئی مرتبہ سنا کہ کسی نے حضرت جنید بغدادی رحمۃ اللہ علیہ کی ان کی وفات کے بعد خواب میں

(۱) صحيح البخاری ۱۱۱/۳ (۲۳۶۳) و صحيح مسلم ۱۷۶۱/٤ (۲۲٤٤)، طبع دار إحياء التراث العربي.

زیارت کی اور پوچھا کہ آپ کے ساتھ اللہ تبارک وتعالیٰ نے کیا معاملہ فرمایا؟ تو انہوں نے فرمایا:

"ذَهَبَتِ الْعِبَارَاتُ وَطَارَتِ الْاِشَارَاتُ وَلَمْ يَنْفَعْنَا اِلَّا رَكِيْعَاتٌ رَكَعْنَاهَا فِيْ جَوْفِ اللَّيْلِ"[1]

وہ ساری عبارتیں اور علمی تحقیقات پتہ نہیں کہ وہ سب کہاں چلی گئیں، وہ علمی عبارتیں، علمی اشارات معلوم نہیں کہاں گم ہوگئے۔ ہمیں تو فائدہ ملا بس چند رکعتوں سے جو رات کو ہم اللہ کے سامنے پیش کردیا کرتے تھے۔

مطلب یہ ہے کہ اگرچہ ساری علمی تحقیقات اور تقریرات ویسے تو بڑے ثواب کے کام ہیں، لیکن اس میں ہمیشہ شیطان اور نفس کا دھوکہ ساتھ لگا رہتا ہے کہ لوگوں کے سامنے بیان کریں گے تو ہماری شہرت ہوگی، ہمارے علم کا سکہ بیٹھے گا اور ان کے دل ہماری طرف مسخر ہوں گے۔ لہٰذا ان خیالات کے نتیجے میں اخلاص ختم ہوجاتا ہے۔ جب اخلاص ختم ہوجاتا ہے تو اعمال کا وزن بھی ختم ہوجاتا ہے، لیکن رات کی تنہائی میں جہاں کوئی دیکھنے والا نہ ہو، بندہ ہو اور اُس کا خدا ہو، تو وہاں اخلاص کے ساتھ کوئی عبادت انجام دی جائے تو اس میں وزن پیدا ہوگا۔

مکھی کی پیاس بجھانے پر مغفرت

میں نے اپنے شیخ رحمۃ اللہ علیہ سے ایک واقعہ سنا کہ ایک بڑے جلیل القدر عالم

---

(۱) حلیۃ الاولیاء ۲۵۷/۱۰ وصفۃ الصفوۃ لابن الجوزی ۵۲۲/۱ طبع دار الحدیث القاهرہ۔

بزرگ تھے اور تصنیف وتالیف میں مشغول رہتے تھے۔ وہ ایک مرتبہ لکھ رہے تھے، اس زمانے میں لکڑی کے قلم ہوتے تھے، ان کو روشنائی میں ڈبوکر لکھنا پڑتا تھا، انہوں نے قلم کو روشنائی میں ڈبویا اور لکھنے کے لیے اس کو اٹھایا تو اس پر مکھی آکر بیٹھ گئی اور روشنائی کو پینا شروع کردیا، تو وہ بزرگ تھوڑی دیر کے لیے رک گئے تاکہ مکھی اچھی طرح اپنی پیاس بجھالے، پھر اپنا کام شروع کردیا، جب ان کا انتقال ہوا تو ان کو کسی نے خواب میں دیکھا اور پوچھا کہ حضرت اللہ تعالیٰ نے کیا معاملہ فرمایا؟ تو جواب میں فرمایا کہ بھائی عجیب معاملہ ہوا، ہم نے تو سوچا تھا کہ ہم نے بڑی بڑی خدمتیں انجام دی ہیں جس کی بنا پر ہماری مغفرت ہوگی، لیکن اللہ جل جلالہ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا تمہارا ایک عمل ایسا ہے جس کی بنا پر ہم تمہاری مغفرت کرتے ہیں اور وہ عمل مکھی کی پیاس بجھانے کا ہے کہ تم نے جو قلم کو روکا تھا وہ صرف اور صرف ہماری رضا کے لیے تھا۔ لہٰذا اس عمل کے بدلے میں ہم نے تمہاری مغفرت کردی۔ یعنی جس عمل کے اندر اخلاص پیدا ہوجائے تو وہ اللہ تعالیٰ کے یہاں بہت وزنی اور قدر و قیمت والا ہوجاتا ہے۔

یہی پیغام حضرت امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ آخری باب میں دینا چاہتے ہیں کہ بھائی! اس بات کی فکر کرو کہ تمہارے اعمال میں وزن پیدا ہو۔

○ ایک عام بیماری

ایک بیماری جو ہم سب میں پائی جاتی ہے، الّا ماشاء اللہ، وہ یہ کہ اگر ہم کوئی نیا علم یا کوئی نئی بات حاصل کرتے ہیں، تو ذہن میں یہ خیال آتا ہے کہ بہت اچھی اور عمدہ بات معلوم ہوئی ہے۔ ہم اس کو فلاں وعظ اور تقریر میں کہیں گے۔ تو اس سے وعظ وتقریر کی شان میں اضافہ ہوگا۔ لوگ خوش ہوں گے اور تعریف

کریں گے۔ جب یہ خیال آجاتا ہے تو اس کے نتیجے میں عمل کا اخلاص ختم ہوجاتا ہے، لہٰذا حضرت امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ ہمیں یہ پیغام دینا چاہتے ہیں کہ اللہ کے بندو! جو کچھ بھی کرو، پڑھو، پڑھاؤ، وعظ کرو یا تصنیف وتالیف کرو، تمام کام خالص اللہ کو راضی کرنے کے لیے ہونے چاہئیں۔ کوئی تعریف کرے یا نہ کرے، ہمیں اس کی کوئی پرواہ نہیں ہونی چاہیے۔

اکابرِ دیوبند کا اخلاص

ہمارے اکابر علماءِ دیوبند جن کے ہم نام لیوا ہیں، اللہ تعالیٰ ہم سب کو اُن کے نقش قدم پر چلنے والا بنائے۔ آمین۔ ان کے جو واقعات ہم نے اپنے بزرگوں سے سنے ہیں، ان سب سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے ان کو اخلاصِ کامل عطا فرمایا تھا۔ حضرت شاہ اسماعیل شہید رحمۃ اللہ علیہ جامع مسجد دہلی کے اندر وعظ فرمارہے تھے، کافی دیر تک لمبا وعظ فرمایا اور شاہ صاحب کی خصوصیت یہ تھی کہ آپ کے وعظ میں ہزارہا افراد آپ کے دست مبارک پر بیعت وتوبہ کرتے تھے۔ جب آپ کا وعظ ختم ہوگیا تو آپ مسجد سے نکل کر سیڑھیوں سے اترنے لگے تو دیکھا کہ ایک دیہاتی آدمی ہانپتا کانپتا مسجد کی سیڑھیوں پر چڑھ رہا تھا اور جب لوگوں کو نیچے اترتے ہوئے دیکھا، تو آگے حضرت ہی تھے تو اس نے حضرت ہی سے پوچھا کہ کیا مولوی اسماعیل کا وعظ ختم ہوگیا؟ آپ نے فرمایا کہ ہاں۔ تو اس نے اِنَّا لِلّٰہِ پڑھا اور کہا میں کتنی دور اور مشقت سے ان کا وعظ سننے کے لیے آیا تھا، افسوس کہ اتنی محنت کے باوجود میں وعظ نہیں سن سکا، حضرت نے اس کو تسلی دی اور فرمایا میں ہی محمد اسماعیل ہوں، یہاں بیٹھو میں تمہیں وعظ کی ساری باتیں بتادوں گا، چنانچہ سارے کا سارا وعظ اس کے سامنے دہرادیا، کسی

نے آپ سے پوچھا کہ مولانا! آپ نے تو کمال کر دیا صرف ایک آدمی کے لیے اتنا لمبا وعظ دہرایا۔ تو حضرت نے جواب دیا کہ پہلے بھی میں نے ایک ہی کے لیے وعظ کہا تھا اور اب بھی وعظ ایک ہی کے لیے کہا ہے۔

سہاگن وہی جس کو پیا چاہے

میرے والدِ ماجد قدس اللہ سرہ (اللہ تعالیٰ ان کے درجات کو بلند فرمائے) فرماتے تھے کہ ہندی میں مثل مشہور ہے ''سہاگن وہی جس کو پیا چاہے'' اس کی تفصیل میں فرماتے تھے کہ اس جملے کا پسِ منظر یہ ہے کہ ایک لڑکی کی شادی ہو رہی تھی اور اس کی سہیلیاں اس کو دلہن بنا رہی تھیں۔ سب اس کی تعریف کر رہی تھیں، وہ بیچاری دلہن سب کی تعریفیں سنتی اور خاموش رہ جاتی۔ کسی سہیلی نے کہا اے اللہ کی بندی! سب لوگ تیری خوبصورتی اور سنگھار کی تعریف کر رہے ہیں اور تو کسی کا شکریہ ادا نہیں کرتی۔ اس نے کہا کہ میں شکریہ تو ادا کرتی ہوں، لیکن میں سوچ رہی ہوں کہ اگر میری سہیلیاں میری تعریف کرتی ہیں، تو ان کی تعریف سے مجھے کیا ملے گا۔ اصل بات تو یہ ہے کہ میں جہاں جا رہی ہوں، وہاں میری تعریف ہو اور وہاں میں پسند آجاؤں۔

اصل چیز تعریف نہیں قبولیت ہے

میرے والدِ ماجد رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ اگر مخلوق تعریفیں کر رہی ہے اور القاب سے نواز رہی ہے۔ کوئی علامہ کہہ رہا ہے۔ کوئی شیخ الاسلام کہہ رہا ہے تو اس مخلوق کی تعریف کا کوئی بھروسہ نہیں، جب قبر میں پہنچیں گے تو مخلوق کی تعریفیں کام نہیں آئیں گی۔ آئے گا تو یہ جملہ کام آئے گا:

يَاَيَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ ﴿٢٧﴾ ارْجِعِيْٓ اِلٰى رَبِّكِ رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً ﴿٢٨﴾ فَادْخُلِيْ فِيْ عِبٰدِيْ ﴿٢٩﴾ وَادْخُلِيْ جَنَّتِيْ ﴿٣٠﴾ (١)

اے وہ جان جو (اللہ کی اطاعت میں) چین پا چکی ہے، اپنے پروردگار کی طرف اس طرح لوٹ کر آجا کہ تو اُس سے راضی ہو اور وہ تجھ سے راضی اور شامل ہو جا میرے (نیک) بندوں میں اور داخل ہو جا میری جنت میں۔

میرے والدِ ماجد رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ ایک بزرگ بڑے درجے کے اولیاء اللہ میں سے تھے۔ ان کے ایک دشمن نے ایک مرتبہ یہ کہہ دیا کہ تجھ سے تو کتا بہتر ہے۔ حضرت تو ولایت کے بڑے درجے پر فائز تھے۔ ان پر اس کا کچھ اثر نہیں ہوا۔ لوگوں نے کہا کہ حضرت اس نے آپ کو اتنی بڑی گالی دی اور آپ نے اس کا کوئی جواب نہیں دیا۔ تو فرمایا بھائی! واقعی میرے خیال میں تو کتا مجھ سے بہتر ہے۔ اس لیے کہ مجھے پتہ نہیں ہے کہ کتا مجھ سے اچھا ہے یا میں کتے سے اچھا ہوں۔ ہاں! میں جس دن اللہ کی بارگاہ میں حاضر ہو جاؤں اور اللہ میرے اعمال کو قبول فرمالے تب تو میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ میں کتے سے اچھا ہوں، لیکن اگر میرے اعمال قبول نہ ہوئے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ واقعی کتا مجھ سے اچھا ہے، کیونکہ کتا کم از کم حساب و کتاب سے تو بری ہے اور اس کے اعمال کا وزن نہیں ہوگا۔

واقعی اللہ کے مخلص بندوں کو دنیا کی تعریف، نام و نمود اور شہرت سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ انہیں تو اس بات کی فکر ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے پاس ان کے

(١) سورۃ الفجر آیت (٢٧ تا ٣٠)۔

اعمال کا کیا وزن ہوگا اور کیا قدر و قیمت ہوگی؟ تو حضرت امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ اس باب میں یہی پیغام دینا چاہ رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اس پیغام کو اچھی طرح سے سمجھنے کی توفیق عطا فرمائے۔

دو محبوب کلمے

اگر خدا نہ کرے یہ پیغام ہم نے دل میں نہ بٹھایا اور اس کو اپنا مطمحِ نظر نہ بنایا تو ساری تحقیقات اور تدقیقات یہیں پر رہ جائیں گی اور اس کے بعد فرمایا:

"وإنّ أعمالَ بني آدمَ وقولَهم يُوزَن"

پھر اس کے بعد حدیث شریف روایت کی ہے کہ

"كَلِمَتَانِ حَبِيبَتَانِ اِلَى الرَّحْمٰنِ خَفِيفَتَانِ عَلَى اللِّسَانِ ثَقِيلَتَانِ فِي الْمِيزَانِ: «سُبْحَانَ اللهِ وَبِحَمْدِهِ سُبْحَانَ اللهِ الْعَظِيمِ»"(۱)

اس میں علمی مباحث ہیں۔ میں ان کی طرف جائے بغیر صرف اس میں جو پیغام حضرت نے دیا ہے اس کی طرف توجہ دلانا چاہتا ہوں۔ اسی حدیث پر امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی کتاب کو ختم فرمایا ہے۔ یہ دو کلمے رحمٰن کو بہت محبوب ہیں، میزان میں بڑے وزنی ہیں، لیکن اس میں کون سا لمبا وقت لگتا ہے۔ سُبْحَانَ اللهِ وَبِحَمْدِهِ سُبْحَانَ اللهِ الْعَظِيمِ کہنے میں کوئی محنت اور مشقت نہیں، بلکہ ایک لمحہ میں ادا ہو جاتا ہے دیکھنے میں معمولی عمل معلوم ہوتا ہے، لیکن جب اعمال کا وزن ہوگا تو اخلاص کے ساتھ کہے جانے والے اس کلمہ میں بڑا وزن ہوگا۔

(۱) صحيح البخاري ۱۶۲/۹ (۷۵۶۳) وصحيح مسلم ۲۰۷۲/٤ (۲٦۹٤)۔

صفاتِ جمال وجلال کے مظہر

میرے شیخ حضرت عارفی قدس اللہ سرہٗ فرمایا کرتے تھے کہ سبحان اللہ وبحمدہٖ یہ باری تعالیٰ کی صفاتِ جمال کا مظہر ہے۔ سبحان اللہ کے معنی اللہ کی ذات بے عیب ہے۔ ہر عیب سے منزہ اور پاک ہے اور وبحمدہٖ کے معنی تمام تعریف کی مستحق ذات وہی ہے جو کہ تمام صفات وکمال کی جامع ہے۔ لہٰذا اس کو آدمی سمجھ کر پڑھے اور اس کو اپنا وظیفۂ حیات بنائے تو اس سے اللہ جل جلالہ کی محبت پیدا ہوگی۔ سُبْحَانَ اللّٰهِ الْعَظِيْمِ میں باری تعالیٰ کی عظمت اور جلال کا بیان ہے اور یہ باری تعالیٰ کی صفاتِ جلال کا مظہر ہے جس کی ذات جلال ہو، اس سے آدمی کو خوف ہوتا اور اس کا رعب طاری ہوتا ہے، لہٰذا پہلا جملہ دل میں محبت بٹھاتا ہے اور دوسرا جملہ رعب اور خوف بٹھاتا ہے۔ جب یہ محبت اور رعب مل جاتے ہیں تو خشیت پیدا ہوتی ہے۔

اِنَّمَا يَخْشَى اللّٰهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمَاءُ (۱)

اللہ سے اس کے بندوں میں سے وہی ڈرتے ہیں جو علم رکھنے والے ہیں۔

تو یہی ایک نکتہ ہے جس پر امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی کتاب کو ختم فرمایا۔ ایک ایسے کلمے پر جو خشیت اللہ پیدا کرنے والا ہے اور خشیت اللہ ہی تمام علوم کی جان اور روح ہے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ اپنے فضل وکرم سے ہمیں اپنے اعمال

---

(۱) سورۃ فاطر آیت (۲۸)۔

میں وزن پیدا کرنے کی توفیق عطا فرمائے اور ہر طرح کے شر سے حفاظت فرمائے۔ آمین۔

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین

دین کیا ہے؟

(اصلاحی مواعظ ج ۲ ص ۱۶۳)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

دین کیا ہے؟

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ نَحْمَدُہٗ وَنَسْتَعِیْنُہٗ وَنَسْتَغْفِرُہٗ وَنُؤْمِنُ بِہٖ وَنَتَوَکَّلُ عَلَیْہِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَیِّئَاتِ اَعْمَالِنَا، مَنْ یَّھْدِہِ اللّٰہُ فَلَا مُضِلَّ لَہٗ وَمَنْ یُّضْلِلْہُ فَلَاھَادِیَ لَہٗ، وَأَشْھَدُ اَنْ لَّا إِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَاشَرِیْکَ لَہٗ وَأَشْھَدُ اَنَّ سَیِّدَنَا وَنَبِیَّنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّداً عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَعَلٰی اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَبَارَکَ وَسَلَّمَ تَسْلِیْمًا کَثِیْرًا کَثِیْرًا۔ أَمَّا بَعْدُ!

فَاَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطَانِ الرَّجِیْمِ

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَ اللّٰہِ الْاِسْلَامُ (۱)

اٰمنت باللّٰہ صدق اللّٰہ مولانا العظیم، وصدق رسولہ

(۱) سورۃ آل عمران آیت (۱۹)۔

النبی الکریم، ونحن علیٰ ذٰلک من الشاھدین والشاکرین، والحمد للہ رب العالمین

جنابِ صدر اور معزز حاضرین!

دین کا مطلب سمجھنے کی ضرورت ہے

''دین کی حقیقت'' کہنے کو اگرچہ چند لفظوں کا مجموعہ ہے، لیکن اگر ہم اس کی تشریح کرنا چاہیں تو ایک طویل موضوع بن جائے گا اور وہ اس طرح کہ پھر اس میں دین کے تمام گوشے آجائیں گے۔ لیکن میں اس وقت ایک بنیادی نکتہ کی طرف آپ حضرات کی توجہ مبذول کرانا چاہتا ہوں اور وہ یہ ہے کہ آج کی فضا میں جب دین کا نام لیا جاتا ہے تو عام طور سے اسے دنیا کا حریف اور مدِ مقابل سمجھا جاتا ہے۔ اسی طرح جب کسی طرف سے یہ پکار بلند ہوتی ہے کہ ''دین کی طرف آؤ'' تو اس کا مطلب بسااوقات یہ سمجھا جاتا ہے کہ دنیا کو بالکل چھوڑ دو اور ذہن میں یہ بات آتی ہے کہ اگر ہم دین کی طرف آگئے تو ہمیں اپنی دنیا کی ضروریات، تقاضے، خواہشات اور دنیا میں رہنے سہنے کے معروف طریقے چھوڑنے پڑیں گے ورنہ ہم دین کی برکات حاصل نہیں کرسکتے۔ گویا دین و دنیا کو اس طرح ایک دوسرے کا حریف سمجھا جاتا ہے کہ دونوں جمع ہی نہیں ہو سکتے، اس لیے میں اس محفل میں یہ بات مختصراً عرض کرنا چاہتا ہوں کہ دین کی حقیقت کیا ہے؟ اور یہ کس معنی میں دنیا کا مدِ مقابل ہے؟ اور کس معنی میں دنیا کا مدِ مقابل نہیں؟

دین کے لیے ہی انسان کو پیدا کیا گیا ہے

بات دراصل یہ ہے کہ جس شخص کا بھی اللہ جل شانہ کی ذات پر ایمان ہے یعنی وہ اس بات کو تسلیم کرتا ہے کہ یہ کائنات کسی بنانے والے نے بنائی ہے، یہ چاند، سورج اور ستارے وجود میں لانے والا اور انسان کو پیدا کرنے والا کوئی ہے، تو ظاہر ہے کہ اس کے بنانے اور بنا کر بھیجنے کا بھی تو کوئی مقصد ہوگا اور اس مقصد کو حاصل کرنے کا طریقہ بھی ضرور ہوگا، کیونکہ ایسا ممکن نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ انسان کو بغیر کسی مقصد کے پیدا کرے اور اس کو ہدایت کی روشنی سے محروم کر کے اندھیرے میں چھوڑ دے۔ حاصل یہ کہ جس شخص کو بھی اللہ جل شانہ کے وجود کا یقین ہے اس کو یہ بھی ماننا پڑے گا کہ اس نے انسان کو ہدایت اور دنیا میں رہنے سہنے کا طریقہ بھی بتایا ہے۔

دنیا میں دو قسم کے معاملات

اس کو دوسرے عنوان سے یوں بھی تعبیر کیا جاسکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ چونکہ عالم الغیب بھی ہے اور حکیم مطلق بھی، اس لیے وہ جانتا تھا کہ انسان کے اس کائنات میں پہنچنے کے بعد وہ بعض چیزوں کو تو اطمینان سے سمجھ کر کسی بیرونی رہنمائی کے بغیر، ان کا اعتراف کر کے ان پر عمل کر سکے گا، لیکن ساتھ ساتھ اللہ کو یہ بھی معلوم تھا کہ اگر انسان کو کسی بیرونی رہنمائی کے بغیر چھوڑ دیا گیا تو کچھ معاملات ایسے بھی ہیں کہ جس میں انسان کی عقل ٹھوکر کھائے گی، جس کی وجہ سے انسان کے بھٹکنے کا اندیشہ ہو جائے گا، لہٰذا اللہ تعالیٰ نے اس اندیشے سے بچاؤ کے لیے انسان کو احکامات کا ایک ایسا مجموعہ عطا فرما دیا کہ جس کی وجہ سے انسان اچھے اور برے کی پہچان کر سکے۔

اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی ہدایت کا خلاصہ

جس جگہ عقل کو کسی بیرونی رہنمائی کی ضرورت نہیں اس کی مثال ایسے ہے کہ اگر ایک طرف گندگی پڑی ہوئی ہو اور دوسری طرف صفائی ستھرائی ہو تو جس انسان کے اندر انسانیت کا ذرا سا بھی شائبہ ہے وہ کبھی بھی گندگی کو پسند نہیں کرے گا، بلکہ ہمیشہ صفائی کو پسند کرے گا۔ معلوم ہوا کہ ایسی چیزوں میں احکام کی ضرورت ہی نہیں، اس لیے کہ عقل اس بات کا صحیح فیصلہ کر دیتی ہے کہ گندگی کے مقابلے میں صفائی زیادہ پسندیدہ ہے۔

اسی طرح لذیذ اور بدمزہ، میٹھی اور کڑوی چیزوں کے بارے میں کسی بیرونی رہنمائی کی ضرورت نہیں ہے۔ لیکن جن چیزوں میں انسان کی عقل دھوکہ دے سکتی تھی وہاں اللہ تعالیٰ نے انبیاء علیہم الصلوٰۃ و السلام کے ذریعے ہدایت کا سامان مہیا کیا اور بتایا کہ یہ چیز اچھی ہے اور یہ بری ہے اور یہی اللہ تعالیٰ کی طرف سے دی ہوئی ہدایت کا خلاصہ ہے۔

حقیقی دین کون سا ہے؟

جب گزشتہ کی ہوئی بات سمجھ میں آگئی تو اب یہ سمجھیے کہ دین کی حقیقت کیا ہے؟ چنانچہ شروع میں تلاوت کردہ آیت میں ارشادِ خداوندی ہے:

اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَ اللّٰہِ الْاِسْلَامُ (۱)

”بے شک اللہ تعالیٰ کے نزدیک دین اسلام ہی ہے“

---

(۱) سورۃ آل عمران آیت (۱۹)۔

یعنی وہ حقیقی دین جو اللہ تعالیٰ نے بندوں کے لیے چنا اور پسند فرمایا ہے وہ ''اسلام'' ہے۔ اسلام کے مصداق کے متعلق تو الحمد للہ ہر مسلمان کو علم ہے کہ اس کا مصداق توحید و رسالت، آخرت اور عقائد ہیں۔

اسلام کا معنی کیا ہے؟

لیکن جس چیز کی طرف میں آپ حضرات کو متوجہ کرنا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ اسلام کا لفظی معنی ہے ''سر جھکا دینا'' اور ''تابع بن جانا'' یعنی جس شخص کا تابع ہوا ہے اس کے ہر قول پر سرِ تسلیم خم کر دینا۔ جیسا کہ ایک دوسری آیت میں اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں سے خطاب کرتے ہوئے ارشاد فرمایا:

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا ادْخُلُوْا فِي السِّلْمِ كَآفَّةً [1]

'اے ایمان والو! اسلام میں داخل ہو جاؤ پورے کے پورے''

یہاں اس بات میں غور یہ کرنا ہے کہ ایک طرف تو اس آیت میں خطاب ہی ان لوگوں سے ہے جو ایمان لا چکے ہیں اور دوسری طرف یہ حکم دیا جا رہا ہے کہ اسلام میں داخل ہو جاؤ۔ معلوم ہوا کہ کلمۂ توحید، جس سے انسان کا ایمان لانا ثابت ہوتا ہے اس کو پڑھ لینا ہی کافی نہیں اور صرف اس پر ہی ایمان مکمل نہیں ہوا، بلکہ ایک اور کام ہے جس کو سرانجام دینے سے انسان اسلام میں داخل ہو سکے گا اور وہ کام یہ ہے کہ انسان اللہ تعالیٰ کے احکام کے آگے اس طرح سر جھکا دے کہ اس کے آگے کسی طرح کی چون و چرا کی گنجائش نہ رہے۔

---

(۱) سورۃ البقرۃ الایۃ (۲۰۸)۔

اسلام کی حقیقت

اس موقع پر میں یہ عرض کیا کرتا ہوں کہ ''سورۂ صافات'' میں جہاں اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم خلیل اللہ، حضرت اسماعیل ذبیح اللہ علیہما السلام کا واقعہ ذکر کیا ہے وہاں اسلام کا لفظ لایا گیا ہے۔ مختصراً اس واقعے کو عرض کیے دیتا ہوں کہ ایک مرتبہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے خواب میں دیکھا کہ وہ اپنے لختِ جگر حضرت اسماعیل علیہ السلام کو اپنے ہاتھوں سے ذبح کر رہے ہیں۔ چونکہ انبیاء علیہم السلام کا خواب بھی وحی ہوتا ہے، اس لیے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اس حکم کو پورا کرنے اور بیٹے کو آزمانے کے لیے فرمایا:

يٰبُنَيَّ اِنِّيْٓ اَرٰى فِي الْمَنَامِ اَنِّيْٓ اَذْبَحُكَ فَانْظُرْ مَاذَا تَرٰى (۱)

بیٹے! میں خواب میں دیکھتا ہوں کہ تمہیں ذبح کر رہا ہوں، اب سوچ کر بتاؤ، تمہاری کیا رائے ہے

اب اگر آپ غور کریں کہ ایک انسان کو قتل کرنا تو ویسے ہی گناہ کبیرہ ہے اور قرآن حکیم میں ارشاد بھی ہے:

مَنْ قَتَلَ نَفْسًۢا بِغَيْرِ نَفْسٍ اَوْ فَسَادٍ فِي الْاَرْضِ فَكَاَنَّمَا قَتَلَ النَّاسَ جَمِيْعًا (۲)

''جو کوئی ایک جان کو بغیر کسی جان کے بدلے قتل کرے یا زمین میں بغیر فساد کرنے کے قتل کرے تو گویا اس نے سب لوگوں کو قتل کر ڈالا''۔

---

(۱) سورۃ الصافات آیت (۱۰۲)۔

(۲) سورۃ المائدۃ آیت (۳۲)۔

اور قتل بھی نابالغ بچہ کا ہو تو وہ اور زیادہ گناہ کا باعث ہے، کیونکہ نبی کریم سرورِ دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حالتِ جنگ میں بھی نابالغ بچے کے قتل سے روکا ہے۔

"نَهٰى رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ عَنْ قَتْلِ النِّسَاءِ وَالصِّبْيَانِ"(۱)

"رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حالتِ جنگ میں عورتوں اور بچوں کو قتل کرنے سے منع فرمایا ہے۔"

پھر اگر وہ نابالغ بچہ خود اپنا بیٹا ہو اور اس کو قتل کرنے کا حکم آجائے تو عقل اس بات کو تسلیم نہیں کرتی کہ نابالغ بیٹے کو قتل کر دیا جائے، لیکن وہ بیٹا جو حضرت ابراہیم علیہ السلام کا تھا اور جس کی صلب سے جناب نبی اکرم سرورِ دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تشریف لانے والے تھے، اس نے جواب دیا:

يٰٓاَبَتِ افْعَلْ مَا تُؤْمَرُ(۲)

"اے اباجان! آپ کو جو حکم دیا جاتا ہے اس کو کر گزریئے"

اس تمام واقعے کو نقل کرنے کے بعد قرآن اس قصے کو یوں پورا کرتا ہے:

فَلَمَّآ اَسْلَمَا وَتَلَّهٗ لِلْجَبِيْنِ (۳)

"جب باپ اور بیٹے نے سر تسلیم خم کر دیا اور باپ نے بیٹے کو پیشانی کے بل لٹا دیا"

---

(۱) صحيح البخاري ج٤ص ٦١ حديث ٣٠١٥ وصحيح مسلم ج٣ص١٣٦٤ حديث (١٧٤٤)

(۲) سورۃ الصافات آیت (۱۰۲)۔

(۳) سورۃ الصافات آیت (۱۰۳)۔

تو یہاں جو لفظِ اسلام لایا گیا ہے اس سے اس بات کی طرف اشارہ مقصود ہے کہ اسلام حقیقت کی یہ ہے کہ جب اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی طرف سے کوئی حکم آجائے تو انسان آگے سے ''کیوں'' کا سوال نہ کرے بلکہ اس پر سرِ تسلیم خم کر کے اس کے مطابق عمل کرے، اس لیے کہ ''کیوں'' کا سوال بندگی کا نہیں، اعتراض کا ہے۔

احکامِ اسلام کے بارے میں ایک گمراہانہ روش

جیسا کہ ہمارے یہاں جب بھی دین سے متعلق کوئی حکم بیان کیا جاتا ہے تو اس میں ایک گمراہانہ طریقہ رائج ہے کہ ''ایسا حکم کیوں ہے؟'' اور بعض اوقات اس کے پیچھے یہ جذبہ ہوتا ہے کہ اگر یہ بات ہماری سمجھ میں آگئی تو ہم اس کو مان کر اس پر عمل کریں گے، ورنہ نہیں۔ یہ چیز اسلام کی روح کے خلاف ہے، اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے ایسے ہی موقع پر حکم بھیجے ہیں جہاں انسانی عقل کے ٹھوکر کھانے کا اندیشہ تھا، لہٰذا اگر کسی حکم کی مصلحت سمجھ میں نہ آئے تو یہ کوئی تعجب کی بات نہیں ہے۔

دین کے احکام میں تاویلات کی تلاش کا رویہ

اگر آپ مغربی فلسفے کی تاریخ کا مطالعہ کریں تو آپ کو معلوم ہوگا کہ ایک ایسا طبقہ بھی گزرا ہے جس کا دعویٰ ہی یہ ہے کہ اس کائنات میں خیر و شر یعنی اچھائی اور برائی سب اضافی چیزیں ہیں، لہٰذا جس ماحول میں جو چیز جس حیثیت سے رائج ہوگی اس کا اعتبار کیا جائے گا اور وہ لوگ احکامات میں طرح طرح کی

تاویلات کرتے ہیں۔ مثلاً حکمِ شرعی ہے کہ خنزیر کا گوشت حرام ہے، اگرچہ طبّی نقطۂ نظر سے اس کی کچھ وجوہات ہماری سمجھ میں آجاتی ہیں،لیکن حقیقی وجہ اللہ ہی کے علم میں ہے، لیکن وہ خنزیر کے گوشت کے جواز کا دعویٰ کرکے اس کی دلیل یوں پیش کرتے ہیں کہ جس وقت خنزیر کا گوشت حرام کیا گیا اس وقت عرب میں خنزیر گندی جگہوں پر پھرتے تھے اور نجاست کھاتے تھے، جس کی وجہ سے ان سے بیماریاں پیدا ہوتی تھیں۔لیکن آج کل خنزیروں کی تربیت بہت اچھے انداز میں ہورہی ہے، لہٰذا علّت ختم ہوجانے کی وجہ سے حکم بھی باقی نہ رہا۔ اور یہ بات اتنی بڑھ چکی ہے کہ ایک صاحب تو مجھ سے اس بات پر بحث کرنے کو بھی تیار تھے اور کہتے تھے کہ علماء کو چاہیے کہ خنزیر کے حرام ہونے کے حکم کے بارے میں اجتہاد کریں کہ خنزیر فلاں وجہ سے حرام تھا، اب چونکہ وہ وجہ ختم ہوگئی ہے، اس لیے وہ حکم بھی ختم ہوگیا ہے اور خنزیر کا گوشت حلال ہے۔ یہ صرف اس وجہ سے ہے کہ انسان نے اپنی عقل کو وہاں استعمال کیا جہاں انسانی عقل کی رسائی نہیں ہوسکتی، اس لیے اللہ تعالیٰ نے ہماری رہنمائی فرمائی ہے۔ لہٰذا یہ طرزِ عمل کہ احکاماتِ دینیہ کے بارے میں حقیقی مصلحت کا سوال کرنا اور مصلحت کے سمجھنے پر عمل کو موقوف کرنا دین کی حقیقت سے ناواقفیت کی دلیل ہے۔

حکمتِ دین کا سوال کرنا مناسب نہیں

اس بات کو میں ایک مثال سے سمجھایا کرتا ہوں۔آپ کو معلوم ہے کہ دنیا میں انسانوں کے دو درجے ہوتے ہیں، جن میں سے ایک درجہ غلامی کا ہے، جو الحمدللہ ختم ہوچکا ہے اور اس کی جگہ ملازمت آگئی ہے، جو غلامی سے بہت کم درجہ

کی نسبت رکھتی ہے، کیونکہ غلامی میں غلام کو چوبیس گھنٹے کام کاج اور خدمت وغیرہ کے لیے موجود ہونا ضروری ہوتا تھا اور ان کی کوئی تنخواہ بھی مقرر نہیں ہوتی تھی۔ جب کہ ملازمت میں چوبیس گھنٹوں میں سے مخصوص وقت تک کام کاج کرنے پڑتے ہیں، نیز ملازم کو تنخواہ بھی دی جاتی ہے۔

آپ کے گھر میں ایک ملازم ہو اور آپ اس سے کہیں کہ ''مجھے ۵ گڑوی دودھ لا کر دو'' اور وہ ملازم کہے کہ'' آپ یہ دودھ کیوں منگوا رہے ہیں؟ اس کی وجہ بتائیں جب تک آپ مجھے اس کی وجہ نہ بتائیں گے میں آپ کو دودھ لا کر نہیں دوں گا۔'' تو بتایئے کہ اس کے مقابلے میں آپ کا کیا ردِّعمل ہوگا؟ ظاہر ہے آپ اس سے ناراض ہوں گے، حالانکہ وہ بھی آپ ہی کی طرح کا ایک انسان ہے۔تو وہ اللہ جو خالق و مالک اور کائنات کی تمام چیزوں کا عالم ہے، اس کے مقابلے میں تمہارا علم کیا حقیقت رکھتا ہے؟ لہٰذا بندے کو یہ حق کیسے دیا جا سکتا ہے کہ وہ کہے کہ پہلے ''مجھے اس کی حکمت بتاؤ پھر اس پر عمل کروں گا۔'' اس بارے میں قرآن حکیم میں ارشاد ہے:

وَ مَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَّ لَا مُؤْمِنَةٍ اِذَا قَضَى اللّٰهُ وَ رَسُوْلُهٗۤ اَمْرًا اَنْ يَّكُوْنَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ مِنْ اَمْرِهِمْ (۱)

جب اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے کوئی حکم آجائے
تو مومن مرد و عورت کے لیے اپنے کام میں کوئی اختیار
نہیں رہتا۔

(۱) سورۃ الاحزاب آیت (۳۶)۔

زاویۂ نگاہ تبدیل کرنے سے دین حاصل ہوسکتا ہے

البتہ یہ بات سمجھ لیجیے کہ اللہ تعالیٰ نے اس قسم کے جو احکام دیے ہیں جن کے آگے سرِتسلیم خم کرنا پڑتا ہے، وہ احکام انسان کی زندگی میں معدودے چند (گنتی کے چند) ہیں اور ان کے علاوہ زندگی کا سارا حصہ آزاد ہے۔ مثلاً کھانا پکانا اور معیشت کا انتظام وغیرہ بے شمار دائرے غیر معین ہیں۔

دین کی حقیقت یہ ہے کہ انسان اللہ کے دیے ہوئے احکام کا پابند ہوجائے، خواہ وہ احکام، اوامر ہوں یا نواہی اور باقی امور میں بھی اگر انسان ان کا پابند ہوجائے تو وہ بھی دین بن جائے گا۔ جیسا کہ میں نے شروع میں عرض کیا تھا کہ دین اور دنیا ایک دوسرے کے حریف نہیں بلکہ ایک دوسرے کے مؤیِّد اور مُکَمِّل (تکمیل کرنے والے) ہیں۔

یعنی دنیوی زندگی میں اگر ذرا سا زاویۂ نگاہ بدل لیا جائے تو یہی دنیا دین بن جاتی ہے۔ مثلاً کھانا تو ہر شخص کھاتا ہے، لیکن اگر اس نقطۂ نظر سے کھانا کھایا جائے کہ یہ میرے اللہ کی عطا ہے اور اس کی ایسی نعمت ہے جو میں نے حلال طریقے سے کمائی ہے اور میں اس کو اس لیے کھا رہا ہوں تاکہ جو حق اللہ نے میرے نفس کا مجھ پر عائد کیا ہے میں اس حق کو ادا کردوں، تو یہ بھی دین بن جائے گا۔ جیسے آپ نے وہ تصویریں تو دیکھی ہی ہوں گی جن کو ایک طرف دیکھنے سے ایک چیز اور دوسری طرف دیکھنے سے دوسری چیز نظر آتی ہے، بالکل اسی طرح دین اور دنیا کا معاملہ ہے۔

دین اور دنیا ایک دوسرے کے حریف نہیں

میں ایک پریکٹیکل بات عرض کرتا ہوں کہ صبح اُٹھنے کے بعد انسان یہ تہیہ کر لے کہ میں آج کے دن جو بھی کام کروں گا وہ اللہ تعالیٰ کی مرضی کے مطابق انجام دوں گا اور ہر کام اللہ تعالیٰ کے عائد کیے ہوئے حقوق کی ادائیگی کے لیے کروں گا۔ بس اگر آپ اپنی ڈیوٹی پر جارہے ہیں تو اس تہیہ کے ذریعے آپ کا سارا دن دین بن جائے گا۔ اگر آپ بیوی بچوں کے ساتھ اسی نیت سے خوش طبعی کررہے ہیں تو یہ بھی دین ہے اور اس میں صرف ایک شرط ہے کہ وہ کام ناجائز یا حرام طریقے کے حصول کے لیے نہ کررہا ہو تو یہی عمل آخرت میں اس کے دخولِ جنت کا سبب بن جائے گا۔ حاصل یہ کہ دین اور دنیا ایک دوسرے کے حریف نہیں ہیں۔

امام محمد رحمۃ اللہ علیہ سے ایک سوال

اسی طرح معیشت کو انجام دینے کے جو طریقے اللہ تعالیٰ نے رکھے ہیں۔ مثلاً زراعت، ملازمت، صنعت اور تجارت غرض یہ کہ تمام کام نیت کی بنا پر دین بن جاتے ہیں۔

امام محمد بن حسن شیبانی رحمۃ اللہ علیہ سے کسی نے پوچھا کہ ’’حضرت! آپ نے کتابیں تو بہت تصنیف کی ہیں لیکن تصوّف اور روحانیت کے موضوع پر آپ نے کوئی کتاب نہیں لکھی؟‘‘ تو انہوں نے فرمایا کہ ’’میں نے انسان کی معیشت کے بارے میں جو کتاب لکھی ہے وہ تصوف ہی تو ہے۔ اس لیے کہ میں نے اس میں لکھا ہے کہ معیشت حاصل کرنے کے جو بھی طریقے ہیں ان کو انسان

اللہ کی رضا مندی کے لیے استعمال کرلے تو یہی چیزیں انسان کے لیے دین اور آخرت میں نجات کا ذریعہ بن جاتی ہیں اور درحقیقت یہ بھی تصوّف ہی کی بات ہے۔"(۱)

انسان کا ہر لمحہ دین بن سکتا ہے

انسان کا کوئی لمحہ ایسا نہیں ہے جس کو وہ دین نہ بنا سکے۔ صرف اور صرف اخلاصِ نیت سے انسان اپنی دنیا کو دین بنا سکتا ہے بشرطیکہ احکامِ الٰہیہ کے مطابق ہو۔ اور اس کے ساتھ ساتھ اتنا کام اور کرے کہ جن چیزوں کو اللہ تعالیٰ نے حرام قرار دیا ہے ان سے بچنے کا اہتمام کرے تو ساری دنیا، دین بن جائے گی۔

وآخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ

(۱) المبسوط للسرخسی ج۱۲ص۱۱۰ طبع دار المعرفۃ بیروت۔
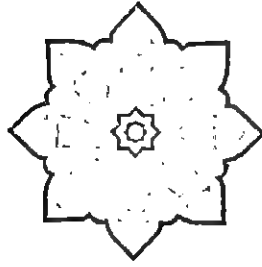
دین احکامات ماننے کا نام ہے

(اصلاحی مجالس جلد ۳ ص ۲۴۴)
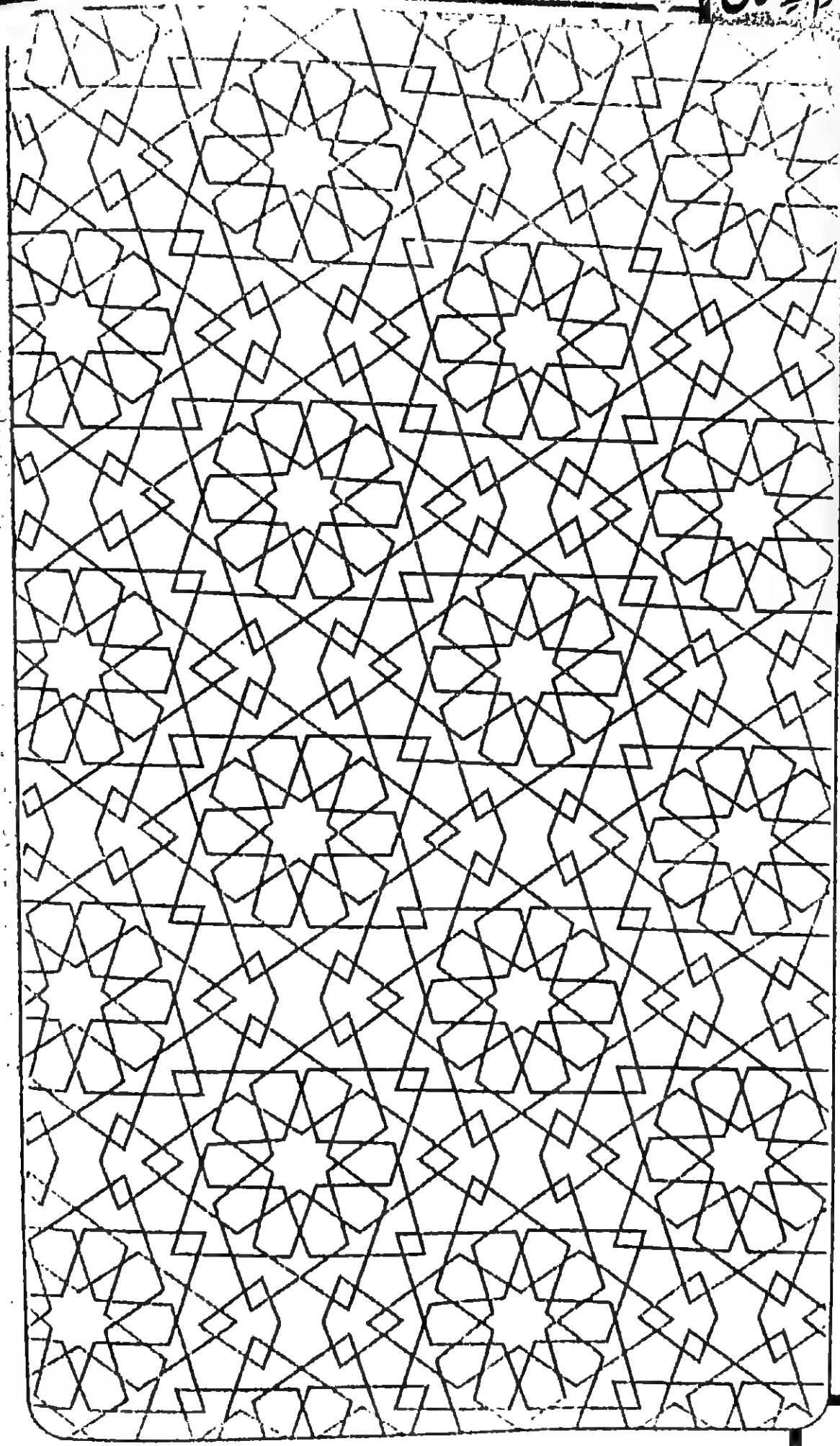
بسم اللہ الرحمن الرحیم

دین خواہشات کے بجائے احکامات کے ماننے کا نام ہے

الحمد للہ رب العالمین والعاقبۃ للمتقین والصلاۃ والسلام علی رسولہ الکریم وعلی آلہ واصحابہ اجمعین، امابعد!

اذان کے وقت ذکر موقوف کر دینا چاہیے

حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی قدس اللہ سرہ نے ارشاد فرمایا:

"ذکر کی حالت میں اگر اذان ہونے لگے تو ذکر موقوف کر کے جواب ہی دینا زیادہ مناسب ہے اور اس کو مخل ذکر نہ سمجھا جائے۔ سنن کی برکت سے ذکر کا معدن منور ہوتا ہے۔ اور اس سے ذکر میں زیادہ اعانت ہوتی ہے۔

(انفاسِ عیسیٰ، ص ۹٦)

یعنی اگر انسان ذکر میں یا تلاوت میں مشغول ہو اور اس دوران اذان ہونے لگے تو اس وقت اس ذکر اور تلاوت کو موقوف کر کے اذان کا جواب دینا چاہیے اور اذان کے جواب کو مخل ذکر نہ سمجھنا چاہیے، کہ اذان کے جواب کی وجہ سے ہمارا ذکر رک گیا، اس لیے کہ اتباعِ سنت کے لیے آپ ذکر سے رک گئے تو اس کے نتیجے میں ذکر کا معدن اسی سے منور ہو رہا ہے۔ اس لیے اذان کا جواب ذکر کے اندر مخل نہیں، بلکہ ذکر کے اندر مزید معیّن ہے اور ذکر کو زیادہ پُرنور بنانے والا ہے، کیونکہ جب اذان کے جواب دینے کے لیے رک گئے تو یہ اتباعِ سنت میں رکے اور اتباعِ سنت میں جو نور ہے وہ اس ذکر کو بھی مزید منور کر دے گا۔

تقاضۂ وقت پر عمل کرنے کا نام دین ہے

اس کے ذریعے وہی بات سامنے آتی ہے جو ہمارے حضرت ڈاکٹر عبدالحی صاحب قدس اللہ سرہ فرمایا کرتے تھے کہ ''دیکھو! تقاضۂ وقت پر عمل کرنے کا نام ''دین'' ہے، جس وقت جس کام کا تقاضا ہو اس وقت وہ کام کرے، اسی کا نام ''دین'' ہے۔ یہ نہ ہو کہ اپنی طرف سے تجویز کر لیا کہ ہم تو فلاں کام کریں گے، اب فلاں کام کرنے کی فکر ہے، اگر درمیان میں کسی دوسرے کام کا تقاضا آ گیا تو دل کُڑھ رہا ہے اور رنجیدہ ہو رہا ہے کہ میں نے جو کام تجویز کیا تھا وہ نہ ہوا۔''

یہ بڑے کام کی بات ہے، خاص طور پر ہم جیسے لوگ جو طالب علمی کا دعویٰ کرتے ہیں اور لکھنے پڑھنے میں مشغول رہتے ہیں، ان کے لیے خاص طور پر یہ بات بڑے کام کی ہے۔

تصنیف کے وقت ملاقات کرنے پر طبیعت میں گرانی

مجھے بہت سی مصروفیات اور مشاغل رہتے ہیں، جس کی وجہ سے اپنا ایک ''نظام الاوقات'' بنا رکھا ہے کہ فلاں وقت میں یہ کام کروں گا اور فلاں وقت میں یہ کام کروں گا۔ تصنیف کا بھی ایک وقت مقرر کر رکھا ہے کہ یہ دو گھنٹے کتب خانہ میں تصنیف کے کام میں لگاؤں گا۔ اب اس تصنیف کے وقت میں اگر کوئی شخص ملاقات کے لیے آجاتا تو طبیعت پر بڑی گرانی ہوتی کہ اس نے میرے کام میں خلل ڈال دیا یا کوئی دوسری ضرورت اس وقت سامنے آجاتی تو طبیعت پر بار محسوس ہوتا تھا اور دل پر بڑی تکلیف اور مشقت محسوس ہوتی تھی۔

یہ تصنیف کس لیے کر رہے ہو؟

میں نے اپنے شیخ حضرت ڈاکٹر عبدالحئی صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے اس بارے میں عرض کیا کہ میرے ساتھ ایسا ہوتا ہے۔ حضرت والا نے ایسی بات ارشاد فرمائی کہ الحمدللہ وہ دن ہے اور آج کا دن ہے، اس کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے دل میں ٹھنڈک ڈال دی۔ حضرت والا نے فرمایا کہ ''تمہیں یہ تکلیف اس وجہ سے ہوتی ہے کہ تم نے اپنی طرف سے یہ تجویز کر لیا کہ فلاں وقت فلاں کام میں ہی ضرور صرف کرنا ہے، اگر اس وقت میں یہ کام کر لیا تب تو کامیابی ہے ورنہ ناکامی ہے۔ ارے بھائی! بتاؤ کہ یہ تصنیف کا جو کام کر رہے ہو یہ اللہ کے لیے کر رہے ہو یا اس کے ذریعے مصنف بننے اور اپنی تصنیف کو مکمل کرنے کا شوق ہے، اگر تمہیں مصنف بننے اور اپنی تصنیف کو مکمل کرنے کا شوق ہے تو پھر تمہارا یہ رنج، یہ صدمہ، یہ تکلیف بالکل برحق ہے، اس لیے کہ تمہاری یہ تصنیف پوری نہ ہوسکی،

کیونکہ درمیان میں کسی نے رکاوٹ ڈال دی، لیکن اگر اس کتاب کے لکھنے سے پیشِ نظر اللہ تعالیٰ کی رضا اور اس کی خوشنودی ہے، تو پھر جب تک وہ لکھنے میں خوش ہیں، اس وقت تک لکھتے رہو اور جب کوئی مہمان ملاقات کے لیے آ گیا تو اب وہ اس میں خوش ہیں کہ تم اس مہمان کا اکرام کرو، اس لیے کہ مہمان کا اکرام کرنا سنت ہے یا لکھنے کے دوران کوئی عارض پیش آ گیا، مثلاً اس وقت والدین کی خدمت کا کوئی مسئلہ پیش آ گیا یا بیوی بچوں کی خدمت کا کوئی مسئلہ پیش آ گیا یا شاگردوں کی خدمت کا کوئی مسئلہ پیش آ گیا یا کسی بڑے نے اس وقت بلالیا، تو اب اس وقت کا تقاضا یہ ہے کہ تصنیف کے کام کو چھوڑو اور وہ کام کرو، اب ان کی رضا اس میں ہے۔ لہٰذا تمہارا کیا نقصان ہے، جو کام تم پہلے کر رہے تھے، اس میں بھی رضا حاصل تھی اور اب وہ کام چھوڑ کر دوسرا کام کرلیا تو یہ بھی ان کی رضا کے مطابق ہے اور مقصود تو ان کی رضا ہے، چاہے اس سے حاصل ہو یا اس سے حاصل ہو۔'' حضرت والا نے جب یہ بات ارشاد فرمائی تو اس کے بعد سے الحمدللہ دل میں ٹھنڈک پڑ گئی۔

وہ بھی اللہ کے لیے یہ بھی اللہ کے لیے

انسان بہرحال انسان ہے، جب اس نے اپنا ایک نظام الاوقات بنا رکھا ہے، اگر اس میں خلل واقع ہوتا ہے تو اس سے تکلیف تو اب بھی ہوتی ہے، لیکن یہ تکلیف طبعی ہوتی ہے، عقلی تکلیف نہیں ہوتی۔ عقلی طور پر دل مطمئن ہے کہ الحمدللہ وہ کام بھی اللہ کے لیے کر رہے تھے اور یہ کام بھی اللہ کے لیے کر رہے ہیں۔ اس لیے جس وقت اللہ تعالیٰ جس کام کی توفیق دے دے یہ ان کا کام ہے۔ بہرحال! یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ یہ دیکھو کہ اس وقت کا شرعی تقاضا کیا ہے؟

اپنا شوق پورا کرنے کا نام دین نہیں

ہمارے حضرت مولانا مسیح اللہ خان صاحب رحمۃ اللہ علیہ، یہ وہ لوگ ہیں کہ اللہ تعالیٰ بڑے کانٹے کی بات ان کے دل پر القا فرماتے ہیں۔ وہ ایک بڑے کام کی بات فرمایا کرتے تھے۔ فرماتے کہ بھائی! اپنا شوق پورا کرنے کا نام ''دین'' نہیں، بلکہ اللہ اور اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اتباع کا نام ''دین'' ہے۔ یہ نہ ہو کہ ہمیں فلاں کام کرنے کا شوق ہوگیا، اب تو ہم وہی کام کریں گے، مثلاً عالم بننے کا شوق ہوگیا کہ مدرسہ میں جا کر عالم بنیں گے، اس سے قطعِ نظر کہ تمہارے لیے عالم بننا جائز بھی ہے یا نہیں؟ مثلاً گھر میں ماں بیمار پڑی ہے یا باپ بیمار پڑا ہے اور کوئی دوسرا شخص دیکھ بھال کرنے والا نہیں ہے، لیکن آپ ماں باپ کو بیمار چھوڑ کر مدرسے میں چلے آئے، یہ دین نہیں ہے، یہ اپنا شوق پورا کرنا ہے، دین کا کام یہ ہے کہ ایسے وقت میں پڑھنا چھوڑ دو اور ماں کی اور باپ کی خدمت کرو۔

مفتی بننے کا شوق

یا مثلاً ''مفتی'' بننے کا شوق ہوگیا، میرے پاس بہت سے طلبہ آتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہمیں ''تخصص'' پڑھنے کا شوق ہے، ''فتویٰ'' سیکھنا چاہتے ہیں''۔ میں ان سے پوچھتا ہوں کہ ''والدین کا کیا منشا ہے؟'' جواب دیتے ہیں کہ ''والدین تو ہمارے تخصص پڑھنے پر راضی نہیں ہیں۔'' اب دیکھیے کہ والدین تو راضی نہیں ہیں اور یہ ''مفتی صاحب'' بننا چاہتے ہیں، یہ دین نہیں ہے، یہ اپنا شوق پورا کرنا ہے۔

تبلیغ کرنے کا شوق

یا مثلاً تبلیغی سفر کرنے کا شوق ہوگیا۔ ویسے تو تبلیغ کرنا بڑے ثواب کا اور بڑی فضیلت کا کام ہے، لیکن جس وقت گھر میں بیوی بیمار پڑی ہے اور دوسرا کوئی محرم دیکھ بھال کرنے والا نہیں ہے، اس وقت تبلیغ کے لیے سفر میں جانا اور چلہ لگانا دین نہیں، یہ اپنا شوق پورا کرنا ہے۔ کیونکہ اس وقت دین کا اور وقت کا تقاضا یہ ہے کہ اس بیمار کی تیمارداری کرو، اس کا خیال کرو، یہ دنیا نہیں ہے بلکہ یہ بھی دین کا تقاضا ہے۔

ایسے وقت میں جماعت کی نماز چھوڑ دو

حضرت مولانا مسیح اللہ خان صاحب رحمۃ اللہ علیہ اس کی ایک بڑی اچھی مثال دیا کرتے تھے کہ ''ایک شخص ویرانے میں اور جنگل میں ہے، آس پاس قریب میں کوئی آبادی نہیں ہے، اس ویرانے میں میاں بیوی اکیلے ہیں، اب شوہر صاحب کو مسجد جا کر جماعت سے نماز پڑھنے کا شوق ہوگیا، بیوی اس سے کہتی ہے کہ یہ ویرانہ ہے، جنگل ہے، اگر تم نماز پڑھنے کے لیے دور آبادی میں چلے جاؤ گے تو میں یہاں جنگل میں اکیلی رہ جاؤں گی اور مجھے تو یہاں جنگل میں اکیلے ڈر لگ رہا ہے اور ڈر کی وجہ سے میری جان نکلی جارہی ہے، اس لیے آج تم نماز یہیں پڑھ لو، لیکن چونکہ شوہر صاحب تو جماعت سے نماز پڑھنے کے شوقین تھے، اس لیے وہ بیوی کو اکیلے چھوڑ کر مسجد کی طرف روانہ ہوگئے۔ حضرت والا فرماتے ہیں کہ یہ دین پر عمل نہیں ہے، بلکہ اپنا شوق پورا کرنا ہے'' کیونکہ اس وقت کا تقاضا یہ تھا کہ وہ اسی جگہ قریب میں نماز پڑھتا اور بیوی کی یہ تکلیف دور کرتا۔ یہ صورت

اس وقت ہے جہاں ویرانہ ہے اور کوئی آبادی نہیں ہے اور نہ کوئی دوسرا دیکھ بھال کرنے والا ہے، لیکن جہاں آبادی کے اندر یہ صورت ہو، وہاں جماعت سے نماز پڑھنے کے لیے مسجد میں ہی جانا چاہیے۔

بہرحال! کسی کو جہاد کرنے کا شوق ہے، کسی کو تبلیغ کرنے کا شوق ہے، کسی کو مولوی بننے کا شوق ہے، کسی کو مفتی بننے کا شوق ہے اور اس شوق کا نتیجہ یہ ہے کہ دوسروں کے جو حقوق اپنے ذمے ہیں، ان کی ادائیگی کا کوئی خیال نہیں کہ اس وقت میں ان حقوق کا تقاضا کیا ہے؟

حضرت اویس قرنی رحمۃ اللہ علیہ

حضرت اویس قرنی رحمۃ اللہ علیہ کو دیکھیے، اس سے بڑی سعادت دنیا میں کوئی ہو نہیں سکتی کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زیارت نصیب ہو۔ ''صحابیت'' کا وہ مقام جو کسی کو اس کے بغیر میسر آ ہی نہیں سکتا کہ وہ سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زیارت کرے۔ ''صحابیت'' کا یہ مقام ان سے چھڑا دیا گیا، کیوں چھڑا دیا گیا؟ ماں کی خدمت کی وجہ سے چھڑا دیا گیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو وہ مقام عطا فرمایا کہ حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو یہ نصیحت فرما رہے ہیں کہ ''اویس قرنی'' ایک بزرگ ہیں جو قرن سے تشریف لائیں گے، جب تمہاری ان سے ملاقات ہو تو ان سے اپنے حق میں مغفرت کی دعا کرانا۔''[1]

(۱) صحیح مسلم ج ٤ ص ١٩٦٤ حدیث (٢٥٤٢) ومسند ابی یعلی ج ۱ ص ۱۸۷ حدیث (۲۱۲) طبع دار المامون للتراث دمشق، والاصابہ فی تمییز الصحابة لابن حجر ج ۱ ص ۳۵۹ طبع دار الکتب العلمیة۔

شیخ کی ضرورت ایسے موقع پر ہوتی ہے

یہ مقام اتباع سے اور وقت کے تقاضے پر عمل کرنے سے حاصل ہوتا ہے، یہ نہیں کہ دل میں کسی عمل کا شوق پیدا ہوگیا اور وہ عمل کرنا شروع کر دیا، اس کے لیے کسی رہنما کی اور شیخ کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہ جو کہا جاتا ہے کہ کسی شیخ سے تعلق قائم کرو، یہ درحقیقت اسی واسطے ہے، ایسے موقع پر وہ صحیح رہنمائی کرتا ہے، ورنہ آدمی افراط وتفریط میں مبتلا ہوجاتا ہے۔

میں ان کاموں کا مخالف نہیں ہوں

یہ باتیں جو میں بتارہا ہوں، ان باتوں کو کوئی شخص میری طرف منسوب کرکے اس طرح آگے نقل کردے گا کہ وہ صاحب تو یہ کہہ رہے تھے کہ ”مفتی بنا بُری بات ہے، وہ تو تبلیغ کے مخالف ہیں، وہ تو تبلیغ کے خلاف کہہ رہے تھے کہ تبلیغ میں چلہ لگانے نہیں جانا چاہیے اور وہ تو یہ کہہ رہے تھے کہ جہاد میں نہیں جانا چاہیے۔“ حالانکہ اصل بات یہ ہے کہ یہ سب اپنے اپنے وقت میں اللہ تعالیٰ کی رضا کے کام ہیں، یہ دیکھو کہ کس وقت کیا تقاضا ہے؟ اس وقت کیا مطالبہ ہورہا ہے؟ اس مطالبے کے مطابق عمل کرو، اس تقاضے پر عمل کرو۔ یہ نہ ہو کہ اپنے دماغ سے ایک راستہ تجویز کرلیا کہ مجھے تو یہ کرنا ہے اور پھر اس کے مطابق چل کھڑے ہوئے، یہ دین نہیں ہے، دین یہ ہے کہ ہر موقع پر یہ دیکھو کہ وہ کیا کہہ رہے ہیں؟ وہ کس بات کا حکم دے رہے ہیں؟

کسی نے خوب کہا ہے ؎

میرے محبوب مری ایسی وفا سے توبہ
جو ترے دل کی کدورت کا سبب بن جائے

بظاہر دیکھنے میں تو وہ وفا معلوم ہو رہی ہے، لیکن جو تیرے دل کی کدورت کا سبب بن جائے وہ کیسی وفا ہے؟ وہ تو بے وفائی ہے۔

سہاگن وہی جسے پیا چاہے

لہٰذا اصل چیز دیکھنے کی یہ ہے کہ میرے اس عمل سے وہ راضی ہیں یا نہیں؟ میرے والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ ہندی زبان کی ایک مثل ہے کہ

سہاگن وہی جسے پیا چاہے

اس مثل کے پیچھے ایک واقعہ ہے، وہ یہ کہ ایک لڑکی کو دلہن بنایا جا رہا تھا، اس کو سنگھار کر کے سجایا جا رہا تھا۔ اب میک اپ کے بعد جو کوئی اس لڑکی کو دیکھتا اس کی تعریف کرتا کہ تو بہت خوب صورت لگ رہی ہے، تیرا چہرہ اتنا خوبصورت ہے، تیرا جسم اتنا خوبصورت ہے، تیرے کپڑے اور تیرا زیور بہت خوبصورت ہے۔ سب اس کی تعریف کرتے، لیکن وہ لڑکی سب کی تعریف سن کر کسی خوشی کا اظہار نہ کرتی، اور سنی ان سنی کر دیتی۔ کسی نے اس لڑکی سے کہا کہ "یہ تیری سہیلیاں تیری اتنی تعریف کر رہی ہیں، اس سے تجھے کوئی خوشی نہیں ہو رہی؟" اس لڑکی نے جواب دیا کہ "ان کی تعریف کرنے سے کیا خوش ہوں، اس لیے کہ ان کی تعریف تو ہوا میں اڑ جائے گی۔ بات تو اس وقت ہے کہ جس کے لیے مجھے سنوارا جا رہا ہے وہ میری تعریف کرے اور وہ پسند کر لے کہ ہاں یہ خوبصورت ہے۔ تب تو فائدہ ہے اور اس کا اثر یہ ہوگا اس سے میری زندگی سنور جائے گی۔ لیکن اگر یہ سہیلیاں تو میری تعریف کر کے چلی گئیں اور جس کے لیے مجھے سنوارا گیا تھا، اس نے مجھے ناپسند کر دیا، تو پھر اس دلہن بننے کا اور اس سنگھار کا کیا فائدہ؟"

اس ذات کی پسندیدگی کو دیکھو

یہ واقعہ سنا کر حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ ''یہ دیکھو کہ جس کے لیے وہ کام کر رہے ہو، اس کو پسند ہے یا نہیں؟'' اگر لوگوں نے آپ کو کہہ دیا کہ آپ بڑے مفتی صاحب ہیں یا آپ بڑے مولانا صاحب ہیں یا لوگوں نے یہ کہہ دیا کہ یہ شخص بڑا مبلّغ ہے، تبلیغ میں بڑا وقت لگاتا ہے، اللہ کے راستے میں نکلا ہوا ہے یا کسی کے بارے میں کہہ دیا کہ یہ شخص بڑا مجاہد ہے۔ بتائیے کہ لوگوں کے اس کہنے سے کیا حاصل ہوا؟ کچھ نہیں۔ بات اس وقت ہے کہ جس کے لیے یہ سب کام کر رہے ہو وہ یہ کہہ دے کہ......

یہ بندہ دو عالم سے خفا میرے لیے ہے

اس وقت فائدہ ہے، اس لیے کہ ان اعمال سے ان کو ہی راضی کرنا مقصود ہے۔

ذکر کو روک کر اذان کا جواب دو

اور جب ان کو راضی کرنا مقصود ہے تو آدمی کو یہ دیکھنا چاہیے کہ اس وقت مجھ سے کیا مطالبہ ہو رہا ہے، لہٰذا یہ جو کہا جا رہا ہے کہ جب اذان ہو رہی ہو تو ذکر چھوڑ دو اور مؤذن کی آواز سنو، اور اس کا جواب دو۔ اگر آپ یہ سوچیں کہ اس میں تو وقت ضائع ہو رہا ہے، اگر اس وقت میں ذکر کرتا تو کئی تسبیحات پڑھ لیتا، لیکن جب یہ حکم دے دیا کہ اب ذکر سے رک جاؤ تو اب رک جانا چاہیے، اس رکنے میں ہی فائدہ ہے۔

سب کچھ ہمارے حکم میں ہے

یہ ''حج'' اللہ تعالیٰ نے بڑی عجیب وغریب عبادت بنائی ہے، اس حج کو ذرا غور سے دیکھیں تو یہ نظر آئے گا کہ اس میں قدم قدم پر اللہ تعالیٰ نے قاعدوں کے بت توڑے ہیں۔ مثلاً مسجد حرام میں ایک نماز کا ثواب ایک لاکھ نمازوں کے برابر ہے،(۱) لیکن ۸ ذی الحجہ کو یہ حکم دیا جاتا ہے کہ ''مسجد حرام کو چھوڑو اور منیٰ جاؤ، وہاں ایک دن قیام کرو''۔ اب منیٰ میں نہ حرم ہے، نہ کعبہ ہے، نہ وقوف ہے، نہ رمی ہے، نہ کوئی اور کوئی کام ہے، بس یہ حکم ہے کہ وہاں پانچ نمازیں ادا کرو، ایک لاکھ نمازوں کا ثواب چھوڑو اور وہاں جنگل میں جاکر نمازیں پڑھو۔ اس حکم کے ذریعے یہ بتانا مقصود ہے کہ بذاتِ خود نہ کعبہ میں کچھ رکھا ہے، نہ حرم میں کچھ رکھا ہے اور نہ مسجدِ حرام میں کچھ رکھا ہے، جو کچھ ہے وہ ہمارے حکم میں ہے۔ جب ہم نے کہا کہ مسجدِ حرام میں نماز پڑھو تو اس وقت ایک نماز پر لاکھ نمازوں کا ثواب ہے اور جب ہم نے کہا کہ مسجدِ حرام کی نماز کو چھوڑو، تو اب اگر وہاں نماز پڑھو گے تو ثواب کے بجائے الٹا گناہ ہوگا، اس لیے کہ تم نے ہمارے حکم کی خلاف ورزی کی۔

اصل مقصود اطاعتِ خداوندی ہے

نماز وقت پر پڑھنے کی کتنی تاکید آئی ہے، چنانچہ قرآن کریم کا ارشاد ہے:

اِنَّ الصَّلٰوۃَ کَانَتْ عَلَی الْمُؤْمِنِیْنَ کِتٰبًا مَّوْقُوْتًا (۲)

---

(۱) مصنف عبد الرزاق ۸/۴۵۶ (۱۵۸۹۱) طبع المکتب الاسلامی۔ ومسند احمد ۲۳/۴۶ (۱۴۶۹۴) طبع مؤسسة الرسالة ومسند البزار ۱۰/۷۷ (۴۱۴۲) وقال: واسناده حسن
فلیراجع صحیح البخاری ۲/۶۰ (۱۱۹۰).

(۲) سورة النساء، الآیة (۱۰۳).

''بے شک نماز مومنین پر اپنے مقررہ وقتوں میں فرض ہے۔''

اس آیت میں نماز کو وقت کے ساتھ پابند کیا گیا ہے کہ نماز کا وقت گزرنے نہ پائے۔ حدیث(۱) میں فرمایا کہ مغرب میں تعجیل کرو، جتنا جلدی ہو سکے اس کو پڑھ لو، مغرب کی نماز میں تاخیر نہ ہو، لیکن عرفات کے میدان میں آفتاب غروب ہو چکا ہے، مگر حکم یہ دیا جارہا ہے کہ ''ابھی نماز مت پڑھو''۔ حضرت بلال رضی اللہ عنہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو بار بار یاد دلا رہے ہیں:

''اَلصَّلَاۃُ یَارَسُوْلَ اللّٰہِ، اَلصَّلَاۃُ یَارَسُوْلَ اللّٰہ''

جواب میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں:

''اَلصَّلَاۃُ اَمَامَكَ''(۲)

''نماز آگے ہے''، یعنی نماز یہاں نہیں پڑھنی بلکہ آگے میدانِ مزدلفہ میں جا کر پڑھنی ہے۔ اس کے ذریعے یہ سبق دے دیا کہ تم یہ مت سمجھ لینا کہ اس مغرب کے وقت میں کچھ رکھا ہے اور یہ مت سمجھ لینا کہ اس وقت کی تاکید میں کچھ رکھا ہے، بلکہ جو کچھ ہے وہ ہمارے حکم میں ہے، جب ہم نے کہا تھا کہ مغرب کی نماز جلدی پڑھو تو جلدی پڑھنا ضروری تھا اور جب ہم نے کہا کہ مغرب کا وقت گزار دو اور اس کو عشاء کی نماز کے ساتھ ملا کر پڑھو تو اب تمہارے

---

(۱) فی صحیح البخاری ۱/۱۱۶ (۵۵۹) عن رافع بن خدیج یقول کنا نصلی المغرب مع رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فینصرف احدنا وانہ لیبصر مواقع نبلہ. وفیہ ۱/۱۱۷ (۵۶۱) کنا نصلی مع النبی صلی اللہ علیہ وسلم المغرب اذا توارت الحجاب۔ وفی مسند احمد ۲۸/۵۰۳ (۲۳۵۲۱) عن ابی ایوب الانصاری قال سمعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یقول بادروا بصلاۃ المغرب قبل طلوع النجم۔

(۲) صحیح البخاری ۱/۴۰ (۱۳۹) و ۲/۱۶۳ (۱۶۶۷)۔

ذمے اسی طرح پڑھنا فرض ہے۔ اللہ تعالیٰ نے حج کی عبادت میں قدم قدم پر معمول کے قاعدوں کو توڑا ہے، تاکہ ظاہری قیود کو بت نہ بنالیا جائے۔ اس کے ذریعے اس بات کی تربیت دی جارہی ہے کہ کسی چیز کو اپنی ذات میں مقصود نہ سمجھو، نہ نماز اپنی ذات میں مقصود ہے، نہ روزہ اپنی ذات میں مقصود ہے، نہ کوئی اور عبادت اپنی ذات میں مقصود ہے، بلکہ اصل مقصود اللہ جل شانہ کی اطاعت ہے۔

اِفطار میں جلدی کیوں؟

دیکھیے! شریعت کا ایک حکم یہ ہے کہ جب روزہ کے افطار کا وقت آجائے تو افطار میں جلدی کرو اور بلا وجہ اِفطار میں تاخیر کرنا مکروہ ہے۔[۱] تاخیر کرنا اس لیے مکروہ ہے کہ اب تک ہم نے کھانے پینے سے منع کر رکھا تھا، جس کی وجہ سے اب تک بھوکا رہنا باعثِ ثواب تھا، پیاسا رہنا باعثِ ثواب تھا، اس کی بڑی فضیلت تھی، اس پر بڑا اجر تھا اور اس کے بارے میں یہ کہا جارہا تھا کہ یہ روزہ میرے لیے ہے اور میں ہی اس کی جزا دوں گا،[۲] لیکن جب ہم نے کہہ دیا کہ ''کھاؤ'' تو اب کھانے میں تاخیر کرنا گناہ ہے، اس لیے اب اگر تاخیر کرو گے تو اپنی طرف سے روزے کے وقت میں اضافہ کرو گے۔

سحری میں تاخیر افضل کیوں؟

اسی طرح سحری کھانے میں تاخیر کرنا افضل ہے[۳]۔ اگر کوئی وقت سے

---

(۱) صحیح مسلم ۷۷۱/۲ (۱۰۹۸) و سنن ابی داود ۳۰۵/۲ (۲۳۵۳)۔
(۲) صحیح البخاری ۱۴۳/۹ (۷۴۹۲) و ۱۵۷/۹ (۷۵۳۸)۔
(۳) صحیح مسلم ۷۷۱/۲ (۱۰۹۷)۔

پہلے سحری کھا کر سوجائے تو یہ سنت کے خلاف ہے، بلکہ اس وقت سحری کھانی چاہیے جب آخری وقت ہو، اس لیے کہ اگر سحری پہلے سے کھا کر سوگیا تو گویا کہ اس نے روزے کے وقت میں اپنی طرف سے اضافہ کردیا۔ بہرحال! ساری بات کا حاصل یہ ہے کہ ہمارے دلوں میں یہ بات آجائے کہ سارا دین ''اتباع'' میں ہے کہ ان کی اتباع کی جائے۔ ارے تم تو ان کے ''بندے'' ہو اور ''بندے'' کے معنی یہ ہیں کہ جو وہ کہیں وہ کرے۔

''نوکر'' اور ''غلام'' کی تعریف

حضرت مفتی محمد حسن صاحب امرتسری رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ ایک ہوتا ہے ''نوکر''، جو خاص وقت اور خاص ڈیوٹی کا ہوتا ہے۔ مثلاً نوکر کے ذمے جھاڑو دینا ہے یا مثلاً کھانا بنانا ہے، یہ نوکر آٹھ گھنٹے کا ملازم ہے، آٹھ گھنٹے کے بعد اس کی چھٹی۔ دوسرا ہوتا ہے ''غلام'' جس کے لیے نہ کوئی خاص وقت ہے اور نہ خاص کام ہے، وہ تو حکم کا پابند ہے۔ آقا جو حکم دے وہ اس کے کرنے کا پابند ہے۔ مثلاً اگر آقا غلام سے کہہ دے کہ تم یہاں قاضی بن کر بیٹھ جاؤ اور فیصلے کرو تو وہ قاضی بن جائے گا اور اگر اس غلام سے کہہ دے کہ پاخانہ اٹھاؤ تو وہ پاخانہ اٹھائے گا، اس کے لیے نہ کسی وقت کی قید ہے اور نہ کام کی قید ہے وہ تو چوبیس گھنٹے کا غلام ہے، یہ ہے غلام۔

''بندہ'' کی تعریف

لیکن ''غلام'' سے آگے بھی ایک درجہ ہے، وہ ہے ''بندہ''۔ ''غلام'' اپنے آقا کی پرستش نہیں کرتا، لیکن ''بندہ'' اپنے آقا کی عبادت کرتا ہے، اور اس کی

پرستش بھی کرتا ہے اور یہ بندہ اپنی مرضی کا نہیں ہوتا، بلکہ بندہ تو اپنے آقا کی مرضی کا ہوتا ہے، آقا جو حکم دے دے وہ اس کو کرنا پڑتا ہے، اپنی طرف سے کوئی کام تجویز نہیں کرتا۔ تمام ''بدعات'' کی جڑ بھی اسی سے کٹتی ہے، اس لیے کہ اپنی تجویز کو دخل دینے سے بدعات پیدا ہوتی ہیں، اپنی تجویز کو ختم کردو اور ان کی مرضی اور حکم پر چلو تو اسی کا نام ''دین'' ہے۔

خلاصہ

بہرحال! خلاصہ یہ ہے کہ ہر وقت کے تقاضے کو دیکھو کہ اس وقت کا تقاضا کیا ہے؟ اس وقت اللہ تعالیٰ اور اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہم سے کیا چاہ رہے ہیں؟ وہ کرو۔ اسی لیے حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے اس ملفوظ میں فرمایا کہ اذان کا جواب دینا مخل ذکر نہیں، بلکہ اس وقت کا تقاضا یہی ہے کہ ذکر کو روک دو اور اذان کا جواب دو۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو ان باتوں پر عمل کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

وَاٰخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ

○ ○ ○
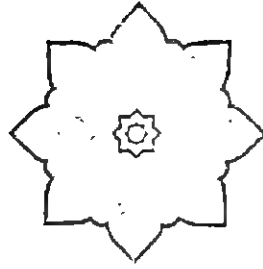
دین کی حقیقت تسلیم و رضا

(اصلاحی خطبات جلد ۱ ص ۲۵)
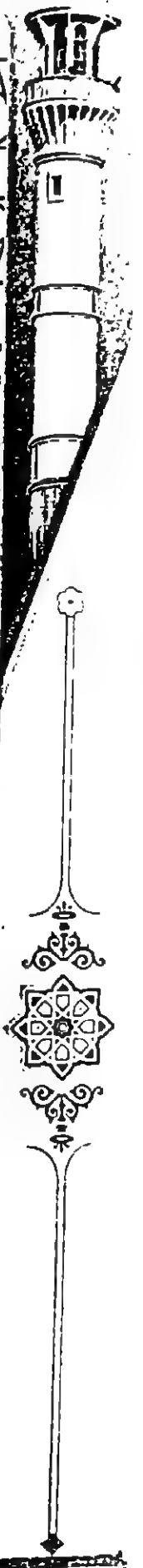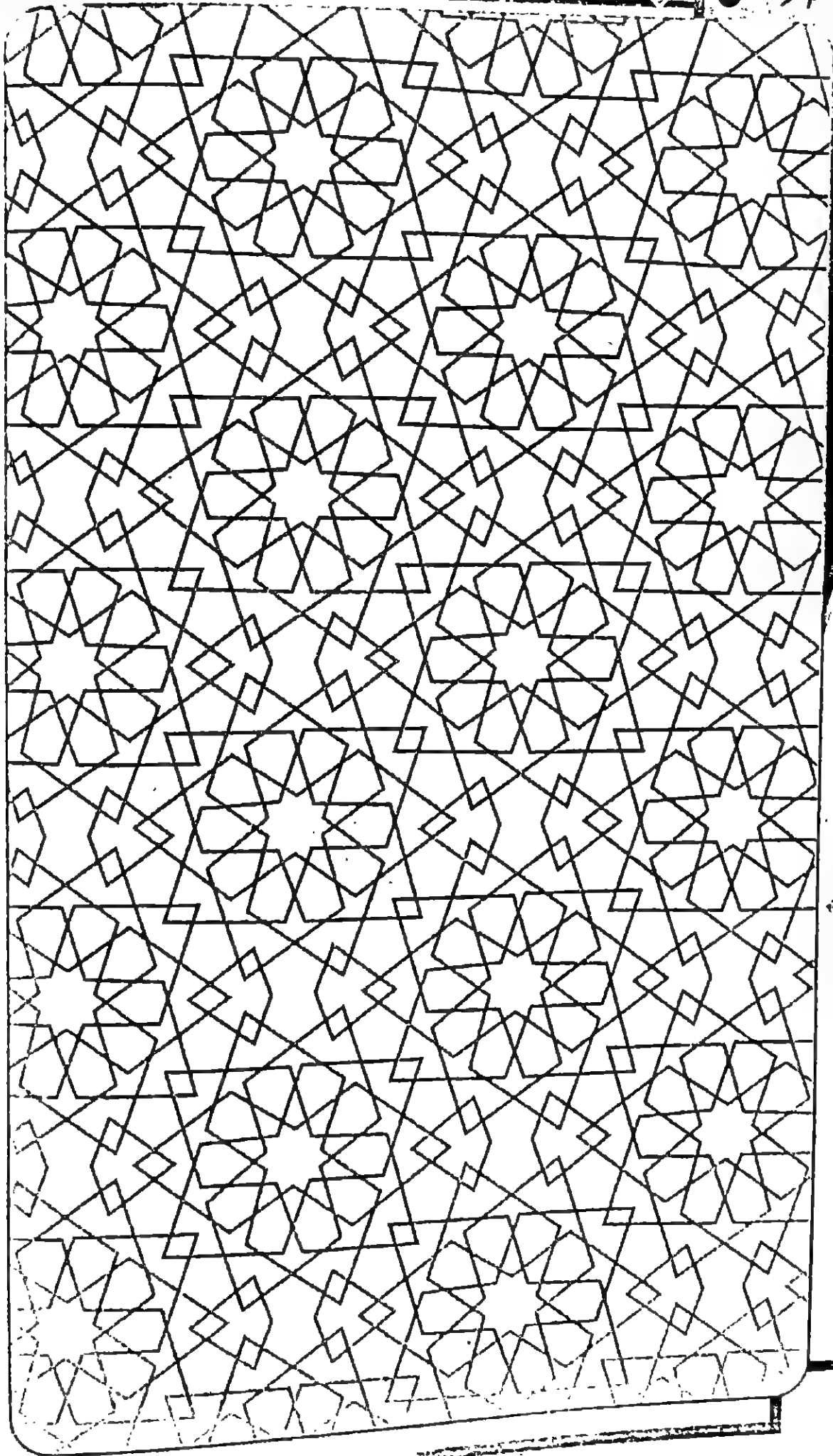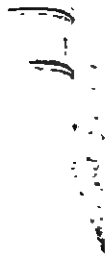
بسم اللہ الرحمن الرحیم

دین کی حقیقت تسلیم و رضا

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَنَسْتَعِيْنُهٗ وَنَسْتَغْفِرُهٗ وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّئَاتِ اَعْمَالِنَا، مَنْ يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهٗ وَمَنْ يُّضْلِلْهُ فَلَا هَادِيَ لَهٗ، وَأَشْهَدُ اَنْ لَّا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ وَأَشْهَدُ اَنَّ سَيِّدَنَا وَنَبِيَّنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ أما بعد!

عن أبی موسی الاشعری رضی الله عنه قال قال رسول الله ﷺ: «اذا مرض العبد أو سافر كتب له مثل ما كان يعمل مقيمًا صحيحاً»(۱)

(۱) صحیح البخاری ٤/٥٧ (٢٩٩٦)۔

بیماری اور سفر میں نیک اعمال لکھے جاتے ہیں

حضرت ابو موسی اشعری رضی اللہ عنہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اجل صحابہ اور فقہاءِ صحابہ میں سے ہیں اور ان حضرات میں سے ہیں جنہوں نے دو مرتبہ ہجرت فرمائی۔ ایک مرتبہ حبشہ کی طرف اور دوسری مرتبہ مدینہ طیبہ کی طرف۔ وہ روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرمایا:

جب کوئی بندہ بیمار ہوتا ہے یا سفر کی حالت میں ہوتا ہے، تو جو عبادات اور نیک اعمال صحت کی حالت میں یا اقامت کی حالت میں کیا کرتا تھا، جب بیماری یا سفر کی وجہ سے وہ چھوٹ جاتے ہیں تو اللہ تعالیٰ وہ سارے اعمال اس کے نامۂ اعمال میں لکھتے رہتے ہیں، باوجود یہ کہ وہ بیماری یا سفر کی وجہ سے وہ اعمال نہیں کر پا رہا ہے، اس لیے کہ اگر وہ تندرست ہوتا یا اپنے گھر میں ہوتا تو یہ اعمال کرتا۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے کتنی بڑی تسلی اور نعمت کی بات بتادی کہ بیماری میں معذوری اور مجبوری کی وجہ سے جب معمولات چھوٹ رہے ہیں تو اس پر بہت صدمہ کرنے کی ضرورت نہیں کہ اگر تندرست ہوتا تو یہ کام کرلیتا، اس لیے کہ اللہ تعالیٰ ان کو لکھ رہے ہیں۔

نماز کسی حالت میں معاف نہیں

لیکن اس کا تعلق صرف نفلی عبادت سے ہے، جو عبادات فرض ہیں، ان میں اللہ تعالیٰ نے جو تخفیف کردی، اس تخفیف کے ساتھ ان کو انجام دینا ہی ہے۔ مثلاً

نماز ہے، انسان کتنا ہی بیمار ہو، بستر مرگ پر ہو اور مرنے کے قریب ہو تب بھی نماز ساقط نہیں ہوتی۔ اللہ تعالیٰ نے یہ آسانی تو فرمادی کہ کھڑے ہو کر نماز پڑھنے کی طاقت نہیں تو بیٹھ کر پڑھ لو۔ بیٹھ کر پڑھنے کی طاقت نہیں تو لیٹ کر پڑھ لو۔ وضو نہیں کر سکتے تو تیمم کرلو، اگر کپڑے پاک رکھنا بالکل ممکن نہیں تو اسی حالت میں پڑھ لو، لیکن نماز کسی حالت میں معاف نہیں۔ جب تک انسان کے دم میں دم ہے۔ ہاں اگر کوئی بے ہوش ہوجائے یا غشی طاری ہوجائے اور اسی حالت میں چھ نمازوں کا وقت گزر جائے تو اس وقت نماز معاف ہوجاتی ہے، لیکن جب تک ہوش میں ہے اور دم میں دم ہے، اس وقت تک نماز معاف نہیں۔

بیماری میں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں

بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ انسان بیمار ہوا اور اب کھڑے ہونے کے بجائے بیٹھ کر نماز پڑھ رہا ہے، بیٹھ کر پڑھنے کی قدرت نہیں تو لیٹ کر پڑھ رہا ہے۔ ایسے موقع پر بہت سے لوگوں کو دیکھا کہ وہ دل تنگ کرتے رہتے ہیں کہ اس حالت میں اب کھڑے ہو کر پڑھنے کا موقع نہیں مل رہا ہے اور بیٹھ کر پڑھنے کا بھی موقع نہیں مل رہا ہے، لیٹے لیٹے نماز پڑھ رہا ہوں، پتہ نہیں کہ وضو بھی ٹھیک ہورہا ہے یا نہیں، تیمم بھی صحیح ہورہا ہے یا نہیں، ان چیزوں میں پریشان رہتے ہیں، حالانکہ سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم تسلی دے رہے ہیں کہ جب تم مجبوری کی وجہ سے ان چیزوں کو چھوڑ رہے ہو۔ تو اللہ تعالیٰ ان کو تمہارے نامۂ اعمال میں لکھ رہے ہیں جو تندرستی کی حالت میں تم کیا کرتے تھے۔

اپنی پسند چھوڑ دو

ایک حدیث میں ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

"ان اللہ یحب أن توتی رخصه کما یحب أن تؤتی عزائمه"(۱)

یعنی جس طرح عزیمت جو اعلیٰ درجے کا کام ہے، اس پر عمل کرنا اللہ تعالیٰ کو پسند ہے، اسی طرح مجبوری کی وجہ سے اگر رخصت پر عمل کریں تو اللہ تعالیٰ اس کو بھی پسند کرتے ہیں، لہٰذا اپنی پسند کی فکر نہ کرو۔ اللہ تعالیٰ کو جو حالت پسند ہے، وہی مطلوب ہے۔

آسانی اختیار کرنا سنت ہے

بعض لوگوں کی طبیعت سخت کوشی کی ہوتی ہے، وہ چاہتے ہیں کہ زیادہ سے زیادہ مشقت کا کام کریں، بلکہ مشقت ڈھونڈتے ہیں اور اس لیے ڈھونڈتے ہیں کہ وہ یہ سمجھتے ہیں کہ اس میں زیادہ ثواب ہے، چونکہ بہت سے بزرگوں سے بھی اس قسم کی باتیں منقول ہیں، لہٰذا ان کی شان میں کوئی گستاخی کا کلمہ نہیں کہنا چاہیے، لیکن سنت کا طریقہ وہ نہیں۔ سنت کا طریقہ یہ ہے جو حدیث میں منقول ہے:

"ما خیر رسول اللہ صلی اللہ علیه وسلم بین أمرین

(۱) مسند احمد ۱۰/۱۰۷ (۵۸۶٦) وذکره الهیثمی فی "مجمع الزوائد" ۳/۳۸۲ (٤۹۳۹) -طبع دار الفکر- وقال: رواه احمد، ورجاله رجال الصحیح، والبزار والطبرانی فی "الاوسط"، واسناده حسن۔

جب حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو دو چیزوں کے درمیان اختیار دیا جاتا تو آپ ان میں سے آسان تر کو اختیار فرماتے۔ اب سوال یہ ہے کہ کیا حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا آسانی اختیار کرنا۔ معاذ اللہ۔ تن آسانی کے لیے تھا؟ اور کیا مشقت اور تکلیف سے بچنے کے لیے یا دنیاوی راحت اور آرام حاصل کرنے کے لیے آسان راستہ اختیار فرماتے تھے؟ ایسا نہیں ہے، بلکہ اس کی وجہ وہی ہے کہ آسان راستہ اختیار کرنے میں عبدیت زیادہ ہے، اللہ تعالیٰ کے سامنے بہادری نہیں ہے، بلکہ شکستگی ہے، میں تو عاجز بندہ ہوں، ناکارہ ہوں، میں تو آسان راستہ اختیار کرتا ہوں۔ یہ بندگی کا اظہار ہے۔ اور اگر مشکل راستہ اختیار کیا تو اس کے معنی یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے سامنے بہادری جتاتا ہے۔

دین اتباع کا نام ہے

دین کی ساری بنیاد یہ ہے کہ کسی خاص عمل کا نام دین نہیں، کسی خاص شوق کا نام دین نہیں، اپنے معمولات پورے کرنے کا نام دین نہیں، اپنی عادت پوری کرنے کا نام دین نہیں، دین نام ہے، ان کی اتباع کا۔ وہ جیسا کہیں ویسا کرنے کا نام دین ہے۔ ان کو جو چیز پسند ہے، اس کو اختیار کرنے کا نام دین ہے۔ اور اپنے آپ کو ان کے حوالے کر دینے کا نام دین ہے۔ وہ جیسا کرا رہے ہیں، وہی بہتر ہے۔ یہ جو صدمہ اور حسرت ہوتی رہتی ہے کہ ہم تو بیمار ہو گئے، اس واسطے کھڑے ہو کر نماز نہیں پڑھی جا رہی ہے، لیٹ کر پڑھ رہے ہیں، یہ صدمہ کرنے کی بات نہیں۔ ارے اللہ تعالیٰ کو یہی پسند ہے اور جب یہی پسند ہے تو اس وقت

(۱) صحیح البخاری ۱۸۹/٤ (۳۵٦۰)۔

سُبۡحٰنَ الَّذِیۡۤ اَسۡرٰی بِعَبۡدِہٖ (۱)

وہ ذات پاک ہے جو اپنے بندے کو لے گئی۔

یہاں ''شاہد''، ''مبشر'' اور ''سراجِ منیر'' کے الفاظ نہیں لائے، بلکہ صرف ایک لفظ ''عبد'' لائے۔ یہ بتلانے کے لیے کہ انسان کا سب سے اُونچا مقام عبدیت کا مقام ہے۔ اللہ تعالیٰ کے سامنے اپنی بندگی، شکستگی اور عاجزی کا مقام ہے۔

توڑنا ہے حسن کا پندار کیا؟

ہمارے بڑے بھائی تھے محمد ذکی کیفی مرحوم۔ اللہ تعالیٰ ان کے درجات بلند فرمائے۔ شعر بہت اچھا کہا کرتے تے۔ انہوں نے ایک بہت اچھا شعر کہا ہے۔ لوگ اس کا صحیح مطلب نہیں سمجھتے۔ اسی بات کو انہوں نے بڑے خوبصورت پیرائے میں کہا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ ؂

اس قدر بھی ضبطِ غم اچھا نہیں
توڑنا ہے حسن کا پندار کیا؟

یہ جو غم کو اتنا ضبط کر رہے ہو کہ منہ سے آہ بھی نہ نکلے، کراہ بھی نہ نکلے، تو کیا تم اس کے پندار کو توڑنا چاہتے ہو جو تمہیں اس غم میں مبتلا کر رہا ہے؟ اس کا پندار توڑنا مقصود ہے؟ اس کے آگے بہادری دکھانا چاہتے ہو؟ یہ بندے کا کام نہیں۔ بندے کا کام تو یہ ہے کہ جب اس نے ایک تکلیف دی تو اس تکلیف کا تقاضا یہ ہے کہ اس تکلیف کے ازالے کے لیے اس کو پکارا جائے۔ اگر اس نے غم دیا ہے تو اس غم کا اظہار شرعی حدود میں رہ کر کیا جائے، جیسا کہ حضور اکرم

(۱) سورۃ الاسراء الآیۃ (۱)۔

سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے کیا کہ جب بچے کا انتقال ہو گیا، تو فرمایا:

"انا بفراقك یا ابراهیم لمحزونون"(۱)

اے ابراہیم! ہم تمہاری جدائی پر بڑے غمگین ہیں۔

بات یہ ہے کہ جس حالت میں اللہ تعالیٰ رکھتے ہیں وہی حالت پسندیدہ ہے۔ جب وہ چاہ رہے ہیں کہ لیٹ کر نماز پڑھو تو پھر لیٹ کر ہی نماز پڑھو۔ اس وقت لیٹ کر پڑھنے ہی میں وہ ثواب اور اجر ہے جو عام حالت میں کھڑے ہو کر پڑھنے میں ہے۔

رمضان کا دن لوٹ آئے گا

ہمارے حضرت ڈاکٹر محمد عبد الحیٔ صاحب رحمۃ اللہ علیہ، حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کی بات نقل فرماتے تھے کہ ایک شخص رمضان میں بیمار ہو گیا اور بیماری کی وجہ سے روزہ چھوڑ دیا، اب اس کو غم ہو رہا ہے کہ رمضان کا روزہ چھوٹ گیا۔ حضرت رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ غم کرنے کی کوئی بات نہیں، یہ دیکھو کہ تم روزہ کس کے لیے رکھ رہے ہو؟ اگر یہ روزہ اپنی ذات کے لیے رکھ رہے ہو، اپنی خوشی کے لیے اور اپنا شوق پورا کرنے کے لیے رکھ رہے ہو تو بے شک اس پر صدمہ کرو کہ بیماری آگئی اور روزہ چھوٹ گیا، لیکن اگر اللہ تبارک وتعالیٰ کے لیے روزہ رکھ رہے ہو اور اللہ تعالیٰ نے فرما دیا کہ بیماری میں روزہ چھوڑ دو، تو پھر بھی مقصود حاصل ہے۔ اس لیے کہ حدیث شریف میں ہے:

---

(۱) صحیح البخاری ۸۳/۲ (۱۳۰۳)۔

"لیس من البر الصوم فی السفر"(۱)

سفر کی حالت میں جب کہ شدید مشقت ہو، اس وقت روزہ رکھنا کوئی نیکی کا کام نہیں، لیکن قضا کرنے کے بعد عام دنوں میں روزہ رکھو گے تو اس میں وہ تمام انوار و برکات حاصل ہوں گے جو رمضان کے مہینے میں حاصل ہوتے تھے۔ گویا کہ اس شخص کے حق میں رمضان کا دن لوٹ آئے گا اور رمضان کے دن روزہ رکھنے میں جو فائدہ حاصل ہوتا، وہ فائدہ اس دن قضا کرنے میں حاصل ہوجائے گا، لہٰذا اگر شرعی عذر کی وجہ سے روزے قضا ہورہے ہیں، مثلاً بیماری ہے، سفر ہے یا خواتین کی طبعی مجبوری ہے، اس کی وجہ سے روزے قضا ہورہے ہیں تو غمگین ہونے کی کوئی بات نہیں۔ اس وقت میں روزہ چھوڑ دینا اور کھانا پینا ہی اللہ تعالیٰ کو پسند ہے اور لوگوں کو روزہ رکھ کر جو ثواب مل رہا ہے، تمہیں روزہ نہ رکھ کر وہی ثواب مل رہا ہے اور عام لوگوں کو بھوکا رہ کر جو ثواب مل رہا ہے، تمہیں کھانا کھا کر مل رہا ہے اور اللہ تعالیٰ وہی انوار و برکات عطا فرمارہے ہیں، جو عام روزہ داروں کو عطا فرمارہے ہیں۔ اور پھر جب بعد میں اس روزے کی قضا کرو گے تو قضا کے دن رمضان کی ساری برکتیں اور سارے انوار حاصل ہوں گے۔ گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔

اللہ تعالیٰ ٹوٹے ہوئے دل میں رہتے ہیں

اور اللہ تعالیٰ ٹوٹے ہوئے دلوں کے ساتھ ہوتے ہیں۔ بیماری کے اندر جو صدمہ ہورہا ہے کہ روزہ چھوٹ گیا، اس صدمے سے دل ٹوٹا، دل شکستہ ہوا۔ دل

(۱) صحیح البخاری ۲/۳٤(۱۹٤٦)۔

کی اس شکستگی کے بعد اللہ تعالیٰ اس کو نواز دیتے ہیں، چاہے صدموں سے دل ٹوٹے یا غموں سے ٹوٹے یا افکار سے ٹوٹے یا خوفِ خدا سے ٹوٹے یا فکرِ آخرت سے۔ کسی بھی طرح ہو، بس جب دل ٹوٹتا ہے تو اللہ تبارک وتعالیٰ کی رحمتوں کا مورد بن جاتا ہے۔ ایک روایت میں ہے کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

"أنا عند المنكسرة قلوبهم من أجلي"(۱)

میں ان لوگوں کے پاس ہوں جن کے دل میری وجہ سے ٹوٹے ہوں۔

دل پر یہ چوٹیں جو پڑتی رہتی ہیں، اس طرح کہ کبھی کوئی تکلیف آگئی، کوئی صدمہ آگیا، کبھی کوئی پریشانی آگئی، یہ دل کو توڑا جارہا ہے، کیوں توڑا جارہا ہے اسکو؟ اس لیے توڑا جارہا ہے کہ اسے اپنی رحمتوں اور اپنے فضل وکرم کا مورد بنایا جارہا ہے ؎

تو بچا بچا کے نہ رکھ اسے ترا آئنہ ہے وہ آئنہ
کہ شکستہ ہو تو عزیز تر ہے نگاہِ آئنہ ساز میں

یہ دل جتنا ٹوٹے گا، اتنا ہی آئینہ ساز یعنی اللہ تعالیٰ کی نگاہ میں عزیز ہوگا۔ ہمارے حضرت ڈاکٹر محمد عبدالحیٔ صاحب قدس اللہ سرہ ایک شعر سنایا کرتے تھے، فرماتے تھے کہ جب اللہ تعالیٰ کسی بندے کے دل کو توڑتے ہیں تو اس کے

---

(۱) وفی حلیة الاولیاء لابی نعیم ۳٦٤/۲ قال موسی علیه السلام: یا رب این ابغیك؟ قال: ابغنی عند المنكسرة قلوبهم. وفی ۳۱/٤ قال داود علیه السلام: "إلهی این اجدك إذا طلبتك"؟ قال: "عند المنكسره قلوبهم من مخافتی". وزادفی ۱۱۷/٦ من روایة موسی علیه السلام: "فانی ادنو منهم كل یوم باعا لولا ذلك لتهدموا".

ذریعے اس کو بلندیوں تک پہنچانا مقصود ہوتا ہے۔ یہ صدمے، یہ افکار، یہ غم جو انسان کو آتے ہیں یہ مجاہداتِ اضطراری ہوتے ہیں، جس سے انسان کے درجات میں اتنی ترقی ہوتی ہے کہ عام حالات میں اتنی ترقی نہیں۔ چنانچہ اکثر یہ شعر سناتے ؎

یہ کہہ کے کوزہ گر نے پیالہ پٹخ دیا
اب اور کچھ بنائیں اس کو بگاڑ کے

جب یہ دل ٹوٹ کر بکھرتا ہے تو پھر وہ اللہ تبارک وتعالیٰ کی تجلیات اور اس کی رحمتوں کا مورد بنتا ہے۔ ایک غزل کا شعر حضرت والا سنایا کرتے تھے۔ فرماتے تھے ؎

بتانِ ماہ وش اُجڑی ہوئی منزل میں رہتے ہیں
جسے برباد کرتے ہیں اسی کے دل میں رہتے ہیں

اللہ تعالیٰ ٹوٹے ہوئے دل میں تجلی فرماتے ہیں۔ اس لیے ان غموں اور صدموں سے ڈرو نہیں، یہ آنسو جو گر رہے ہیں، یہ دل جو ٹوٹ رہا ہے، یہ آہیں جو نکل رہی ہیں، اگر اللہ جل جلالہ پر ایمان ہے، اگر اللہ تعالیٰ کی تصدیق دل میں ہے تو یہ سب چیزیں تمہیں کہیں سے کہیں سے پہنچا رہی ہیں ؎

وادیٔ عشق بسے دور و دراز است ولے
طے شود جادۂ صد سالہ بہ آہے گاہے

وادیٔ عشق کا راستہ بڑا لمبا چوڑا راستہ ہے، لیکن بعض اوقات سو سال کا فاصلہ ایک آن میں طے ہو جاتا ہے۔ اس لیے ان صدموں اور غموں اور پریشانیوں سے نہیں گھبرانا چاہیے۔

دین تسلیم و رضا کے سوا کچھ نہیں

اللہ تعالیٰ ہمارے دلوں میں یہ بات اُتار دے کہ دین اپنا شوق پورا کرنے کا نام نہیں، اپنی عادت پوری کرنے کا نام دین نہیں۔ دین اس کا نام ہے کہ جس وقت جو کام کرنے کو کہا جارہا ہے وہ کریں۔ نہ کسی عمل میں کچھ رکھا ہے نہ نماز میں کچھ رکھا ہے، نہ روزے میں کچھ رکھا ہے۔ کسی عمل میں کچھ نہیں رکھا، جو کچھ ہے وہ ان کی رضا میں ہے ؎

عشق تسلیم و رضا کے ماسوا کچھ بھی نہیں
وہ وفا سے خوش نہ ہوں تو پھر وفا کچھ بھی نہیں

اللہ تبارک وتعالیٰ جس کام سے خوش ہوں، وہی کام کرنے کا ہے، اس کام میں مزہ ہے ؎

نہ تو ہے ہجر ہی اچھا نہ وصال اچھا ہے
یار جس حال میں رکھے وہی حال اچھا ہے

اللہ تعالیٰ اپنی رحمت سے یہ بات ہمارے دلوں میں پیوست فرمادے تو دین کو سمجھنے کے راستے کھل جائیں۔

تیمارداری میں معمولات کا چھوٹنا

اور یہ جو بتایا کہ بیماری کی حالت میں اگر معمولات چھوٹ جائیں تو اس پر وہی کچھ لکھا جارہا ہے، جو صحت کی حالت میں کرنے سے ملتا۔ علمائے کرام نے فرمایا کہ اس میں جس طرح اپنی بیماری داخل ہے، ان لوگوں کی بیماری بھی داخل ہے جن کی تیمار داری اور خدمت انسان کے فرائض میں شامل ہے۔ کسی کے

والدین بیمار ہو گئے، اب دن رات ان کی خدمت میں لگا ہوا ہے، ان کی خدمت میں لگے رہنے کی وجہ سے معمولات چھوٹ گئے۔ اب نہ تلاوت ہو رہی ہے، نہ نوافل ہو رہے ہیں، نہ ذکر ہے، نہ تسبیح۔ سب کچھ چھوٹا جارہا ہے اور دن رات ماں باپ کی خدمت میں لگا ہوا ہے۔ اس کا بھی یہی حکم ہے۔ اگر چہ خود بیمار نہیں ہے، لیکن پھر بھی جو اعمال چھوٹ رہے ہیں، وہ اعمال اللہ تعالیٰ کے یہاں لکھ جارہے ہیں۔ کیوں؟

وقت کا تقاضا دیکھو

اس لیے ہمارے حضرت ڈاکٹر محمد عبد الحئی قدس اللہ سرہ بڑے کام کی بات فرمایا کرتے تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ بزرگوں کی چھوٹی چھوٹی باتوں سے انسان کی زندگی درست کرنے کے دروازے کھل جاتے ہیں۔ فرماتے تھے: میاں! ہر وقت کا تقاضا دیکھو، اس وقت کا تقاضا کیا ہے؟ اس وقت مجھ سے مطالبہ کیا ہے؟ یہ نہ سوچو کہ اس وقت میرا کس کام کو دل چاہ رہا ہے۔ دل چاہنے کی بات نہیں۔ بلکہ یہ دیکھو اس وقت تقاضا کس کام کا ہے؟ اس تقاضے کو پورا کرو۔ یہ اللہ تبارک وتعالیٰ کی مرضی ہے۔ تم نے تو اپنے ذہن میں بٹھا رکھا تھا کہ روزانہ تہجد پڑھا کروں گا، روزانہ اتنے پارے تلاوت کیا کروں گا، روزانہ اتنی تسبیحات پڑھا کروں گا، اب جب ان کاموں کا وقت آیا تو دل چاہ رہا ہے کہ یہ کام میں پورے کروں اور ذہن پر اس کام کا بوجھ ہے، اب عین وقت پر گھر بیماری ہوگئی اور اس کے نتیجے میں اس کی تیمارداری، علاج اور دوا دارو میں لگنا پڑا۔ اور اس میں لگنے کی وجہ سے وہ معمول چھوٹنے لگا۔ اس وقت دل بڑا کڑھتا ہے کہ کیا ہوگیا۔ میرا تو آج کا معمول قضا ہوجائے گا۔ اس وقت تو میں بیٹھ کر تلاوت کرتا، ذکر و

اذکار کرتا، اب مارا مارا پھر رہا ہوں کہ کبھی ڈاکٹر کے پاس، کبھی حکیم کے پاس، کبھی دواخانے، یہ میں کس چکر میں پھنس گیا؟ ارے! اللہ تعالیٰ نے جس چکر میں ڈالا، اس وقت کا تقاضا یہ ہے کہ وہ کرو، اگر اس وقت وہ کام چھوڑ کر تلاوت کرنے بیٹھ جاؤ گے تو وہ اللہ تعالیٰ کو پسند نہیں۔ اب وقت کا تقاضا یہ ہے کہ یہ کام کرو۔ اب اسی میں وہ ثواب ملے گا، جو تلاوت کرنے میں ملتا۔ اسی میں وہ ثواب ملے گا جو تسبیحات میں ملتا۔ یہ ہے اصل دین۔

اپنا شوق پورا کرنے کا نام دین نہیں

ہمارے حضرت مولانا مسیح اللہ خان صاحب رحمۃ اللہ علیہ۔ اللہ تعالیٰ ان کے درجات بلند فرمائے۔ آمین۔ ان حضرات میں سے تھے جن کے قلب پر اللہ تعالیٰ کانٹے کی بات القا فرماتے تھے۔ وہ فرمایا کرتے تھے کہ ''بھائی! اپنا شوق پورا کرنے کا نام دین نہیں، اللہ اور اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اتباع کا نام دین ہے۔'' اس کا نام دین نہیں کہ فلاں کام کا شوق ہوگیا، لہٰذا اب تو وہی کام کریں گے، مثلاً علمِ دین پڑھنے اور عالم بننے کا شوق ہوگیا، اس سے قطع نظر کہ تمہارے لیے عالم بننا جائز بھی ہے یا نہیں؟ گھر میں ماں بیمار پڑی ہے، باپ بیمار پڑا ہے اور گھر میں دوسرا کوئی تیمارداری کرنے والا اور ان کی دیکھ بھال کرنے والا موجود نہیں، لیکن آپ کو شوق ہوگیا کہ عالم بنیں گے، چنانچہ ماں باپ کو بیمار چھوڑ کر مدرسے میں پڑھنے چلے گئے۔ یہ دین کا کام نہیں ہے، اپنا شوق پورا کرنا ہے۔ دین کا کام تو یہ ہے کہ یہ سب کچھ چھوڑ کر ماں کی خدمت کرو۔ باپ کی خدمت کرو۔

مفتی بننے کا شوق

یا مثلاً تخصص پڑھنے اور مفتی صاحب بننے کا شوق ہوگیا۔ بہت سے طلبہ مجھ سے کہتے ہیں کہ ہمیں تخصص پڑھنے کا بڑا شوق ہے اور ہم فتویٰ نویسی سیکھنا چاہتے ہیں۔ ان سے پوچھا کہ آپ کے والدین کی کیا منشا ہے؟ جواب دیا کہ والدین تو راضی نہیں ہیں۔ اب دیکھئے کہ والدین تو راضی نہیں ہیں اور یہ مفتی صاحب بننا چاہتے ہیں۔ یہ دین نہیں، یہ اپنا شوق پورا کرنا ہے۔

تبلیغ کرنے کا شوق

یا مثلاً! تبلیغ کرنے اور چلّے میں جانے کا شوق ہوگیا۔ ویسے تو تبلیغ کرنا بڑی فضیلت اور ثواب کا کام ہے، لیکن گھر میں بیوی بیمار پڑی ہے، کوئی دیکھ بھال کرنے والا نہیں ہے اور آپ کو چلہ لگانے کا شوق ہوگیا۔ یہ دین نہیں ہے، یہ اپنا شوق پورا کرنا ہے۔ اب اس وقت دین کا تقاضا اور وقت کا تقاضا یہ ہے کہ اس بیمار کی تیارداری کرو اور اس کا خیال کرو اور اس کا علاج کرو، یہ دنیا نہیں ہے۔ یہ بھی دین ہے۔

مسجد میں جانے کا شوق

حضرت مولانا مسیح اللہ خان صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے ایک مرتبہ مجلس میں اس پر ایک یہ مثال دی کہ ایک شخص جنگل اور ویرانے میں اپنی بیوی کے ساتھ رہتا ہے۔ اور آس پاس کوئی آبادی بھی نہیں۔ بس میاں بیوی دونوں اکیلے رہتے ہیں۔ اب میاں صاحب کو آبادی کی مسجد میں جا کر جماعت کے ساتھ نماز پڑھنے

کا شوق ہو گیا، اب بیوی کہتی ہے کہ یہ تو جنگل اور ویرانہ ہے، اگر تم نماز پڑھنے آبادی کی مسجد میں چلے گئے تو مجھے اس ویرانے میں ڈر لگے گا۔ اور ڈر کے مارے میری جان نکل جائے گی، اس لیے بجائے مسجد کے آج تم یہیں نماز پڑھ لو۔ حضرت والا فرماتے ہیں کہ وہ میاں صاحب تو تھے شوقین، چنانچہ شوق میں آ کر اپنی بیوی کو وہیں جنگل میں اکیلا چھوڑ چھاڑ کر چلے گئے۔ فرمایا کہ یہ شوق پورا کرنا ہے۔ یہ دین نہیں ہے۔ اس لیے کہ اس وقت کا تقاضا یہ تھا کہ وہ گھر میں نماز پڑھتا۔ اور اپنی بیوی کی یہ پریشانی دور کرتا۔

یہ اس وقت ہے جہاں بالکل ویرانہ ہے، کوئی آبادی نہیں ہے، البتہ جہاں آبادی ہو تو وہاں مسجد میں جا کر نماز پڑھنی چاہئے۔

لہٰذا اپنا شوق پورا کرنے کا نام دین نہیں۔ کسی کو جہاد میں جانے کا شوق، کسی کو تبلیغ میں جانے کا شوق، کسی کو مولوی بننے کا شوق، کسی کو مفتی بننے کا شوق۔ اور اس شوق کو پورا کرنے کے نتیجے میں ان حقوق کا کوئی خیال نہیں جو اس پر عائد ہو رہے ہیں۔ اس بات کا کوئی خیال نہیں کہ اس وقت میں ان حقوق کا تقاضا کیا ہے؟

یہ جو کہا جاتا ہے کہ کسی شیخ سے تعلق قائم کرو، یہ درحقیقت اسی لیے ہے۔ وہ بتاتا ہے کہ اس وقت کا کیا تقاضا ہے؟ اس وقت تمہیں کون سا کام کرنا چاہیے؟ اب یہ باتیں جو اس وقت کہہ رہا ہوں، اسے کوئی آگے اس طرح نقل کر دے گا کہ وہ مولانا صاحب تو یہ کہہ رہے تھے کہ مفتی بننا بری بات ہے۔ یا تبلیغ کرنا بری بات ہے۔ وہ صاحب تو تبلیغ کے مخالف ہیں، کہ تبلیغ میں اور چلے میں نہیں جانا چاہیے یا جہاد میں نہیں جانا چاہیے۔ ارے بھائی! یہ سب کام اپنے اپنے وقت پر اللہ تعالیٰ کی رضا کے کام ہیں۔ یہ دیکھو کہ کس وقت کا کیا تقاضا ہے؟ تم سے کس وقت کیا

مطالبہ ہورہا ہے؟ اس مطالبے اور تقاضے پر عمل کرو۔ اپنے دل و دماغ سے ایک راستہ متعین کرلیا اور اس پر چل کھڑے ہوئے، یہ دین نہیں ہے۔ دین یہ ہے کہ یہ دیکھو کہ وہ کیا کہہ رہے ہیں۔ وہ اس وقت کس بات کا حکم دے رہے ہیں؟

سہاگن وہی جسے پیا چاہے

میرے والدِ ماجد حضرت مفتی شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ ہندی زبان کی مثل بہت کثرت سے سنا کرتے تھے۔ فرماتے کہ

سہاگن وہی جسے پیا چاہے

قصہ یوں ہے کہ ایک لڑکی کو دلہن بنایا جارہا تھا۔ اور اس کا سنگھار پٹار کیا جارہا تھا، اب جو کوئی آتا اس کی تعریف کرتا کہ تو بڑی خوب صورت لگ رہی ہے۔ تیرا چہرہ اتنا خوب صورت ہے، تیرا جسم اتنا خوب صورت ہے، تیرا زیور اتنا خوب صورت ہے۔ اس کی ایک ایک چیز کی تعریف کی جارہی تھی، لیکن وہ لڑکی ہر ایک کی تعریف سنتی، لیکن خاموش رہتی۔ اور سنی اَن سنی کردیتی۔ کسی خوشی کا اظہار نہ کرتی۔ لوگوں نے اس سے کہا کہ یہ تیری سہیلیاں تیری اتنی تعریفیں کررہی ہیں، تجھے اس سے کوئی خوشی نہیں ہورہی ہے؟ اس لڑکی نے جواب دیا کہ ان کی تعریف سے کیا خوشی ہو؟ اس لیے یہ جو کچھ تعریفیں کریں گی وہ ہوا میں اُڑ جائیں گی، بات جب ہے کہ جس کے لیے مجھے سنوارا جارہا ہے وہ تعریف کرے۔ وہ پسند کرے، کہہ دے کہ ہاں! تو اچھی لگ رہی ہے، تب تو فائدہ ہے۔ اور اس کے نتیجے میں میری زندگی سنور جائے گی، لیکن اگر یہ عورتیں تعریف کرکے چلی گئیں اور جس کے لیے مجھے سنوارا گیا تھا، اس نے ناپسند کردیا تو پھر اس دلہن بننے اور اس سنگھار پٹار کا کیا فائدہ؟

یہ بندہ دو عالم سے خفا میرے لیے ہے

یہ قصہ سنانے کے بعد حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ یہ دیکھو کہ جو کام تم کر رہے ہو، جس کے لیے کر رہے ہو، اس کو پسند ہے یا نہیں؟ لوگوں نے تو تعریف کردی کہ بڑے مفتی صاحب ہیں، بڑے عالم اور بڑے مولانا صاحب ہیں۔ لوگوں نے تعریف کردی کہ تبلیغ میں بہت وقت لگا ہے اور اللہ کے راستے میں نکلتا ہے۔ کسی کے بارے میں کہہ دیا کہ یہ مجاہدِ اعظم ہے۔ ارے! ان لوگوں کے کہنے سے کیا حاصل؟ جس کے لیے کر رہے ہو وہ یہ کہہ دے کہ ؎

توحید تو یہ ہے کہ خدا حشر میں کہہ دے
یہ بندہ دو عالم سے خفا میرے لیے ہے

اس وقت فائدہ ہے۔ لہٰذا جب ہر کام کا مقصد ان کو راضی کرنا ہے تو پھر ہر وقت انسان کو یہ فکر رہنی چاہیے کہ اس وقت مجھ سے کیا مطالبہ ہو رہا ہے؟

اذان کے وقت ذکر چھوڑ دو

اچھے خاصے ذکر اللہ میں مشغول تھے، لیکن جیسے ہی اذان کی آواز کان میں پڑی، حکم آ گیا کہ ذکر چھوڑ دو اور خاموش ہو کر مؤذن کی آواز سنو اور اس کا جواب دو۔ اگرچہ وقت ضائع ہو رہا ہے، اذان کے وقت اگر ذکر کرتے رہتے تو کئی تسبیحات اور پڑھ لیتے، مگر ذکر سے روک دیا گیا۔ جب روک دیا تو اب رک جاؤ، اب ذکر کرنے میں فائدہ نہیں۔ اب اذان سننے اور اس کا جواب دینے میں فائدہ ہے۔

جو کچھ ہے وہ ہمارے حکم میں ہے

اللہ تبارک وتعالیٰ نے حج بڑی عجیب وغریب عبادت بنائی ہے، اگر آپ حج کی عاشقانہ عبادت کو شروع سے آخر تک دیکھیں تو یہ نظر آئے گا کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے قدم قدم پر قاعدوں کے بت توڑے ہیں۔ اب دیکھیں کہ مسجدِ حرام میں ایک نماز کا ثواب ایک لاکھ نمازوں کے برابر ہے[1] لیکن آٹھ ذی الحجہ کو یہ حکم دیا جاتا ہے کہ مسجدِ حرام چھوڑو اور منیٰ میں جاکر پڑاؤ ڈالو۔ وہاں نہ حرم، نہ کعبہ اور نہ وہاں کوئی کام، نہ وقوف ہے، نہ رمی جمرات ہے، بس یہ حکم دے دیا کہ ایک لاکھ نمازوں کا ثواب چھوڑو اور منیٰ کے جنگل میں جاکر پانچ نمازیں ادا کرو، یہ سب کیوں ہے؟ اس لیے کہ یہ بتانا مقصود ہے کہ نہ اس کعبہ میں کچھ رکھا ہے اور نہ حرم میں کچھ رکھا ہے۔ نہ مسجدِ حرام میں کچھ رکھا ہے۔ جو کچھ ہے وہ ہمارے حکم میں ہے۔ جب ہم نے کہہ دیا کہ مسجدِ حرام میں جاکر نماز پڑھو، تو اب ایک لاکھ نمازوں کا ثواب ملے گا اور جب ہم نے کہہ دیا کہ مسجدِ حرام کو چھوڑ دو۔ اب اگر کوئی شخص مسجدِ حرام میں نماز پڑھے گا تو ایک لاکھ نمازوں کا ثواب تو کیا ملے گا، بلکہ الٹا گناہ ہوگا۔ اس لیے کہ اس نے ہمارے حکم کو توڑ دیا۔

نماز اپنی ذات میں مقصود نہیں

قرآن وسنت میں نماز پڑھنے کی بہت تاکید وارد ہے۔ فرمایا:

اِنَّ الصَّلٰوةَ كَانَتْ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ كِتٰبًا مَّوْقُوْتًا[2]

---

(۱) مسند البزار ۱۰/۷۷ (۴۱۴۲) وقال واسناده حسن۔ فليراجع صحيح البخاری ۲/۶۰ (۱۱۹۰)۔

(۲) سورة النساء الاية (۱۰۳)۔

نماز کو وقت کے ساتھ پابند کیا گیا ہے، وقت گزرنے سے پہلے نماز پڑھ لو، مغرب کی نماز کے بارے میں حکم دیا گیا کہ تعجیل کرو۔ (۱) جتنی جلدی ہوسکے پڑھ لو تاخیر نہ ہو، لیکن عرفات کے میدان میں مغرب کی نماز جلدی پڑھو گے تو نماز ہی نہ ہوگی۔ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مغرب کے وقت عرفات کے میدان سے نکل رہے ہیں، حضرت بلال بار بار فرما رہے ہیں کہ "الصلاة یا رسول الله، الصلاة یا رسول الله" اور حضور اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرما رہے ہیں کہ "الصلاة أمامك" (نماز تمہارے آگے ہے)۔ (۲)

سبق یہ دیا جارہا ہے کہ یہ مت سمجھ لینا کہ اس مغرب کے وقت میں کچھ رکھا ہے۔ ارے بھائی! جو کچھ ہے وہ ہمارے حکم میں ہے۔ جب ہم نے کہا کہ جلدی پڑھو تو جلدی پڑھنا باعثِ ثواب تھا۔ اور جب ہم نے کہا کہ مغرب کا یہ وقت گزار دو، اور مغرب کی نماز عشاء کی نماز کے ساتھ ملا کر پڑھو، تو اب تمہارے ذمے وہی فرض ہے۔ حج میں قدم قدم پر اللہ تبارک وتعالیٰ نے قاعدوں کے بت توڑے ہیں، عصر کی نماز میں تقدیم کرادی اور مغرب میں تاخیر کرادی۔ ہر کام اُلٹا کرایا جارہا ہے۔ اور تربیت اس بات کی دی جارہی ہے کہ کسی چیز کو اپنی ذات میں مقصود نہ سمجھنا۔ نماز اپنی ذات میں مقصود ہے، نہ روزہ اپنی ذات میں مقصود ہے، نہ کوئی اور عبادت اپنی ذات میں مقصود ہے۔ مقصود اللہ جل جلالہ کی اطاعت ہے۔

افطار میں جلدی کیوں؟

یہ جو حکم دیا جارہا ہے کہ افطار میں جلدی کرو اور بلاوجہ افطار میں تاخیر مکروہ

---

(۱) صحیح البخاری ۱۱۶/۱ (۵۵۹) و ۱۱۷/۱ (۵۶۱)۔

(۲) صحیح البخاری ۴۰/۱ (۱۳۹)۔

ہے۔[1] کیوں؟ اس لیے کہ اب تک تو بھوکا رہنا اور نہ کھانا باعثِ ثواب تھا۔ پیاسا رہنا باعثِ ثواب تھا، اس کی بڑی فضیلت اور بڑا اجر وثواب تھا، لیکن جب ہم نے کہہ دیا کہ کھاؤ، اب کھانے میں تاخیر کرنا گناہ ہے، اس لیے کہ اب اگر کھانے میں تاخیر کروگے تو اپنی طرف سے روزے میں اضافہ کرنا لازم آئے گا۔

سحری میں تاخیر کیوں؟

سحری میں تاخیر افضل ہے۔[2] اگر کوئی شخص پہلے سے سحری کھا کر سوجائے تو یہ سنت کے خلاف ہے، بلکہ عین وقت پر جب سحری کا وقت ختم ہورہا ہو، اس وقت کھانا افضل ہے۔ کیوں؟ اس لیے اگر پہلے سے کوئی شخص سحری کھا کر سوگیا تو اس نے اپنی طرف سے روزے کی مقدار میں اضافہ کردیا۔ وہ اتباع میں نہیں کر رہاہے، بلکہ اپنی طرف سے کر رہا ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ ساری بات ان کی اتباع میں ہے، ہم ان کے بندے ہیں۔ اور بندے کے معنیٰ یہ ہیں کہ جو کہیں وہ کرو۔

"بندہ" اپنی مرضی کا نہیں ہوتا

حضرت مفتی محمد حسن صاحب فرمایا کرتے تھے کہ بھائی! ایک ہوتا ہے ملازم اور ایک نوکر، ملازم اور نوکر خاص وقت اور خاص ڈیوٹی کا ہوتا ہے۔ مثلاً ایک ملازم کا کام صرف جھاڑو دینا ہے۔ کوئی دوسرا کام اس کے ذمے نہیں یا ایک

---

(۱) ملاحظہ ہو صحیح مسلم ۲/۷۷۱ (۱۰۹۸) وسنن أبی داود ۲/۳۰۵ (۲۳۵۳).
(۲) ملاحظہ ہو صحیح مسلم ۲/۷۷۱ (۱۰۹۷).

ملازم آٹھ گھنٹے کا ملازم ہے۔ آٹھ گھنٹے کے بعد اس کی چھٹی۔ اور ایک ہوتا ہے ''غلام'' جو نہ وقت کا ہوتا ہے اور نہ ڈیوٹی کا ہوتا ہے۔ وہ تو حکم کا پابند ہے۔ اگر آقا اس سے کہے کہ تم یہاں قاضی اور جج بن کر بیٹھ جاؤ اور لوگوں کے درمیان فیصلے کرو تو وہ قاضی بن کر فیصلے کرے گا۔ اور اگر آقا اس سے کہہ دے کہ پاخانہ اُٹھاؤ تو پاخانہ اٹھائے گا۔ اس کے لیے نہ وقت کی قید ہے اور نہ کام کی قید، بلکہ آقا جیسا کہہ دے غلام کو ویسا ہی کرنا ہوگا۔

غلام سے آگے بھی ایک درجہ اور ہے۔ وہ ہے ''بندہ''۔ وہ غلام سے بھی آگے ہے۔ اس لیے کہ ''غلام'' کم از کم اپنے آقا کی پرستش تو نہیں کرتا ہے، لیکن بندہ اپنے آقا کی عبادت اور پرستش بھی کرتا ہے۔ اور بندہ اپنی مرضی کا نہیں ہوتا ہے، بلکہ اپنے آقا کی مرضی کا ہوتا ہے۔ وہ جو کہے وہ کرے، دین کی روح اور حقیقت یہی ہے۔

بتاؤ! یہ کام کیوں کر رہے ہو؟

میں نے صبح سے شام تک کا ایک نظام بنا رکھا ہے کہ اس وقت تصنیف کرنی ہے، اس وقت درس دینا ہے، اس وقت فلاں کام کرنا ہے، تصنیف کے وقت جب تصنیف کرنے بیٹھے، مطالعہ کیا اور ابھی ذہن کو لکھنے کے لیے تیا کیا اور قلم اٹھایا تھا سوچ کر یوں لکھنا چاہیے کہ اتنے میں ایک صاحب آگئے اور آکر ''السلام علیکم'' کہا اور مصافحہ کے لیے ہاتھ بڑھادیے۔ اب اس وقت بڑا دل کڑھتا ہے کہ یہ خدا کا بندہ ایسے وقت آگیا، بڑی مشکل سے ابھی تو کتابیں دیکھ کر لکھنے کے لیے ذہن بنایا تھا اور یہ صاحب آگئے۔ اور اس کے ساتھ پانچ دس منٹ باتیں کیں، اتنے میں جو کچھ ذہن میں آیا تھا، وہ سب نکل گیا۔ اب اس کو از سرِ نو ذہن میں

جمع کیا۔ اس طرح صبح سے شام تک یہ دھندہ ہوتا رہتا ہے۔ ایسے وقت میں بڑی کُڑھن ہوتی تھی کہ ہم نے سوچا تھا کہ اس وقت میں اتنا کام ہوجائے گا۔ دو تین صفحے لکھ لیں گے، لیکن صرف چند سطروں سے زیادہ کام نہیں ہوا۔

اللہ تعالیٰ حضرت ڈاکٹر محمد عبد الحیٔ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے درجات بلند فرمائے۔ فرماتے تھے کہ میاں! یہ بتاؤ کہ یہ کام کیوں کر رہے ہو؟ یہ تصنیف، یہ تدریس، یہ فتویٰ کس لیے ہے؟ کیا یہ سب اس لیے ہے کہ تمہاری سوانح حیات میں لکھا جائے کہ اتنے ہزار صفحات تصنیف کر گیا اور اتنی بہت سی تصانیف اور کتابیں لکھیں یا اتنے بہت شاگرد پیدا کر دیے۔ اگر یہ سب کام اس لیے کر رہے ہو تو بے شک اس پر افسوس کرو کہ اس شخص کی ملاقات کی وجہ سے حرج ہوا۔ اور تعداد میں اتنی کمی ہوگئی، جتنے صفحات لکھنے چاہئیں تھے، اتنے نہ لکھے۔ جتنے شاگردوں کو پڑھانا چاہئے تھا، اُتنوں کا نہ پڑھایا، اس پر افسوس کرو، لیکن یہ سوچو کہ اس کا حاصل کیا ہے؟ محض لوگوں کی طرف سے تعریف، توصیف، شہرت۔ پھر تو یہ سب کام اکارت ہیں۔ اللہ تبارک وتعالیٰ کے یہاں اس کی ایک ڈھیلہ قیمت نہیں اور اگر مقصود ان کی رضا ہے کہ وہ راضی ہوجائیں، یہ قلم اس لیے ہل رہا ہے کہ وہ راضی ہوجائیں، ان کے یہاں یہ عمل مقبول ہوجائے، تو جب مقصود ان کی رضا ہے، وہ قلم ہلے یا نہ ہلے، وہ قلم ہلنے سے راضی ہوں تو قلم ہلنا بہتر ہے، اگر قلم نہ ہلنے سے راضی ہوجائیں تو وہی بہتر ہے، بس دیکھو کہ وقت کا تقاضا کیا ہے؟

تم نے بے شک اپنے ذہن میں یہ منصوبہ بنایا تھا کہ آج دو صفحے ہونے چاہئیں، لیکن وقت کا تقاضا یہ ہوا کہ ایک ضرورت مند آگیا۔ وہ کوئی مسئلہ پوچھ رہا ہے، کوئی اپنی ضرورت لے کر آیا ہے۔ اس کا بھی حق ہے، اس کا حق ادا کرو۔ اب وہ اس کا حق ادا کرنے میں راضی ہیں۔ اس سے بات کرنے میں اس

کو مسئلہ بتانے میں وہ راضی ہیں۔ تو پھر گھبرانے کی کیا ضرورت ہے کہ میرا یہ معمول رہ گیا۔ اب تمہاری تصنیف میں اتنا ثواب نہیں، جتنا اس شخص کی حاجت پوری کرنے میں ثواب ہے۔ بس! یہ دیکھو کہ وقت کا تقاضا کیا ہے؟ جس وقت کا جو تقاضا ہو، اس کے مطابق عمل کرو، یہ ہے دین کی فہم اور سمجھ کہ اپنی طرف سے کوئی تجویز نہیں، ہر بات ان کے حوالے ہے، وہ جیسا کرا رہے ہیں، انسان ویسا کررہا ہے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ اسی میں راضی ہیں۔ ہر چیز میں یہ دیکھو کہ اللہ تعالیٰ رضا کس میں ہے، اس کے مطابق عمل کرو۔ بیماری ہوتو، سفر ہوتو، حضر ہوتو، صحت ہوتو، ہرحالت میں ان کی رضا کی فکر کرو۔ اس لیے یہ نہیں سوچنا چاہیے کہ ہم نے منصوبے بنائے تھے، وہ منصوبے ٹوٹ گئے۔ ارے وہ منصوبے تو تھے ہی ٹوٹنے کے لیے، انسان کیا اور اس کے منصوبے کیا؟ منصوبہ تو انہی کا چلتا ہے، کسی کا منصوبہ نہیں چلتا۔ جب بیماری آئے گی تو منصوبہ ٹوٹے گا، منصوبوں کے پیچھے مت چلو، ان کی رضا دیکھو۔ ان شاء اللہ مقصد حاصل ہوجائے گا۔

حضرت اویس قرنی رحمۃ اللہ علیہ کا تذکرہ

حضرت اویس قرنی رحمۃ اللہ علیہ کو سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا دیدار نہ ملا۔ کون مسلمان ایسا ہوگا جس کو سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی زیارت اور دیدار کی خواہش نہ ہو۔ خواہش تو کیا تڑپ نہ ہو؟ جب کہ دیدار ہو بھی سکتا ہو۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے عہد مبارک میں موجود بھی ہو، لیکن سرکار کی طرف سے حکم یہ ہوگیا کہ تمہیں دیدار نہیں کرنا۔ تمہیں اپنی ماں کی خدمت کرنی ہے، اب ماں کی خدمت ہورہی ہے اور حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا دیدار چھوڑا جارہا ہے۔ کیوں؟ اس لیے کہ ان کو یہ فرمادیا کہ فائدہ اس میں ہے کہ ہمارا حکم مانو، ہمارا حکم یہ ہے کہ مدینہ نہ آؤ، ہمارا حکم یہ

ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر نہ ہو، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت نہ کرو، بلکہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی کہی ہوئی بات پر عمل کرو۔ اب ماں کی خدمت کر رہے ہیں اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے دیدار سے محروم ہیں۔ اس کا نتیجہ کیا ہوا؟ کہ جب حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ہدایت پر عمل کیا اور دیدار سے محروم رہے تو جولوگ دیدار سے بہرہ ور ہوئے تھے، جن کو سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا دیدار ہوا تھا، یعنی صحابہ کرام، وہ آ آ کر حضرت اویس قرنی رحمۃ اللہ علیہ سے دعائیں کراتے تھے کہ خدا کے واسطے ہمارے لیے دعا کرو، بلکہ حدیث میں آتا ہے کہ حضور اقدس سرورِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ سے فرمایا تھا کہ وہاں قرن میں میرا ایک امتی ہے، جس نے میرے حکم کی خاطر اور اللہ کی رضا کی خاطر میرے دیدار کو قربان کیا ہے۔ اے عمر! وہ جب کبھی مدینہ آئیں تو جا کر ان سے اپنے حق میں دعا کرانا(۱)۔ اگر کوئی شوقین ہوتا تو کہتا کہ مجھے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے دیدار کا شوق ہے اور یہ دیکھے بغیر کہ میری ماں بیمار ہے اور اس کو میری خدمت کی حاجت ہے، دیدار کے شوق میں چل کھڑا ہوتا۔ کیوں؟ صرف اپنا شوق پورا کرنے کے لیے، لیکن وہ اللہ کے بندے ہیں۔ اور حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لائے ہوئے ہیں، لہٰذا جو آپ نے فرمایا وہ کرتے ہیں۔ میرا شوق کچھ نہیں، میری تجویز کچھ نہیں، میری رائے کچھ نہیں، بلکہ جو انہوں نے فرمایا، وہی برحق ہے، اس پر عمل کرنا ہے۔

---

(۱) صحیح مسلم۱۹۶٤/٤ (۲٥٤۲) ومسند ابی یعلی ۱۸۷/۱ (۲۱۲) طبع دار المامون للتراث دمشق، والاصابہ فی تمییز الصحابۃ لابن حجر ج۱ص۳٥۹ طبع دار الکتب العلمیۃ۔

تمام بدعات کی جڑ —— نفس پرستی

اور یہ ساری بدعتیں جتنی رائج ہیں، ان سب کی جڑ یہاں سے کٹتی ہے، اگر یہ فہم دل میں پیدا ہوجائے کہ ہمارا شوق کچھ نہیں وہ جو حکم دیں اس پر عمل کرنا ہے، بدعت کے معنی کیا ہیں؟ بدعت کے معنی یہ ہیں کہ ہم خود راستہ نکالیں گے کہ اللہ کو راضی کرنے کا کیا راستہ ہے؟ اللہ تعالیٰ سے نہیں پوچھیں گے۔ ہمیں یہ سمجھ آرہا ہے کہ ۱۲ ربیع الاول کو عید میلاد النبی منانا اور میلاد پڑھنا یہ صحیح طریقہ ہے، اپنے دماغ سے یہ راستہ نکالا اور اس پر عمل شروع کردیا۔ نہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، نہ اللہ تعالیٰ نے کہا اور نہ صحابہ کرام نے اس پر عمل کیا، بلکہ ہم نے اپنے دماغ سے نکال دیا کہ یہ طریقہ موجب ثواب ہے، کسی کے مرنے کے بعد اس کا تیجہ کرنا اپنے دماغ سے نکال لیا، اللہ تعالیٰ اور اس رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھے بغیر اس پر چل کھڑا ہوا، اسی کا نام بدعت ہے، اسی کے بارے میں فرمایا:

"کل محدثة بدعة و کل بدعة ضلالة"(۱)

ہر نئی بات بدعت ہے اور ہر بدعت گمراہی ہے۔

اب بظاہر دیکھنے میں تیجہ ایک اچھا عمل ہے کہ بیٹھ کر قرآن شریف پڑھ رہے ہیں، کھانا پکا کر لوگوں میں تقسیم کر رہے ہیں۔ اس میں کیا حرج ہے؟ اور اس میں کیا گناہ ہے؟ گناہ اس میں یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھے بغیر کیا ہے اور جو کام بظاہر نیک ہو، لیکن ان کے بتائے ہوئے طریقے کے خلاف کیا جائے وہ اللہ کے ہاں قبول نہیں ہے

---

(۱) سنن ابی داود ٤/٢٠٠ (٤٦٠٧) وسنن الترمذی ٤/٤٠٨ (٢٦٧٦) وقال هذا حديث حسن صحيح۔

مرے محبوب مری ایسی وفا سے توبہ
جو ترے دل کی کدورت کا سبب بن جائے

یعنی جو چیز بظاہر وفاداری نظر آرہی ہے، لیکن حقیقت میں تیرے دل کی کدورت کا سبب بن رہی ہے، ایسی وفاداری سے توبہ مانگتا ہوں۔ اور اسی کا نام بدعت ہے۔ جس حال میں اللہ تعالیٰ رکھیں، بس! اسی حال میں خوش رہو۔ اور اس کا تقاضا پورا کرو۔

اپنا معاملہ اللہ پر چھوڑ دو

مولانا رومی رحمۃ اللہ علیہ نے کیا اچھی بات ارشاد فرمائی کہ ؎

چونکہ بر میخت بہ بندد بستہ باش
چوں کشاید چابک و برجستہ باش

وہ اگر تمہیں ہاتھ پاؤں باندھ کر ڈال دیں تو بندھے پڑے رہو۔ اور جب کھول دیں تو پھر چھلانگیں لگاؤ۔ اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم بھی یہی تلقین فرمارہے ہیں کہ بیماری کی وجہ سے گھبراؤ نہیں، رخصت پر عمل کرنا بھی بڑے ثواب کا کام ہے اور اللہ تعالیٰ کو بہت پسند ہے کہ میرے بندے نے میری دی ہوئی رخصت پر عمل کیا۔ اور اس رخصت کو بھی پورے اہتمام کے ساتھ استعمال کرو۔ اللہ تعالیٰ یہ بات ہمارے دلوں میں اتار دے۔ آمین

شکر کی اہمیت اور اس کا طریقہ

اس باب کی آخری حدیث ہے:

عن أنس رضی اللہ عنہ قال قال رسول اللہ ﷺ: «إنَّ

اللّٰـه لیَرضی مِن العبدِ أن یأکُلَ الأَکلةَ فیحمَدَہٗ علیھا ویشرَبَ الشَّربۃَ فیحمَدَہٗ علیھا»(۱)

حضرت انس رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ اس بندے کو بہت پسند فرماتے ہیں اور اس سے راضی ہوجاتے ہیں، جو بندہ کوئی لقمہ کھاتا ہے تو اللہ کا شکر ادا کرتا ہے اور پانی کا کوئی گھونٹ پیتا ہے تو اللہ کا شکر ادا کرتا ہے۔

مطلب یہ ہے کہ جو بندہ اللہ تعالیٰ کی ہر نعمت پر کثرت سے شکر ادا کرتا رہتا ہے، اللہ تعالیٰ اس سے راضی ہوجاتے ہیں۔

یہ بات بار بار عرض کرچکا ہوں کہ شکر سو عبادتوں کی ایک عبادت ہے اور ہمارے حضرت ڈاکٹر عبد الحیؒ صاحب قدس اللہ سرہ فرمایا کرتے تھے کہ کہاں کروگے مجاہدات اور ریاضتیں۔ اور کہاں وہ مشقتیں اُٹھاؤ گے جیسی صوفیائے کرام نے اٹھائیں، لیکن یہ ایک چٹکلا اختیار کرلو کہ ہر بات پر شکر ادا کرنے کی عادت ڈال لو۔ کھانا کھاؤ تو شکر، پانی پیو تو شکر، ہوا چلے تو شکر، بچہ سامنے آئے، اچھا لگے تو شکر، گھر والوں کو دیکھو اور دیکھ کر راحت ہو تو شکر ادا کرو۔ شکر ادا کرنے کی عادت ڈالو اور رٹ لگاؤ: "اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ، اَللّٰھُمَّ لَکَ الْحَمْدُ وَلَکَ الشُّکْرُ، اَللّٰھُمَّ لَکَ الْحَمْدُ وَلَکَ الشُّکْرُ" یاد رکھو کہ یہ شکر کی عادت ایسی چیز ہے کہ یہ بہت سارے امراضِ باطنی کی جڑ کاٹ دیتی ہے۔ یہ تکبر، یہ حسد، یہ عجب ان سب کی جڑ کاٹ دیتی ہے۔ جو آدمی کثرت سے شکر ادا کرتا ہے، وہ عام طور سے تکبر میں مبتلا نہیں ہوتا۔ یہ بزرگوں کا تجربہ ہے، بلکہ اس پر نص وارد ہے۔

---

(۱) صحیح مسلم ۲۰۹۵/٤ (۲۷۳٤).

شیطان کا بنیادی داؤ —— ناشکری پیدا کرنا

جب اللہ تعالیٰ نے شیطان کو راندہ درگاہ کیا اور نکال دیا، تو کم بخت نے جاتے جاتے کہہ دیا کہ مجھے ساری عمر کی مہلت دے دیجیے۔ اللہ تعالیٰ نے اس کو مہلت دے دی۔ اس نے کہا کہ اب میں تیرے بندوں کو گم راہ کروں گا۔ اور ان کو گم راہ کرنے کے لیے دائیں بائیں، آگے، پیچھے، غرض ہر طرف سے آؤں گا اور ان کو تیرے راستے سے بھٹکا دوں گا۔ اور آخر میں اس نے کہا

وَلَا تَجِدُ اَكْثَرَهُمْ شٰكِرِيْنَ (۱)

میرے بہکانے کے نتیجے میں آپ اپنے بندوں میں سے اکثر کو ناشکرا پائیں گے۔

شیطانی داؤ کا توڑ...... اداءِ شکر

حضرت تھانوی قدس اللہ سرہ فرماتے ہیں اس سے معلوم ہوا کہ شیطان کا جو بنیادی داؤ ہے، وہ ہے ناشکری پیدا کرنا۔ اگر ناشکری پیدا ہوگئی تو معلوم نہیں کتنے امراض میں مبتلا ہوگیا، اور اس داؤ کا توڑ شکر کرنا ہے۔ جتنا اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرو گے اتنا ہی شیطان کے حملوں سے محفوظ رہو گے۔ اس لیے روحانی بیماریوں سے بچنے کا مؤثر ترین طریقہ یہ ہے کہ ہر وقت اٹھتے بیٹھتے، چلتے پھرتے، دن رات صبح شام رٹ لگاؤ: "اللهم لك الحمد ولك الشكر" اس سے ان شاء اللہ شیطان کے حملوں کا سدّ باب ہوجائے گا۔

---

(۱) سورۃ الاعراف آیت (۱۷)۔

پانی خوب ٹھنڈا پیا کرو

حضرت حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکی قدس اللہ سرہ فرمایا کرتے تھے۔

میاں اشرف علی! جب پانی پیو تو خوب ٹھنڈا پیو۔ تاکہ روئیں روئیں سے اللہ تبارک وتعالیٰ کا شکر نکلے۔ اور کسی کھانے پینے کی چیز کے بارے میں یہ ثابت نہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لیے کوئی خاص چیز کہیں سے منگوائی جارہی ہے۔ لیکن صرف ٹھنڈا پانی تھا جو سرکارِ دو عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کے لیے تین میل کے فاصلے سے آیا کرتا تھا۔ بیرِ غرس نامی کنواں جو اب بھی مدینہ طیبہ میں موجود ہے۔ اس سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لیے خاص طور پر ٹھنڈا پانی منگوایا جاتا تھا[1]۔ حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اس میں حکمت یہ ہے کہ جب پیاس کی حالت میں ٹھنڈا پانی پیا جائے تو روئیں روئیں سے شکر نکلے گا۔

سونے سے پہلے نعمتوں کا استحضار اور ان پر شکر

اور رات کو سونے سے پہلے بیٹھ کر ساری نعمتوں کا استحضار کرلو کہ گھر عافیت کا ہے۔ "اللھم لك الحمد ولك الشكر"۔ بستر آرام دہ ہے۔ "اللھم لك الحمد ولك الشكر"۔ میں عافیت سے ہوں۔ "اللھم لك الحمد ولك الشكر"۔ بچے عافیت سے ہیں۔ "اللھم لك الحمد ولك الشكر"۔ ایک ایک نعمت کا استحضار کر کے رٹ لگاؤ۔

حضرت ڈاکٹر عبد الحئی صاحب قدس اللہ سرہ فرمایا کرتے تھے کہ میں نے یہ

---

(۱) الطبقات الكبرى لابن سعد ۴۳۴/۱ مكتبة الخانجي۔ الثقات لابن حبان ۵۰/۵ طبع دائرة المعارف الهند۔

چیز اپنے نانا سے سیکھی ہے۔ ایک مرتبہ میں ان کے گھر گیا تو رات کو میں نے دیکھا کہ وہ سونے سے پہلے بستر پر بیٹھے ہوئے ہیں اور بار بار، بار بار اللهم لك الحمد ولك الشکر، اللهم لك الحمد ولك الشکر پڑھ رہے ہیں۔ اور عجیب کیفیت میں یہ عمل کر رہے ہیں۔ میں نے پوچھا کہ حضرت! یہ کیا کر رہے ہیں؟ فرمانے لگے: بھائی سارے دن تو معلوم نہیں کس حالت میں رہتا ہوں اور یہ پتہ نہیں لگتا کہ شکر ادا ہو رہا ہے یا نہیں، اس وقت بیٹھ کر دن بھر کی ساری نعمتوں کا استحضار کرتا ہوں اور پھر ہر نعمت پر "اللهم لك الحمد ولك الشکر" کہتا جاتا ہوں۔

حضرت ڈاکٹر صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ جب میں نے یہ دیکھا تو اس کے بعد الحمد للہ میں نے بھی اس کو اپنے معمول میں شامل کرلیا، کہ رات کو سوتے وقت سب نعمتوں کا استحضار کر کے شکر ادا کرتا ہوں۔

شکر ادا کرنے کا آسان طریقہ

اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر قربان جائیں۔ آپ نے ہر ہر چیز کے طریقے بتا دیے ہیں۔ کہاں تک انسان شکر ادا کرے گا۔ بقول شیخ سعدی رحمۃ اللہ علیہ کے ہر سانس پر دو شکر واجب ہیں۔ سانس اندر جائے اور باہر نہ آئے تو موت اور اگر سانس باہر آئے پھر اندر نہ جائے تو موت، تو ایک سانس پر دو نعمتیں اور ہر نعمت پر ایک شکر واجب ہے۔ اس طرح ہر سانس پر دو شکر واجب ہو گئے۔ اس لیے اگر انسان سانس ہی کی نعمت کا شکر ادا کرنا چاہے تو کہاں تک کرے گا۔

وَاِنْ تَعُدُّوا نِعْمَةَ اللّٰهِ لَا تُحْصُوْهَا(۱)

اور اگر تم اللہ کی نعمتوں کو شمار کرنا چاہو تو نہیں کر سکتے۔

اس لیے سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے شکر ادا کرنے کا ایک آسان طریقہ بتادیا اور چند کلمات تلقین فرمادیے۔ ہر مسلمان کو یاد کر لینے چاہئیں۔ فرمایا:

اَللّٰهُمَّ لَكَ الْحَمْدُ حَمْدًا دَائِمًا مَعَ دَوَامِكَ، وَخَالِدًا مَّعَ خُلُوْدِكَ، وَلَكَ الْحَمْدُ حَمْدًا لَّا مُنْتَهٰى لَهٗ دُوْنَ مَشِيَّتِكَ وَلَكَ الْحَمْدُ حَمْدًا لَّا يُرِيْدُ قَائِلُهٗ اِلَّا رِضَاكَ(۲)

اے اللہ! آپ کا شکر ہے، ایسا شکر کہ جب تک آپ ہیں، اس وقت تک وہ شکر جاری رہے اور جس طرح آپ جاوداں ہیں، اسی طرح وہ شکر بھی جاوداں رہے۔ اور آپ کی مشیت کے آگے جس کی کوئی انتہا نہ ہو اور آپ کی ایسی حمد کرتا ہوں جس کے کہنے والے کو سوائے آپ کی رضا کے کچھ اور مطلوب نہ ہو۔

اور دوسری حدیث میں ارشاد فرمایا:

اَللّٰهُمَّ لَكَ الْحَمْدُ زِنَةَ عَرْشِكَ، وَمِدَادَ كَلِمَاتِكَ، وَعَدَدَ خَلْقِكَ، وَرِضَا نَفْسِكَ(۳)

---

(۱) سورۃ ابراہیم آیت (۳٤)۔

(۲) المعجم الاوسط ۳۵۵/۵ (۵۵۳۸) وذکرہ الہیثمی فی "مجمع الزوائد" ۹۷/۱۰ (۱٦۸۹٦) وقال: رواہ الطبرانی فی الاوسط، وفیہ علی بن الصلت، ولم اعرفہ، وبقیۃ رجالہ ثقات۔

(۳) ماخوذ از السنن الکبری للنسائی ۷۱/۹ (۹۹۱۷) من حدیث ابن عباس رضی اللہ عنہ، طبع الرسالۃ، وأصلہ فی صحیح مسلم ۲۰۹۰/٤ (۲۷۲٦) من حدیث جویریۃ بنت الحارث رضی اللہ عنہا.

میں آپ کا شکر ادا کرتا ہوں جتنا آپ کے عرش کا وزن ہے اور اتنا شکر ادا کرتا ہوں جتنی آپ کے کلمات کی سیاہی ہے۔ قرآنِ کریم میں ہے کہ اگر کوئی شخص اللہ تعالیٰ کے تمام کلمات کو لکھنا چاہے اور ساتوں کے ساتوں سمندر اس کے لیے سیاہی بن جائیں اور اس سے اللہ تعالیٰ کے کلمات لکھے جائیں تو سارے سمندر خشک ہوجائیں، لیکن اللہ تعالیٰ کے کلمات ختم نہ ہوں [۱]۔ تو آپ کے کلمات لکھنے کے لیے جتنی سیاہی درکار ہوسکتی ہے، اس کے بہ قدر شکر ادا کرتا ہوں اور جتنی آپ کی مخلوقات ہیں، یعنی انسان، جانور، درخت، پتھر، جمادات، نباتات سب جتنی مقدار میں ہیں، اس کے برابر شکر ادا کرتا ہوں۔ اور آخر میں فرمایا کہ اتنا شکر ادا کرتا ہوں جس سے آپ راضی ہوجائیں۔ اب اس سے زیادہ انسان اور کیا کہہ سکتا ہے، لہٰذا رات کو سوتے وقت ہر شخص کو اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرنا چاہیے اور یہ کلمات کہہ لینے چاہئیں۔

اَللّٰھُمَّ لَکَ الْحَمْدُ مَلِیًّا عِنْدَ طَرْفَۃِ کُلِّ عَیْنٍ وَتنفّس کل نفس

اے اللہ! آپ کی تعریف اور آپ کا شکر ہے، ہر آنکھ جھپکنے کے وقت اور ہر سانس لینے کے وقت۔

بہر حال! یہ شکر کے کلمات جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے تلقین فرمائے ہیں یاد کر لینے چاہئیں اور رات کو سوتے وقت ان کلمات کو پڑھ لینا چاہیے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو اس پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

وآخر دعوانا أن الحمد للہ رب العالمین

---

(۱) سورۃ الکہف آیت (۱۰۹).
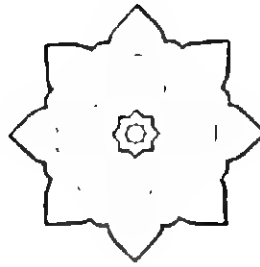
اسلام کی بنیادیں

(حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ص ۱۴)
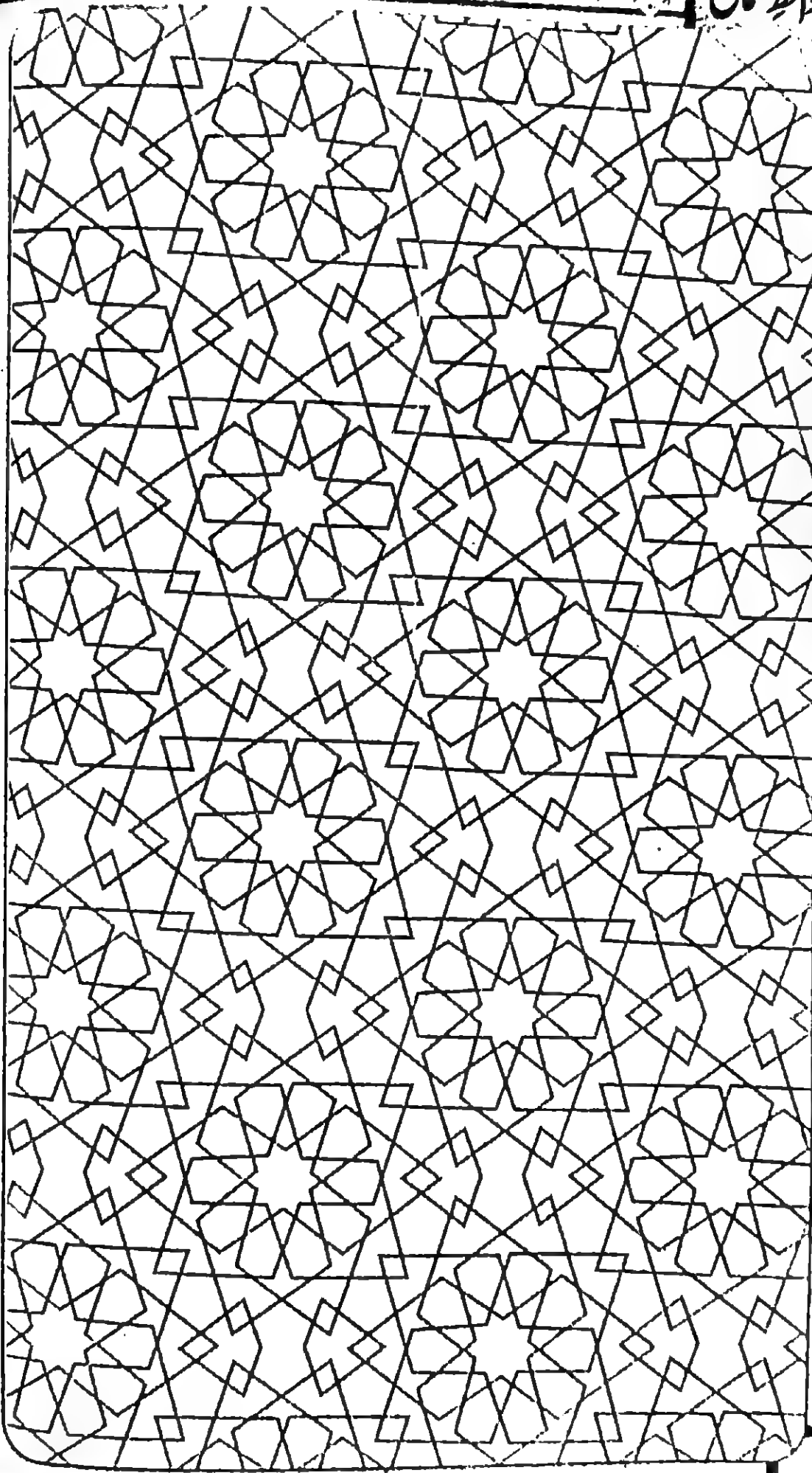
بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اسلام کی بنیادیں

الحمد للّٰہ کفی وسلام علی عبادہ الذین اصطفی

امابعد!

① عن ابن عمر رضی الله عنه قال قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: "بُنِيَ الإِسْلامُ عَلٰى خَمْسٍ شَهَادَةِ أَنْ لا إِلٰهَ إِلا اللهُ وَأَنَّ مُحَمَّدًا رَسُولُ اللهِ وَإِقَامِ الصَّلاةِ وَإِيْتَاءِ الزَّكَاةِ وَالْحَجِّ وَصَوْمِ رَمَضَانَ". (۱)

حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں اسلام کی بنیاد پانچ چیزوں پر ہے: ① اس بات کی (صدق دل کے ساتھ) گواہی دینا کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اللہ کے بندے اور اس کے رسول ہیں اور ② نماز قائم کرنا اور ③ زکوۃ دینا اور ④ حج کرنا اور ⑤ رمضان کے روزے رکھنا۔

---

(۱) صحیح البخاری ۱۱/۱ (۸) و صحیح مسلم ۴۵/۱ (۱۶)۔

(۲) عن انس رضی الله عنه قال قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: "ثلاثٌ مَنْ كُنَّ فيه وجَدَ حلاوةَ الإيمانِ: أنْ يكونَ اللّٰهُ و رسولُهُ أحبَّ إليه مِمَّا سِواهُما، و أنْ يُحِبَّ المرْءَ لا يُحِبُّهُ إلّا لِلّٰهِ، و أنْ يَكْرَهَ أنْ يَعودَ في الكُفرِ بعدَ إذْ أنقذَهُ اللّٰهُ مِنْهُ؛ كَما يَكرَهُ أنْ يُلقىٰ في النارِ". (۱)

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تین چیزیں ایسی ہیں کہ جس شخص میں بھی پائی جائیں گی وہ ایمان کی حلاوت محسوس کرے گا ایک یہ کہ اس شخص کو اللہ اور اس کا رسول دوسری ہر چیز سے زیادہ محبوب ہو۔ دوسری یہ کہ وہ کسی (اللہ کے) بندے سے محبت کرے اور محبت صرف اللہ کے لیے ہو۔ تیسرے یہ کہ اسے کفر سے نجات حاصل کرنے کے بعد دوبارہ اس کی طرف لوٹنا ایسا برا لگتا ہو جیسے وہ آگ میں جھونکے جانے کو برا سمجھتا ہے۔

(۳) عن العباس بن عبد المطلب رضی الله عنه قال قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: «ذاقَ طعمَ الإيمانِ من رضيَ باللّٰهِ ربًّا وبالإسلامِ دينًا

---

(۱) صحیح البخاری ۱۲/۱ (۱۶) وصحیح مسلم ۶۶/۱ (۴۳)۔

وبمحمدٍ صلى الله عليه وسلم رسولًا». (۱)

حضرت عباس بن عبد المطلب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا وہ شخص ایمان کا مزہ چکھ لے گا جو اللہ کو پروردگار سمجھ کر اسلام کو (اپنا) دین قرار دے کر اور محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو رسول یقین کر کے راضی ہوگیا ہو۔

④ عن انس رضى الله عنه قال قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: «لا يؤمنُ أحدُكم حتى أكونَ أحبَّ إليه من ولدِه ووالدِه والنَّاسِ أجمعِينَ». (۲)

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا تم میں سے کوئی مومن نہیں ہوسکتا جب تک کہ میں اس کی نظر میں اس کے والد سے، اس کی اولاد سے اور تمام انسانوں سے زیادہ محبوب نہ ہوں۔

⑤ عن عبد الله عمر رضى الله عنهما ان رسول الله صلى الله عليه وسلم قال: «أُمِرْتُ أنْ أُقَاتِلَ النَّاسَ حتَّى يَشْهَدُوا أنْ لا إلَهَ إلَّا اللّٰهُ، وأنَّ مُحمَّدًا رَسولُ اللّٰهِ، ويُقِيمُوا الصَّلَاةَ، ويُؤْتُوا الزَّكَاةَ، فَإِذَا فَعَلُوا ذلكَ عَصَمُوا مِنِّي دِمَاءَهُمْ وأَمْوالَهمْ إلَّا

---

(۱) صحيح مسلم ۶۲/۱ (۳٤)۔
(۲) صحيح البخاری ۱۲/۱ (۱۵) وصحيح مسلم ۵۲/۱ (۲۱)۔

بحَقِّ الاِسلَامِ، وحِسَابهُم علَى اللّٰہِ.[1]

حضرت عبد اللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ حضور اکرم سرورِ دو عالم ﷺ نے فرمایا مجھے حکم دیا گیا ہے کہ لوگوں سے جہاد کرتا رہوں یہاں تک کہ وہ اس بات کی گواہی دیں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور محمد ﷺ اللہ کے رسول ہیں اور نماز قائم کریں اور زکوۃ ادا کریں، جب وہ یہ کام کرلیں گے تو میری طرف سے ان کا خون اور ان کا مال محفوظ ہوگا سوائے اسلام کے حق کے (یعنی اگر وہ ایسا کام کریں، جس پر اسلام نے ان کی جان یا مال لینے کا حکم دیا ہے تو پھر ظاہر ہے کہ دوبارہ ان کی جان اور مال غیر معصوم ہوجائے گا)، اور ان کی پوشیدہ نیتوں کا حساب اللہ کے پاس ہے۔

(٦) عن عبد الله بن الصامت رضی الله عنه ان رسول الله صلى الله عليه وسلم قال: «ببايعوني علَى أن لا تُشرِكُوا باللّٰهِ شيئًا، ولا تَسرِقُوا، ولا تَزنُوا، ولا تقتُلُوا أولادَكُم، ولا تأتوا ببهتانٍ تفترُونَهُ بينَ أيدِيكُم وأرجلِكُم، ولا تعصُوا فِي معروفٍ، فمَنْ وَفَى منكُم فأَجرُهُ علَى اللّٰهِ، ومَنْ أَصَابَ مِن ذلِكَ شيئًا فعوقِبَ بهِ فِي الدُّنيَا فهو كَفَّارَةٌ، ومن أصابَ

[1] صحيح البخاری ١/١٤(٢٥) وصحيح مسلم ١/٥٢(٢١)۔

مِن ذلكَ شيئًا ثم سترَهُ اللّٰهُ فهو إلى اللّٰهِ، إن شاءَ عفا عنهُ، وإن شاءَ عاقبَهُ». (۱)

حضرت عبد اللہ بن الصامت رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے (ہم سے) فرمایا مجھ سے اس بات پر بیعت (عہد) کرو کہ اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہیں ٹھہراؤ گے، چوری نہیں کروگے، زنا نہیں کروگے، اپنی اولاد کو قتل نہیں کروگے، کسی پر اپنی طرف سے بہتان نہیں لگاؤ گے، اور کسی نیکی کے معاملہ میں اللہ کی نافرمانی نہیں کروگے، اب تم میں سے جو شخص اس عہد کو پورا کرے گا اس کا اجر اللہ کے پاس ہے۔ تم میں سے جو شخص ان میں سے (شرک کے علاوہ) کسی کام میں مبتلا ہوگیا ہو اور اس کی وجہ سے اس کو دنیا میں سزا دیدی گئی تو یہ سزا اس کے لیے کفارہ ہوجائے گی اور اگر کوئی شخص ان میں سے کسی کام میں مبتلا ہوگیا پھر اللہ نے دنیا میں اس کی پردہ پوشی کردی تو اس کا معاملہ اللہ کے سپرد ہے۔ اگر وہ چاہے درگزر کردے اور اگر چاہے تو اسے عذاب دے۔

⑦ عن ابی امامة عن رسول الله صلی الله علیه وسلم أنه قال: «من أحبَّ للّٰهِ وأبغضَ للّٰهِ وأعطى للّٰهِ

---

(۱) صحيح البخاري ۱/۱۲ (۱۸)۔

ومنعَ للّٰہِ فقدِاستکملَ الإیمانَ»۔ (۱)

حضرت ابو امامہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو شخص اللہ ہی کے لیے (کسی دوسرے سے) محبت کرے اور اللہ ہی کے لیے (اس کے دشمنوں سے) بغض رکھے، اللہ ہی کے لیے خرچ کرے اور اللہ ہی کے لیے خرچ کو روکے تو اس کا ایمان مکمل ہے۔

⑧ عن فضالة بن عبيد رضي الله عنه ان رسول الله صلى الله عليه وسلم قال في حجة الوداع: «الا اخبركم من المسلِمُ؟ من سلمَ الـمُسلِمونَ من لسانِهِ ويدِهِ، والمؤمنُ مَنْ أمنَهُ النَّاسُ علَى دمائِهِم وأموالهم، والمهاجِرُ مَن هجَر الخطايا والذُّنوبَ. والمجاهدُ مَن جاهدَ نفسَهُ في طاعةِ اللّٰهِ»۔ (۲)

حضرت فضالہ بن عبید رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حجۃ الوداع کے موقع پر فرمایا کہ میں تمہیں بتاتا ہوں کہ مسلمان کون ہے۔ (مسلمان) وہ ہے جس کی زبان اور ہاتھ سے مسلمان محفوظ رہیں اور مومن وہ ہے جس سے لوگوں کو اپنی جان و مال کا خوف نہ ہو اور مہاجر وہ ہے جو غلطیوں اور گناہوں کو چھوڑ دے اور مجاہد وہ ہے

(۱) سنن ابی داود ۴/۲۲۰ (۴۶۸۱)۔
(۲) مسند احمد ۳۹/۳۸۷ (۲۳۹۶۷)۔

جو اللہ کی اطاعت کے لیے اپنے نفس سے جہاد کرے۔

⑨ عن ابی امامة ... «اذا سَرَتْكَ حَسنَتُكَ وَسَاءَتْكَ سَيِئَتُكَ فَاَنْتَ مُؤمِن».(۱)

حضرت ابو امامہ رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً روایت ہے کہ جب تمہیں اپنی نیکی اچھی لگنے لگے اور برائی بری محسوس ہو تو تم مومن ہو۔

⑩ عن جابر .... «فإنَّ خَيْرَ الحديثِ كِتَابُ اللهِ، وَخَيْرُ الهُدَى هُدَى مُحَمَّدٍ، وَشَرُّ الأُمُورِ مُحْدَثَاتُهَا، وَكُلُّ بِدْعَةٍ ضَلَالَةٌ».(۲)

حضرت جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً روایت ہے کہ بہترین بات اللہ کی کتاب ہے اور بہترین سیرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سیرت ہے اور بدترین امور بدعتیں ہیں اور ہر بدعت گمراہی ہے۔

⑪ عن ابي موسى الاشعرى رضي الله عنه عن النبي صلى الله عليه وسلم قال: «إنَّ مَثَلِي ومَثَلَ ما بَعَثَنِيَ اللّٰهُ به كَمَثَلِ رَجُلٍ أتَى قَوْمَهُ، فقالَ: يا قَوْمِ إنِّي رَأَيْتُ الجَيْشَ بعَيْنَيَّ، وإنِّي أنا النَّذِيرُ العُرْيانُ، فالنَّجاءَ، فأطاعَهُ طائِفَةٌ مِن قَوْمِهِ، فأدْلَجُوا فانْطَلَقُوا علَى

(۱) مسند احمد ۳۶/۴۹۷ (۲۲۱۶۶)۔

(۲) صحیح مسلم ۲/۵۹۲ (۸۶۷)۔

مُهْلَتِهِمْ، و كَذَّبَتْ طائِفَةٌ منهمْ فأصْبَحُوا مكانَهمْ، فَصَبَّحَهُمُ الـجَيْشُ فأهْلَكَهمْ واجْتاحَهُمْ، فَذلكَ مَثَلُ مَنْ أطاعَنِي واتَّبَعَ ما جِئْتُ به، ومَثَلُ مَنْ عَصانِي و كَذَّبَ ما جِئْتُ بهِ مِنَ الـحَقِّ». (۱)

حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم سرورِ دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا میری اور جس پیغام کو دے کر اللہ نے مجھے بھیجا ہے اس کی مثال اس شخص کی سی ہے جو ایک قوم کے پاس آیا اور کہنے لگا کہ اے قوم میں نے تم پر حملہ آور (ہونے والا) لشکر اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے میں تمہیں ایک سخت مصیبت سے ڈرانے والا ہوں (اس لشکر کے مقابلے کے لیے) دوڑو۔ اس کی قوم کے کچھ لوگوں نے اس (ڈرانے والے کی) بات مانی اور منہ اندھیرے نکل چلے اور اطمینان سے چل کر نجات پا گئے اور کچھ لوگوں نے (اس ڈرانے والے کو) جھٹلایا اور اپنی جگہ بیٹھے رہے، صبح ہوتے ہی لشکر نے انہیں آگھیرا، چنانچہ انہیں ہلاک کر ڈالا اور ان کا بیج مار دیا۔ یہ مثال ہے ان لوگوں کی جنہوں نے میری بات مانی اور ان لوگوں کی جنہوں نے میرے لائے ہوئے پیغام کو جھٹلایا۔

(۱۲) عن ابی هريرة رضی الله عنه قال قال رسول الله

---

(۱) صحیح البخاری ۹۳/۹ (۷۲۸۳) وصحیح مسلم ۱۷۸۸/٤ (۲۲۸۳)۔

صلى الله عليه وسلم: «مَثَلي ومَثَلُ النَّاس كمثل رَجلٍ استَوْقَدَ نارًا، فَلَمَّا أضاءَتْ ما حولَهُ جعل الفَراشُ وهذِهِ الدَّوابُّ الَّتي تَقَعُ في النارِ يقعْن فيها، فَجَعَلَ يَنْزِعُهُنَّ ويَغْلِبْنَهُ فَيَقْتَحِمْنَ فيها، فأنا آخِذٌ بِحُجَزِكُمْ عَنِ النَّارِ، هَلُمَّ عَنِ النَّارِ، هَلُمَّ عَنِ النَّارِ، هَلُمَّ عَنِ النَّارِ فتغلبوني وهُمْ يَقْتَحِمُونَ فيها». (۱)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا میری مثال اس شخص کی سی ہے جس نے ایک آگ جلائی جب اس سے ماحول روشن ہوگیا تو یہ پروانے جو آگ میں آپڑا کرتے ہیں اس میں آ آکر گرنے لگے یہ ان کو روکتا رہا اور وہ اس کی نافرمانی کرکے آگ میں گرتے رہے، پس میں تمہارے پہلو پکڑ پکڑ کر تمہیں آگ میں جانے سے روکتا ہوں اور تم اس میں گرتے چلے جارہے ہو۔

(۱۳) عَنْ أَبِي مُوسَى الأشعري رضي الله عنه، عَنِ النَّبِيِّ صلى الله عليه وسلم قال: «إِنَّ مَثَلَ مَا بَعَثَنِيَ اللَّهُ بِهِ عَزَّ وجَلَّ مِنَ الهدَى وَالْعِلْمِ كَمَثَلِ غَيْثٍ أَصَابَ أرْضًا، فكانَتْ مِنْهَا طَائِفَةٌ طَيِّبَةٌ، قَبِلَتِ الْمَاءَ

(۱) صحيح مسلم ۴/۱۷۸۹ (۲۲۸۴) وصحيح البخاري ۸/۱۰۲ (۶۴۸۳)۔

فَأَنْبَتَتِ الْكَلَأَ وَالْعُشْبَ الْكَثِيرَ، وَكَانَ مِنْهَا أَجَادِبُ أَمْسَكَتِ الْمَاءَ، فَنَفَعَ اللّٰهُ بِهَا النَّاسَ، فَشَرِبُوا مِنْهَا وَسَقَوْا وَزَرَعُوا، وَأَصَابَ طَائِفَةً مِنْهَا أُخْرَى، إِنَّمَا هِيَ قِيعَانٌ لَا تُمْسِكُ مَاءً، وَلَا تُنْبِتُ كَلَأً، فَذَلِكَ مَثَلُ مَنْ فَقُهَ فِي دِينِ اللّٰهِ، وَنَفَعَهُ بِمَا بَعَثَنِيَ اللّٰهُ بِهِ، فَعَلِمَ وَعَلَّمَ، وَمَثَلُ مَنْ لَمْ يَرْفَعْ بِذَلِكَ رَأْسًا، وَلَمْ يَقْبَلْ هُدَى اللّٰهِ الَّذِي أُرْسِلْتُ بِهِ». (۱)

حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم سرورِ دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا مجھے جو ہدایت اور جو علم دے کر اللہ نے بھیجا ہے۔ اس کی مثال ایسی ہے جیسے کسی زمین پر زور دار بارش برسی، زمین کا ایک بہترین حصہ ایسا تھا جس نے پانی کا اثر قبول کیا اور اس پر خوب گھاس اور چارہ لگا۔ ایک زمین ایسی سخت قسم کی تھی کہ اس نے گھاس تو نہ اگائی، لیکن بارش کا پانی روک کر رکھ لیا اور اس سے اللہ نے لوگوں کو فائدہ پہنچایا، وہ خود بھی سیراب ہوئے دوسروں کو بھی سیراب کیا اور اس سے کھیتی باڑی بھی کی زمین کا ایک حصہ بالکل چٹیل تھا جو نہ پانی روکتا تھا اور نہ گھاس اگاتا تھا۔ یہ مثال ہے ان لوگوں کی جنہوں نے دین کی سمجھ حاصل کی، انہوں نے اس

(۱) صحیح البخاری ۲۷/۱ (۷۹)۔

رکھو یہ بات کچھ دور نہیں کہ کوئی پیٹ بھرا شخص آرام دہ نشست پر بیٹھ کر یہ کہے کہ بس اس قرآن پر عمل کرو اس میں جو چیز حلال پاؤ، اسے حلال سمجھو اور اس میں جو چیز حرام پاؤ، اسے حرام قرار دو، حالانکہ جس چیز کو اللہ کے رسول نے حرام قرار دیا ہو وہ بھی ایسی ہی ہے جیسی اللہ کی حرام قرار دی ہوئی چیز۔

اور حضرت عرباض بن ساریہ رضی اللہ عنہ کی روایت میں ہے کہ خوب سن لو! خدا کی قسم! میں نے تمہیں بہت سی باتوں کا حکم دیا ہے، بہت سی باتوں کی نصیحت کی ہے اور بہت سی چیزوں سے روکا ہے۔ بلاشبہ یہ احکام (تعداد کے اعتبار سے) قرآنی احکام جتنے ہیں یا اس سے بھی زیادہ۔

⑮ عن العرباض بن سارية .... «أُوصِيكُمْ بِتَقْوَى اللّٰهِ وَالسَّمْعِ وَالطَّاعَةِ وَإِنْ كَانَ عَبْدًا حَبَشِيًّا، فَإِنَّهُ مَنْ يَعِشْ مِنْكُمْ بَعْدِي فَسَيَرَى اخْتِلَافًا كَثِيرًا، فَعَلَيْكُمْ بِسُنَّتِي وَسُنَّةِ الْخُلَفَاءِ الرَّاشِدِينَ الْمَهْدِيِّينَ، وَعَضُّوا عَلَيْهَا بِالنَّوَاجِذِ، وَإِيَّاكُمْ وَمُحْدَثَاتِ الأُمُورِ، فَإِنَّ كُلَّ مُحْدَثَةٍ بِدْعَةٌ، وَإِنَّ كُلَّ بِدْعَةٍ ضَلَالَةٌ».(۱)

(۱) سنن ابی داود ٤/٢٠٠ (٤٦٠٧)

حضرت عرباض بن ساریہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ (نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا) میں تمہیں اللہ سے ڈرنے کی نصیحت کرتا ہوں اور اس بات کی وصیت کرتا ہوں کہ (اپنے امیر کی) بات سنو اور مانو خواہ وہ ایک حبشی غلام ہی کیوں نہ ہو، اس لیے میرے بعد تم میں سے جو شخص زندہ رہے گا وہ بہت اختلاف دیکھے گا۔ تم پر لازم ہے کہ میری سنت اور ہدایت یافتہ خلفاءِ راشدین کی سنت کو تھامے رہو اسے مضبوطی سے پکڑلو اور دین میں نئی نئی باتیں پیدا کرنے سے بچو، اس لیے کہ دین میں پیدا کی ہوئی ہر نئی بات بدعت ہے اور ہر بدعت گمراہی ہے۔

⑯ عن ابن عمر رضی الله عنهما، أن رسول الله صلى الله عليه وسلم قال: "إن اللّٰـه لا يَـجْمَعُ أمَّتِي، أوْ قَالَ: أُمَّةُ مُـحَمَّدٍ ﷺ، على ضَلَالَةٍ، وَيَدُ اللّٰـه مَعَ الْـجَمَـاعَةِ، وَمَنْ شَذَّ شُذَّ إلَى النَّارِ".(۱)

حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا بلاشبہ اللہ تعالی میری امت کو گمراہی پر متفق نہیں کرے گا۔ (مسلمانوں کی) جماعت پر اللہ کا ہاتھ ہوتا ہے۔ جو شخص جمہور مسلمین سے الگ ہوجائے، وہ جہنم میں بھی (مسلمانوں سے) علیحدہ رہے گا۔

---

(۱) سنن الترمذی ٣٦/٤ (٢١٦٧) وقال هذا حديث غريب من هذا الوجه ومشكوة المصابيح ٦١/١ (١٧٣)۔

⑰ عن ابن عمر رضی الله عنهما، عن رسول اللّٰه صلی الله علیه وسلم أنه قال: «اتَّبِعُوا السَّوَادَ الأَعْظَمَ، فَإِنَّهُ مَنْ شَذَّ شُذَّ فِي النَّارِ». (۱)

حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا مسلمانوں کی عظیم کثرت کا اتباع کرو اس لیے کہ جو ان سے الگ ہوا وہ جہنم میں بھی الگ ہوگا۔

⑱ عن معاذ بن جبل، أن نبي الله صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: «إِنَّ الشَّيْطَانَ ذِئْبُ الإِنْسَانِ كَذِئْبِ الْغَنَمِ، يَأْخُذُ الشَّاةَ الْقَاصِيَةَ وَالنَّاحِيَةَ، فَإِيَّاكُمْ وَالشِّعَابَ، وَعَلَيْكُمْ بِالْجَمَاعَةِ وَالْعَامَّةِ». (۲)

حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا بلاشبہ شیطان انسان کا ایسا ہی بھیڑیا ہے جیسے بکریوں کو کھانے والا بھیڑیا ہوتا ہے، وہ اس بکری کو پکڑ لیتا ہے جو گلے سے الگ ہو کر دور چلی گئی ہو یا عام بکریوں سے ہٹ کر چل رہی ہو۔ (لہٰذا) تم ان

---

(۱) مصابیح السنة ۱/۱۶۲ (۱۳۷) طبع دار المعرفة والسنن الواردة فی الفتن للدانی ۳/۷۴۷ (۳۶۸) طبع دار العاصمة۔

(۲) مسند أحمد ۳۵۸/۲۶ (۲۲۰۲۹)، وقال الهیثمی فی "المجمع" ۳۹۴/۵ (۱۹۰۸): رواه أحمد والطبرانی، ورجال أحمد ثقات إلا أن العلاء بن زیاد قیل لم یسمع من معاذ.

گھاٹیوں میں جانے سے بچو اور مسلمانوں کی عام جماعت کے ساتھ لگے رہو۔

⑲ عن مالك رحمه الله أنه بلغه أن رسول اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم قال: «تَرَكْتُ فِيكُمْ أَمْرَيْنِ لَنْ تَضِلُّوا مَا تَمَسَّكْتُمْ بِهِمَا: كِتَابَ اللهِ وَسُنَّةَ نَبِيِّهِ». (۱)

حضرت امام مالک رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا میں نے تمہارے درمیان دو چیزیں چھوڑی ہیں، جب تک ان کا دامن تھامے رہوگے ہرگز کبھی گمراہ نہیں ہوگے، اللہ کی کتاب اور اس کے نبی کی سنت۔

⑳ عن أبي هريرة قال قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: «مَثَلِي ومَثَلُ الأنبياءِ كمَثَلِ قَصْرٍ أُحْسِنَ بناؤُه، وتُرِكَ منه مَوْضِعُ لَبِنَةٍ، فطاف به النُّظَّارُ يَتَعَجَّبونَ من حُسْنِ بِنائِهِ، إلا مَوْضِعَ تلك اللَّبِنَةِ، فكنتُ أنا سَدَدْتُ مَوْضِعَ تلك اللَّبِنَةِ خُتِمَ بِيَ البُنْيانُ وخُتِمَ بِيَ الرُّسُلُ. وفي رواية: فَأَنَا اللَّبِنَةُ وَأَنَا خَاتَمُ النَّبِيِّينَ». (۲)

(۱) موطا امام مالک ۸۹۹/۲ (۳) طبع دار احیاء التراث العربی۔
(۲) مشکوۃ المصابیح ۱۶۰۱/۳ (۵۷۴۵) وصحیح مسلم ۱۷۹۰/٤ (۲۲۸٦)۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میری اور دوسرے تمام انبیاء علیہم السلام کی مثال ایک محل کی سی ہے جسے خوبصورتی سے تعمیر کیا گیا ہو، مگر اس میں ایک اینٹ کی جگہ خالی رہ گئی ہو، دیکھنے والے اس کے چاروں طرف گھوم کر اس کے حسن پر حیران ہوتے ہیں اور اس اینٹ کی کمی پر تعجب کرتے ہیں۔ بس میں ہوں جس نے اس اینٹ کی خالی جگہ کو پر کردیا مجھ پر قصرِ نبوت کی تکمیل ہوگئی اور مجھ پر رسول بھی ختم کردیے گئے ہیں اور دوسری روایت میں ہے کہ میں (قصر نبوت کی) وہی (آخری) اینٹ ہوں اور تمام نبیوں کا سلسلہ ختم کرنے والا۔

(۳۱) عن ابی هريرة رضی الله عنه عن النبی صلی الله عليه وسلم قال: «لا تَقُومُ السَّاعَةُ حتَّى يُبْعَثَ دَجَّالُونَ كَذَّابُونَ قَرِيبٌ مِن ثَلاثِينَ، كُلُّهُمْ يَزْعُمُ أنَّه رَسولُ اللَّه».(۱)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم سرورِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا قیامت اس وقت تک نہیں آئے گی جب تک تیس کے لگ بھگ دھوکہ باز لوگ نہ

(۱) صحيح البخاری ٤/٢٠٠(٣٦٠٩)۔

پیدا ہوجائیں، جن میں سے ہر ایک یہ دعوی کرے گا کہ وہ اللہ کا رسول ہے۔

واخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین
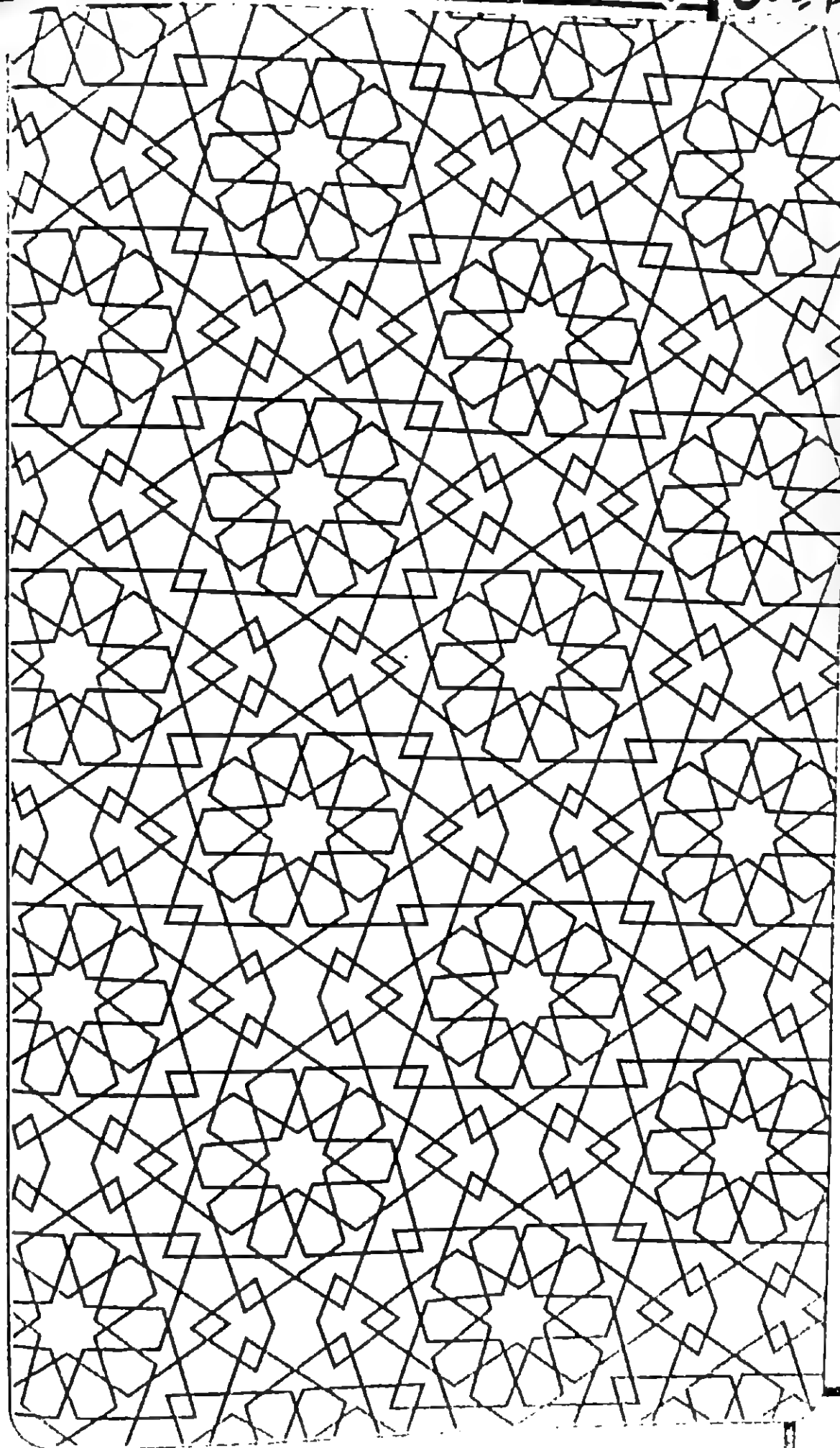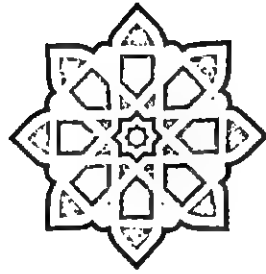
اسلام کا مطلب کیا؟

(اصلاحی خطبات ج۹ ص ۹۳)
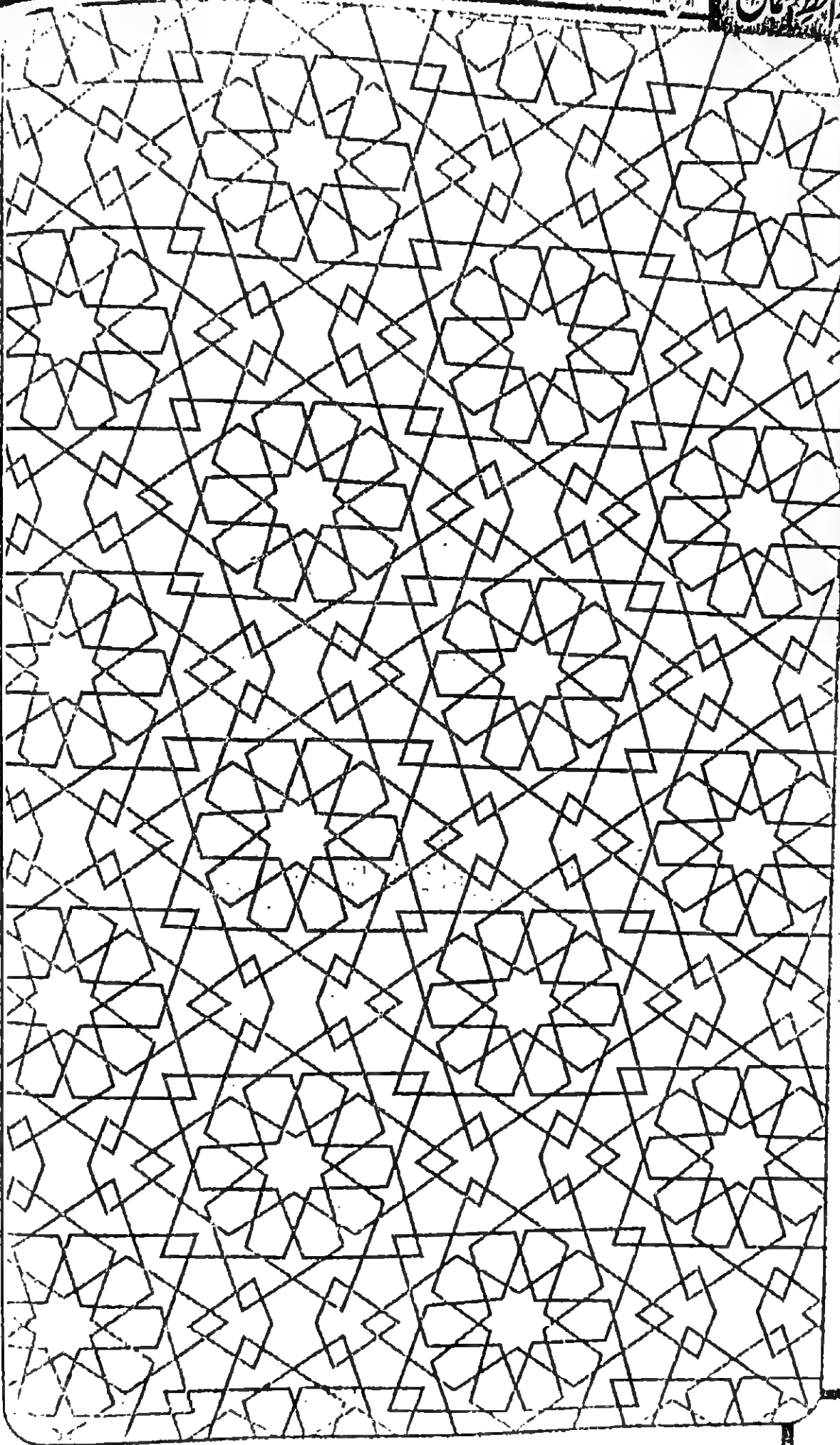
بسم اللہ الرحمن الرحیم

اسلام کا مطلب کیا؟

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَنَسْتَعِيْنُهٗ وَنَسْتَغْفِرُهٗ وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّئَاتِ اَعْمَالِنَا، مَنْ يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهٗ وَمَنْ يُّضْلِلْهُ فَلَا هَادِيَ لَهٗ، وَأَشْهَدُ اَنْ لَّا إِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَاشَرِيْكَ لَهٗ وَأَشْهَدُ اَنَّ سَيِّدَنَا وَنَبِيَّنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّداً عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَعَلٰى اٰلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ وَبَارَكَ وَسَلَّمَ تَسْلِيْمًا كَثِيْرًا كَثِيْرًا۔ أَمَّا بَعْدُ!

فَاَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيْمِ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا ادْخُلُوْا فِى السِّلْمِ كَاۗفَّةً ۠ وَلَا تَتَّبِعُوْا خُطُوٰتِ الشَّيْطٰنِ ۭ اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ (۱)

(۱) سورۃالبقرہ:آیت(۲۰۸).

آمنت باللہ صدق اللہ العظیم، وصدق رسولہ النبی الکریم، ونحن علی ذلک من الشاہدین والشاکرین، والحمد للہ رب العالمین۔

تمہید

میرے محترم بزرگو اور دوستو! سب سے پہلے آپ حضرات کے اس جذبے پر مبارکباد پیش کرنا چاہتا ہوں کہ آپ نے اپنے اوقات میں سے کچھ وقت دین کی بات سننے کے لیے نکالا اور اس غرض کے لیے یہاں جمع ہوئے کہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے احکامات اور تعلیمات کی کچھ باتیں کی جائیں۔ اللہ تعالیٰ آپ کے اس جذبے کو قبول فرمائے اور اس کے کہنے والے اور سننے والے سب کو عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔ اس وقت میں نے آپ حضرات کے سامنے قرآن کریم کی ایک آیت تلاوت کی ہے۔ اس آیت کی تھوڑی سی تشریح آپ حضرات کی خدمت میں عرض کرنا چاہتا ہوں۔

اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں مؤمنوں سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا:

> ''اے ایمان والو! اسلام میں پورے کے پورے داخل ہو جاؤ اور شیطان کے نقشِ قدم کی پیروی مت کرو اور اس کے پیچھے مت چلو''۔

کیا ایمان اور اسلام علیحدہ علیحدہ ہیں؟

یہاں سب سے پہلی بات جو سمجھنے کی ہے وہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں ان الفاظ سے خطاب کیا کہ ''اے ایمان والو!'' یعنی اُن لوگوں سے

خطاب ہو رہا ہے جو ایمان لا چکے ہیں، جو کلمہ طیبہ اور کلمہ شہادت پر اپنے اعتقاد کا اظہار کر چکے اور

"اشھد ان لا الٰہ الا اللہ و اشھد ان محمداً رسول اللہ"

کہہ چکے، ان سے خطاب کر کے کہا جا رہا ہے کہ "اے ایمان والو! اسلام میں داخل ہو جاؤ۔" سوچنے کی بات یہ ہے کہ جب ایمان لا چکے تو ایمان لانے کے بعد اسلام میں داخل ہونے کے کیا معنی؟ عام طور سے یہ سمجھا جاتا ہے کہ جب ایک شخص ایمان لے آیا تو وہ اسلام میں بھی داخل ہو گیا، ایمان اور اسلام ایک ہی چیز سمجھی جاتی ہے، لیکن اللہ تعالیٰ فرما رہے ہیں کہ اے ایمان والو! اسلام میں داخل ہو جاؤ۔ جس سے یہ سمجھ میں آ رہا ہے کہ ایمان کچھ اور چیز ہے اور اسلام کچھ اور چیز ہے اور ایمان لانے کے بعد اسلام میں داخل ہونا بھی ضروری ہے۔

"اسلام" لانے کا مطلب

پہلی بات تو یہ سمجھنے کی ہے کہ اسلام کیا ہے؟ اور ایمان والوں کو اسلام میں داخل ہونے کی جو دعوت دی جا رہی ہے، اس سے کیا مراد ہے؟ اور اسلام کس کو کہتے ہیں؟ "اسلام" عربی زبان کا لفظ ہے، اس کے معنی ہیں اپنے آپ کو کسی کے آگے جھکا دینا۔ یعنی کسی بڑی طاقت کے سامنے اپنا سرِ تسلیم خم کر دینا اور اپنے آپ کو اس کا تابع بنا لینا کہ جیسا وہ کہے اس کے مطابق انسان کرے، یہ ہیں "اسلام" کے معنی۔ جس کا مطلب یہ ہوا کہ صرف زبان سے کلمہ طیبہ پڑھ لینا، اللہ تعالیٰ کی وحدانیت، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رسالت اور یومِ آخرت پر ایمان لے آنا، یہ باتیں اسلام میں داخل ہونے کے لیے کافی نہیں، بلکہ اسلام میں داخل ہونے کے لیے ضروری ہے کہ انسان اپنے پورے وجود کو اللہ تعالیٰ کے حکم

اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم کے آگے جھکا دے۔ جب تک یہ نہیں ہوگا اس وقت تک انسان صحیح معنی میں اسلام کے اندر داخل نہیں ہوگا۔

بیٹے کے ذبح کا حکم عقل کے خلاف تھا

یہی لفظ ''اسلام'' اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم کی ''سورۂ صٰفّٰت'' میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کے واقعے میں بھی استعمال فرمایا ہے۔ وہ واقعہ یہ ہے کہ حضرت ابراہیم خلیل اللہ علیہ الصلوٰۃ والسلام کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ حکم ہوا تھا کہ وہ اپنے بیٹے حضرت اسماعیل علیہ الصلوٰۃ والسلام کو ذبح کردیں، جس کی یادگار ہم اور آپ ہر سال عیدالاضحیٰ کے موقع پر مناتے ہیں۔ بیٹا بھی وہ جو اُمنگوں اور مرادوں سے طلب کیا ہوا، جس کے لیے آپ نے دعائیں کی تھیں کہ یااللہ! ''مجھے بیٹا عنایت فرمادیجیے''، جب وہ بیٹا ذرا چلنے پھرنے اور آنے جانے کے لائق ہوا اور باپ کا ہاتھ بٹانے کے لائق ہوا تو اس وقت یہ حکم آیا کہ اس کے گلے پر چھری پھیر کر اس کو ختم کردو۔ اب اگر اس حکم کو عقل کی میزان میں تول کر دیکھا جائے اور اس کی حکمت اور مصلحت پر غور کیا جائے تو کوئی عقلی حکمت، عقلی مصلحت، کوئی عقلی جواز اس بات کا نظر نہیں آئے گا کہ کوئی باپ اپنے بیٹے کے گلے پر چھری پھیر دے، نہ تو کوئی باپ ایسا کرسکتا ہے اور نہ ہی دنیا کا کوئی انسان اس عمل کو عقل اور انصاف کے مطابق قرار دے سکتا ہے۔

بیٹے کا بھی امتحان ہوگیا

لیکن جب اللہ تعالیٰ کا حکم آگیا کہ اپنے بیٹے کو قربان کردو تو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے بیٹے حضرت اسماعیل علیہ السلام سے فرمایا:

يٰبُنَيَّ اِنِّيْٓ اَرٰى فِي الْمَنَامِ اَنِّيْٓ اَذْبَحُكَ فَانْظُرْ مَاذَا تَرٰى (۱)

بیٹا! میں نے خواب میں دیکھا ہے کہ میں تمہیں ذبح کر رہا ہوں۔ بتاؤ تمہاری کیا رائے ہے؟ مجھے کیا کرنا چاہیے؟

یہ سوال اس لیے نہیں کیا کہ ان کے دل میں اس حکم پر عمل کرنے میں تردد تھا، بلکہ اس لیے کیا کہ بیٹے کا بھی امتحان لیا جائے کہ دیکھیں بیٹا اس کے بارے میں کیا جواب دیتا ہے۔ وہ بیٹا بھی خلیل اللہ کا بیٹا تھا اور جس کی صلب سے نبی کریم سرورِ دوعالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم دنیا میں تشریف لانے والے تھے۔ اس بیٹے نے بھی پلٹ کر یہ نہیں کہا کہ ''ابا جان! میں نے کون سا ایسا جرم کیا ہے؟ کیا خطا مجھ سے سرزد ہوئی ہے؟ کیا غلطی میں نے کی ہے جس کی پاداش میں مجھے زندگی سے محروم کیا جا رہا ہے اور مجھے قتل کیا جا رہا ہے؟'' بلکہ جواب میں بیٹے نے یہ کہا کہ

يٰٓاَبَتِ افْعَلْ مَا تُؤْمَرُ ۡ سَتَجِدُنِيْٓ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ مِنَ الصّٰبِرِيْنَ (۲)

ابا جان! جو حکم آپ کو اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے ہوا ہے، اس کو کر گزریے اور میری فکر نہ کیجیے، اس لیے کہ اس حکم پر عمل کرنے میں مجھے تکلیف پہنچے گی تو ان شاء اللہ آپ مجھے صبر کرنے والوں میں سے پائیں گے۔

اور حضرت ابراہیم علیہ السلام نے بھی اللہ تعالیٰ سے یہ نہیں پوچھا کہ اے اللہ! آپ نے جو مجھے میرے چہیتے بیٹے کو قربان کرنے کا حکم دیا ہے اس میں کیا

---

(۱) سورۃ الصافات آیت (۱۰۲)۔

(۲) ایضاً۔

حکمت اور مصلحت ہے؟ بس دونوں نے یہ دیکھا کہ یہ حکم ہمارے خالق اور ہمارے مالک کی طرف سے آیا ہے اسی وقت دونوں باپ اور بیٹے اس حکم کی تعمیل پر تیار ہو گئے۔

چلتی چھری نہ رُک جائے

قرآنِ کریم نے اس واقعے کو بڑے پیارے انداز میں ذکر فرمایا ہے، یعنی جب باپ اور بیٹا اس حکم کو پورا کرنے کے لیے تیار ہو گئے اور باپ کے ہاتھ میں چھری ہے، اور بیٹا زمین پر لٹا دیا گیا ہے اور قریب ہے کہ وہ چھری گلے پر چل جائے اور بیٹے کا کام تمام کردے۔ اس واقعے کو ذکر کرنے کے لیے قرآنِ کریم نے جو الفاظ استعمال فرمائے ہیں وہ یہ ہیں:

فَلَمَّآ أَسۡلَمَا وَتَلَّهُۥ لِلۡجَبِينِ

یعنی جب باپ اور بیٹے دونوں اسلام لے آئے اور دونوں نے اللہ کے حکم کے آگے اپنے آپ کو جھکا دیا اور باپ نے بیٹے کو پیشانی کے بل لٹا دیا۔

پیشانی کے بل اس لیے لٹایا کہ اگر سیدھا لٹائیں تو کہیں ایسا نہ ہو کہ بیٹے کی صورت دیکھ کر اور اس صورت پر ظاہر ہونے والے کرب اور تکلیف کے اثرات دیکھ کر چھری چلنے کی رفتار میں کمی آجائے اور کہیں اللہ تعالیٰ کے حکم کو پورا کرنے میں رُکاوٹ پیدا ہو جائے، اس لیے اُلٹا لٹایا۔ اس موقع پر اللہ تعالیٰ نے لفظ "اَسلَمَا" استعمال فرمایا، یعنی دونوں اللہ تعالیٰ کے حکم کے آگے جھک گئے۔

اللہ کے حکم کے تابع بن جاؤ

اس سے معلوم ہوا کہ قرآن کی اصطلاح میں "اسلام" کے معنی یہ ہیں کہ انسان اپنے آپ کو اور اپنے پورے وجود کو اللہ تعالیٰ کے حکم کے آگے جھکا دے اور جب اللہ تعالیٰ کا کوئی حکم آجائے تو یہ نہ پوچھے کہ اس میں عقلی حکمت اور مصلحت کیا ہے، بلکہ اللہ تعالیٰ کا حکم آنے کے بعد اس کی تعمیل کی فکر کرے۔ یہ ہے "اسلام" اور اسی اسلام میں داخل ہونے کے لیے قرآنِ کریم کی آیت

يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا ادْخُلُوا فِي السِّلْمِ كَافَّةً

میں حکم دیا گیا ہے یعنی اے ایمان والو! تم نے کلمۂ طیبہ اور کلمۂ شہادت تو پڑھ لیا لیکن اب اسلام میں داخل ہونے کی ضرورت ہے، وہ یہ کہ اپنے پورے وجود کو اللہ تعالیٰ کے حکم کے تابع بنادو اور جو حکم بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے آئے اس کو قبول کرو، اس کو تسلیم کرو اور اس پر عمل کرو۔

ورنہ عقل کے غلام بن جاؤ گے

اب سوال یہ ہے کہ اللہ کے حکم کو بے چوں و چرا کیوں مان لیں؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اگر تم اللہ کے حکم کو اس طرح بے چوں و چرا نہیں مانو گے بلکہ اپنی عقل اور سمجھ استعمال کر کے یہ کہو گے کہ یہ حکم تو بے کار اور بے فائدہ ہے یا یہ حکم تو انصاف کے خلاف ہے تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ تم اپنی عقل کے غلام بن کر رہ جاؤ گے اور اللہ کی غلامی اور بندگی کو چھوڑ کر عقل کی غلامی میں مبتلا ہو جاؤ گے۔

علم حاصل کرنے کے ذرائع

اللہ تعالیٰ نے انسان کو اس دنیا میں علم حاصل کرنے کے کچھ ذرائع عطا

فرمائے ہیں، ان ذرائع کے ذریعے انسان علم حاصل کرتا ہے۔ مثلاً سب سے پہلا ذریعۂ علم ''آنکھ'' ہے۔ آنکھ کے ذریعے چیزوں کو دیکھ کر ان کے بارے میں انسان علم حاصل کرتا ہے۔ دوسرا ذریعۂ علم ''زبان'' ہے۔ اس زبان کے ذریعے انسان بہت سی چیزوں کو چکھ کر ان کے بارے میں علم حاصل کرتا ہے۔ تیسرا ذریعۂ علم ''کان'' ہے۔ اس کان کے ذریعے بہت سی چیزوں کے بارے میں سن کر انسان علم حاصل کرتا ہے۔ ایک ذریعۂ علم ''ہاتھ'' ہے۔ اس کے ذریعے انسان بہت سی چیزوں کو چھوکر علم حاصل کرتا ہے۔ مثلاً یہ مائیکروفون ہے۔ اب مجھے آنکھ کے ذریعے دیکھ کر اس کے بارے میں یہ علم ہوا کہ یہ ایک آلہ ہے اور گول بنا ہوا ہے اور ہاتھ لگانے سے پتہ چلا کہ یہ ٹھوس ہے اور کان کے ذریعے مجھے پتہ چلا کہ یہ آلہ میری آواز کو دور تک پہنچارہا ہے۔ دیکھیے! کچھ علم آنکھ کے ذریعے دیکھ کر حاصل ہوا، کچھ علم کان کے ذریعے سن کر حاصل ہوا اور کچھ علم ہاتھ کے ذریعے چھوکر حاصل ہوا۔

ان ذرائع کا دائرۂ کار متعین ہے

لیکن اللہ تعالیٰ نے ان ذرائعِ علم کا ایک دائرہ کار مقرر کردیا ہے، اس دائرے کے اندر وہ ذریعۂ علم کام دے گا، اگر اس دائرہ سے باہر اس ذریعے کو استعمال کروگے تو وہ ذریعہ کام نہیں دے گا۔ مثلاً آنکھ کا دائرہ کار یہ مقرر کردیا ہے کہ وہ دیکھ کر علم عطا کرتی ہے، لیکن سن کر علم نہیں دیتی، اس کے اندر سننے کی طاقت موجود نہیں، وہ کام کان کا ہے، اور کان سُن سکتا ہے، مگر دیکھ نہیں سکتا، زبان چکھ سکتی ہے، لیکن اس کے اندر سننے اور دیکھنے کی صلاحیت موجود نہیں۔ اگر کوئی شخص یہ چاہے کہ میں اپنی آنکھیں بند کرلوں اور اپنے کانوں کے ذریعے یہ

دیکھوں کہ میرے سامنے کیا منظر ہے تو وہ احمق اور بیوقوف ہے، اس لیے کہ کان اس کو کوئی منظر نہیں دکھا سکے گا، کیونکہ اس نے کان کو اس کے دائرۂ کار سے باہر استعمال کیا۔ کان دیکھنے کے لیے وضع ہی نہیں کیے گئے ہیں یا اگر کوئی شخص یہ چاہے کہ میں کان کو تو بند کرلوں اور آنکھوں کے ذریعے یہ سنوں کہ میرے سامنے والا شخص کیا بات کہہ رہا ہے تو وہ شخص بھی بیوقوف ہے، اس لیے کہ سننے کا کام آنکھ انجام نہیں دے سکتی، لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ یہ آنکھ بے کار ہے، یہ آنکھ بڑی کارآمد ہے، لیکن اس وقت تک کارآمد ہے جب تک اس کو اس کے دائرہ کار میں اور دیکھنے کے کام میں استعمال کیا جائے، اگر سننے میں استعمال کروگے تو یہ آنکھ کوئی کام نہیں دے گی۔

ایک اور ذریعۂ علم "عقل"

لیکن ایک مرحلہ ایسا آتا ہے جہاں یہ ظاہری حواسِ خمسہ آنکھ، کان، ناک، زبان اور ہاتھ معلومات فراہم کرنا چھوڑ دیتے ہیں، کام دینا بند کردیتے ہیں، اس مرحلے کے لیے اللہ تعالیٰ نے ایک اور ذریعۂ علم عطا فرمایا ہے، وہ ہے انسان کی عقل۔ یہ عقل ان چیزوں کا علم انسان کو عطا کرتی ہے جن کا علم آنکھ کے ذریعے دیکھ کر حاصل نہیں ہوسکتا۔ مثلاً یہ مائیکروفون ہے، میں نے ہاتھ کے ذریعے چھوکر اور آنکھ کے ذریعے دیکھ کر یہ تو پتہ لگالیا کہ یہ ٹھوس ہے، لوہے کا بنا ہوا ہے، لیکن اس کو کس نے بنایا؟ اور کس طرح یہ وجود میں آیا؟ یہ بات نہ آنکھ دیکھ کر بتاسکتی ہے، نہ کان سن کر بتاسکتا ہے، نہ زبان چکھ کر بتاسکتی ہے۔ اس کو معلوم کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے ہمیں عقل عطا فرمائی ہے، اس عقل کے ذریعے ہمیں پتہ چلا کہ اتنا خوبصورت اور شاندار بنا ہوا آلہ جو اتنا اہم کام انجام دے رہا ہے کہ

ہماری آواز کو دور تک پہنچا رہا ہے، یہ آلہ خود بخود نہیں بن سکتا، ضرور کسی کاریگر نے اس کو بنایا ہے اور ایسے کاریگر نے بنایا ہے جو بڑا ماہر ہے، اور اس فن کو جاننے والا ہے، لہٰذا جس جگہ پر یہ حواسِ خمسہ اپنا کام کرنا چھوڑ دیتے ہیں وہاں اللہ تعالیٰ نے ہمیں علم حاصل کرنے کے لیے عقل کا ذریعہ عطا فرمایا ہے۔

عقل کا دائرہ کار

لیکن جس طرح آنکھ، کان اور زبان وغیرہ کا کام غیر محدود نہیں تھا، بلکہ ایک دائرہ کار کے اندر اپنا کام کرتے تھے اس سے باہر یہ اپنا کام کرنا چھوڑ دیتے تھے، اسی طرح عقل کا کام بھی غیر محدود نہیں، بلکہ اس کا بھی ایک دائرہ کار ہے اس دائرہ کار سے باہر نکل کر وہ بھی انسان کی رہنمائی نہیں کرتی۔ ایک مرحلہ ایسا آتا ہے جہاں پر عقل بھی خاموش ہوجاتی ہے جواب دے جاتی ہے اور انسان کی صحیح رہنمائی نہیں کرسکتی۔

ایک اور ذریعۂ علم ''وحیِ الٰہی''

اور جس جگہ پر عقل انسان کی صحیح رہنمائی کرنے سے عاجز ہوجاتی ہے، وہاں پر انسان کی رہنمائی کے لیے اللہ تعالیٰ نے تیسرا ذریعۂ علم عطا فرمایا ہے اس تیسرے ذریعۂ علم کا نام ''وحی الٰہی'' یعنی اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل شدہ ''وحی'' جو انبیاء علیہم السلام پر نازل ہوتی ہے۔ یہ ''وحی'' اسی جگہ پر انسان کی رہنمائی کرتی ہے جس جگہ پر انسان کی تنہا عقل کافی نہیں ہوتی، لہٰذا جن باتوں کا ادراک عقل کے ذریعے ممکن نہیں تھا ان باتوں کو بتانے کے لیے اللہ تعالیٰ نے وحی نازل فرمائی، اس وحی کے ذریعے ہمیں بتایا کہ یہ کام اس طرح ہے۔

عقل کے آگے "وحیِ الٰہی"

مثلاً یہ بات کہ اس کائنات کے ختم ہونے کے بعد اور انسان کے مرجانے کے بعد ایک زندگی اور آنے والی ہے، جس میں انسان کو اللہ تعالیٰ کے سامنے پیش ہونا ہے اور اس کو وہاں پر اپنے تمام اعمال کا جواب دینا ہے اور وہاں پر ایک عالَم جنت ہے اور ایک عالَم جہنم ہے۔ یہ ساری باتیں ایسی ہیں کہ ان کے بارے میں وحی نازل نہ ہوتی اور وحی کے ذریعے انبیاء علیہم السلام کو نہ بتایا جاتا تو محض عقل کی بنیاد پر ہم اور آپ یہ پتہ نہیں لگاسکتے تھے کہ مرنے کے بعد کیسی زندگی آنے والی ہے؟ اور اس میں کیسے حالات پیش آنے والے ہیں؟ اور اللہ تعالیٰ کے سامنے کس طرح جواب دینا ہے؟ اس مقصد کے لیے اللہ تعالیٰ نے ایک تیسرا ذریعۂ علم ہمیں عطا فرمایا، جس کا نام 'وحی الٰہی' ہے۔

وحیِ الٰہی کو عقل سے مت تولو

یہ 'وحیِ الٰہی' آتی ہی اس جگہ پر ہے جہاں عقل کام نہیں دے سکتی تھی اور انسان کی رہنمائی نہیں کرسکتی تھی، اس وجہ سے اس جگہ پر 'وحی الٰہی' ہماری رہنمائی کرتی ہے۔ اب اگر کوئی شخص یہ کہے کہ میں 'وحی الٰہی' کی بات اس وقت تک نہیں مانوں گا جب تک وہ میری عقل میں نہ آجائے۔ وہ شخص ایسا ہی بیوقوف ہے جیسے کوئی شخص یہ کہے کہ میں یہ بات اس وقت تک تسلیم نہیں کروں گا جب تک مجھے اپنے کان سے یہ چیز نظر نہ آنے لگے۔ ایسا شخص بیوقوف ہے، اس لیے کہ کان دیکھنے کے لیے بنایا ہی نہیں گیا۔ اسی طرح وہ شخص بھی بیوقوف ہے جو یہ کہے کہ 'وحی الٰہی کی بات اس وقت تک تسلیم نہیں کروں گا جب تک میری عقل

نہ مان لے۔'' اس لیے کہ وحی الٰہی تو آتی ہی اس جگہ پر ہے جہاں عقل کی پرواز ختم ہوجاتی ہے، جیسے میں نے آپ کو جنت اور جہنم کی مثال دی۔ اب لوگ یہ کہتے ہیں کہ جنت اور جہنم کی بات ہماری عقل میں نہیں آتی، حالانکہ یہ چیزیں عقل کے اندر کیسے آسکتی ہیں؟ اس لیے کہ یہ چیزیں عقل کی محدود پرواز اور محدود دائرے سے باہر ہیں، اسی وجہ سے ان کو بیان کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے انبیاء علیہم السلام پر وحی نازل فرمائی۔

اچھائی اور برائی کا فیصلہ ''وحی'' کرے گی

اسی طرح یہ بات کہ کون سی چیز اچھی ہے اور کون سی چیز بُری ہے؟ کیا کام اچھا ہے اور کیا کام بُرا ہے؟ کیا چیز حلال ہے اور کیا چیز حرام ہے؟ کون سا کام جائز ہے اور کون سا کام ناجائز ہے؟ یہ کام اللہ تعالیٰ کو پسند، اور یہ کام اللہ تعالیٰ کو ناپسند ہے، ان سب کا فیصلہ وحی پر چھوڑا گیا ہے، محض انسان کی عقل پر نہیں چھوڑا گیا۔ اس لیے کہ تنہا انسان کی عقل یہ فیصلہ نہیں کرسکتی تھی کہ کون سا کام اچھا ہے اور کون سا کام بُرا ہے؟ کون سا حلال ہے اور کون سا حرام ہے؟

انسانی عقل غلط رہنمائی کرتی ہے

اس دنیا کے اندر جتنی بڑی سے بڑی برائیاں پھیلی ہیں اور غلط سے غلط نظریات اس دنیا کے اندر آئے وہ سب عقل کی بنیاد پر آئے۔ مثلاً ہم اور آپ بحیثیتِ مسلمان یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ سور کا گوشت حرام ہے۔ اگر اس کے بارے میں وحی کی رہنمائی سے ہٹ کر صرف عقل کی بنیاد پر سوچیں گے تو عقل غلط رہنمائی کرے گی۔ جیسا کہ غیر مسلموں نے صرف عقل کی بنیاد پر یہ کہہ دیا کہ

’’ہمیں تو سور کا گوشت کھانے میں بڑا مزہ آتا ہے، اس کے کھانے میں کیا حرج ہے؟ اس میں کیا عقلی خرابی ہے؟‘‘ اسی طرح ہم اور آپ کہتے ہیں کہ ’’شراب پینا حرام ہے، شراب بُری چیز ہے‘‘، لیکن جو شخص وحی الٰہی پر ایمان نہیں رکھتا وہ یہ کہے گا کہ شراب پینے میں کیا قباحت ہے؟ کیا بُرائی ہے؟ ہمیں تو اس میں کوئی بُرائی نظر نہیں آتی، لاکھوں افراد شراب پی رہے ہیں، ان کو اس کے پینے سے کوئی خاص نقصان نہیں ہورہا ہے اور ہماری عقل میں تو اس کے بارے میں کوئی خرابی سمجھ میں نہیں آتی۔ حتیٰ کہ بعض لوگوں نے یہاں تک کہہ دیا کہ مرد وعورت کے درمیان بدکاری میں کیا حرج ہے؟ اگر ایک مرد اور ایک عورت اس کام پر رضامند ہیں تو اس کام میں عقلی خرابی کیا ہے؟ اور عقلی اعتبار سے ہم کیسے کہہ سکتے ہیں کہ یہ بُرا کام ہے؟ اور اگر رضامندی کے ساتھ مرد وعورت نے یہ کام کرلیا تو تیسرے آدمی کو کیا اختیار ہے کہ اس کے اندر رُکاوٹ ڈالے؟ دیکھیے! اسی عقل کے بل بوتے پر بد سے بدتر بُرائی کو جائز اور صحیح قرار دیا گیا، اس لیے کہ جب عقل کو اس کے دائرۂ کار سے آگے بڑھایا تو یہ عقل اپنا جواب غلط دینے لگی۔ لہٰذا جب انسان عقل کو اس جگہ پر استعمال کرے گا جہاں پر اللہ تعالیٰ کی وحی آچکی ہے تو وہاں پر عقل غلط جواب دینے لگے گی اور غلط راستے پر لے جائے گی۔

اشتراکیت کی بنیاد عقل پر تھی

دیکھیے! روس کے اندر چوہتر (۷۴) سال تک اس عقل کی بنیاد پر اشتراکیت، سوشلزم اور کمیونزم کا بازار گرم رہا، اور پوری دنیا میں مساوات اور غریبوں کی ہمدردی کے نام پر شور مچایا گیا، کمیونزم اور اشتراکیت کا پوری دنیا میں ڈنکا بجتا رہا اور یہ کہہ دیا گیا کہ عنقریب ساری دنیا پر اس کی حکومت قائم ہوجائے گی

اور یہ سب کچھ عقل کی بنیاد پر تھا۔ اگر اس وقت کوئی شخص اس کے خلاف کوئی آواز اٹھاتا کہ یہ نظریہ غلط ہے تو اس کو سرمایہ داروں کا ایجنٹ کہا جاتا، جاگیرداروں کا ایجنٹ کہا جاتا، اس کو رجعت پسند کہا جاتا تھا، لیکن آج چوہتر سال کے بعد ساری دنیا اس کا تماشہ دیکھ رہی ہے، لینن جس کی پوجا کی جارہی تھی، اس کے بت خود اس کے ماننے والے گرا گرا کر توڑ رہے ہیں۔ جو نظریہ ''وحی الٰہی'' سے آزاد ہو کر صرف عقل کی بنیاد پر قائم کیا جاتا ہے اس کا یہی انجام ہوتا ہے۔

وحیِ الٰہی کے آگے سر جھکالو

اس لیے اللہ تعالیٰ فرما رہے ہیں کہ اگر زندگی ٹھیک گزارنی ہے تو اس کا راستہ صرف یہ ہے کہ جہاں اللہ کا اور اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا حکم آجائے اور وحیِ الٰہی کا پیغام آجائے وہاں انسان اپنے آپ کو اس کے تابع بنالے، اس کے آگے جھک جائے اور اس کے خلاف عقل کے گھوڑے نہ دوڑائے، چاہے بظاہر وہ عقل کے خلاف اور اپنی خواہشات کے خلاف اور مصلحت کے خلاف نظر آتا ہو۔ بس اللہ تعالیٰ کا حکم آجانے کے بعد اپنا سر اس کے آگے جھکادے۔ یہ ہے اسلام میں داخل ہونے کا مطلب، لہٰذا جو آیت میں نے تلاوت کی اس کے پہلے جملے کا مطلب یہ ہوا کہ اے ایمان والو! اسلام میں داخل ہوجاؤ، یعنی اپنے آپ کو اللہ اور اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حکم کے مکمل تابع کردو۔

پورے داخل ہونے کا مطلب

اس آیت کے دوسرے جملے میں ارشاد فرمایا کہ ''پورے کے پورے داخل

ہوجاؤ"یعنی یہ نہ ہوکہ ایمان، عقیدے اور عبادات کی حد تک تو اسلام میں داخل ہوگئے کہ کلمہ طیبہ پڑھ لیا، نماز پڑھ لی، روزہ رکھ لیا، زکوٰۃ دے دی، حج کرلیا، عبادتیں انجام دے دیں اور جب مسجد میں پہنچے تو مسلمان، لیکن جب بازار پہنچے، جب دفتر پہنچے یا گھر پہنچے تو وہاں مسلمان نہیں، حالانکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ "اسلام" محض عبادتوں کا نام نہیں کہ صرف عبادتیں انجام دے دیں تو مسلمان ہوگیا، بلکہ اپنی پوری زندگی کو اللہ تعالیٰ کے حکم کے تابع بنانے کا نام "اسلام" ہے، لہٰذا مسلمان وہ ہے جو بازار میں بھی مسلمان ہو، دفتر میں بھی مسلمان ہو، گھر میں بیوی بچوں کے ساتھ بھی مسلمان ہو، دوست احباب کے ساتھ بھی مسلمان ہو۔

اسلام کے پانچ حصے

اس دین اسلام کے اللہ تعالیٰ نے پانچ حصے بنائے ہیں، ان پانچوں حصوں پر دین مشتمل ہے:

① عقائد: یعنی عقیدہ درست ہونا چاہیے۔

② عبادات: یعنی نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ کی پابندی ہونی چاہیے۔

③ معاملات: یعنی خرید و فروخت کے معاملات اور بیع و شراء کے معاملات اللہ کے حکم کے مطابق ہوں، ناجائز اور حرام طریقے سے پیسے نہ کمائے۔

④ معاشرت: یعنی باہمی میل جول اور ایک دوسرے کے ساتھ اُٹھنے بیٹھنے اور زندگی گزارنے اور رہن سہن کے طریقوں میں اللہ تعالیٰ نے جو احکام دیے ہیں ان احکام کو انسان پورا کرے۔

(۵) اخلاق: یعنی اس کے باطنی اخلاق، جذبات اور خیالات درست ہوں۔

آج ہم مسجد میں مسلمان ہیں، لیکن جب بازار پہنچے تو لوگوں کو دھوکہ دے رہے ہیں، امانت میں خیانت کر رہے ہیں، دوسروں کو تکلیف پہنچا رہے ہیں، ان کی دل آزاری کر رہے ہیں۔ یہ تو اسلام میں پورا داخل ہونا نہ ہوا، اس لیے کہ اسلام کا ایک چوتھائی حصہ عبادات ہیں اور تین چوتھائی حصہ حقوق العباد سے متعلق ہے، لہٰذا جب تک انسان بندوں کے حقوق کا لحاظ نہیں رکھے گا، پورا اسلام میں داخل نہ ہوگا۔

ایک سبق آموز واقعہ

ایک مرتبہ حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سفر پر تھے، زادِ راہ جو ساتھ تھا وہ ختم ہوگیا، آپ نے دیکھا کہ جنگل میں بکریوں کا گلہ چَر رہا ہے اور اہلِ عرب کے اندر یہ رواج تھا کہ لوگ مسافروں کو راستے میں مہمان نوازی کے طور پر مفت دودھ پیش کر دیا کرتے تھے، چنانچہ آپ چَرواہے کے پاس گئے اور اس سے جا کر فرمایا کہ میں مسافر ہوں اور کھانے پینے کا سامان ختم ہوگیا ہے، تم ایک بکری کا دودھ نکال کر مجھے دے دو تاکہ میں پی لوں۔ چَرواہے نے کہا کہ آپ مسافر ہیں، میں آپ کو دودھ ضرور دے دیتا، لیکن مشکل یہ ہے کہ یہ بکریاں میری نہیں ہیں، ان کا مالک دوسرا شخص ہے اور ان کے چَرانے کی خدمت میرے سپرد ہے۔ اس لیے یہ بکریاں میرے پاس امانت ہیں اور ان کا دودھ بھی امانت ہے، لہٰذا شرعی اعتبار سے میرے لیے ان کا دودھ آپ کو دینا جائز نہیں ہے۔ اس کے بعد حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے اس کا امتحان لینا چاہا اور اس سے فرمایا کہ دیکھو

بھائی! میں تمہیں ایک فائدے کی بات بتاتا ہوں جس میں تمہارا بھی فائدہ ہے اور میرا بھی فائدہ ہے، وہ یہ کہ تم ایسا کرو کہ ان میں سے ایک بکری مجھے فروخت کردو اور اس کی قیمت مجھ سے لے لو، اس میں تمہارا فائدہ یہ ہے کہ تمہیں پیسے مل جائیں گے اور میرا فائدہ یہ ہوگا کہ مجھے بکری مل جائے گی، راستے میں اس کا دودھ استعمال کرتا رہوں گا۔ رہا مالک! تو مالک سے کہہ دینا کہ ایک بکری بھیڑیا کھا گیا اور اس کو تمہاری بات پر یقین بھی آجائے گا کیونکہ جنگل میں بھیڑیے بکریاں کھاتے رہتے ہیں۔ اس طرح ہم دونوں کا کام بن جائے گا۔ جب چرواہے نے یہ تدبیر سنی تو فوراً اس نے جواب میں کہا: ''یاھذا! فاین اللہ؟'' اے بھائی! اگر میں یہ کام کرلوں تو اللہ کہاں گیا؟ یعنی یہ کام میں یہاں تو کرلوں گا اور مالک کو بھی جواب دے دوں گا، وہ بھی شاید مطمئن ہوجائے گا لیکن اُس مالک کا بھی ایک اور مالک ہے، اس کے پاس جاکر کیا جواب دوں گا؟ اس لیے میں یہ کام کرنے کے لیے تیار نہیں۔ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے مدینہ پہنچ کر اس غلام اور بکریوں کو ان کے مالک سے خریدا اور غلام کو آزاد کرکے ساری بکریاں اسے ہبہ کردیں، کیونکہ اس چرواہے نے اپنے مالک کے ساتھ خیانت نہیں کی اور اسے اللہ تعالیٰ کا استحضار رہا۔(۱)

اس لیے کہ جب تک دل میں اللہ کا خوف، آخرت کی فکر، اللہ کے سامنے کھڑے ہونے کا احساس موجود رہے گا اس وقت تک جرائم اور مظالم چل نہیں سکیں گے۔ یہ ہے اسلام میں پورا کا پورا داخل ہونا۔ جنگل کی تنہائی میں بھی اس کو

(۱) قصر الامل لابن ابی الدنیا ص۱۲۷(۱۸۷) طبع دار ابن حزم بیروت، وشعب الایمان للبیہقی ۲۳۳/۷ (۴۹۰۸) طبع الرشد، ومشیخة قاضی مارستان ۱۲۴۶/۳ (۶۲۷) طبع دار عالم الفوائد۔

یہ فکر ہے کہ میرا کوئی کام اللہ کی مرضی کے خلاف نہ ہو۔

یہ دین کا لازمی حصہ ہے جس کے بغیر مسلمان، مسلمان نہیں ہو سکتا۔ حدیث میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

"لا ایمان لمن لا امانة له"(۱)

جس کے دل میں امانت نہیں اس کا ایمان نہیں۔

۵ ایک چرواہے کا عجیب واقعہ

غزوۂ خیبر کے موقع پر ایک چرواہا حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں آیا، وہ یہودیوں کی بکریاں چرایا کرتا تھا، اس چرواہے نے جب دیکھا کہ خیبر سے باہر مسلمانوں کا لشکر پڑاؤ ڈالے ہوئے ہے تو اس کے دل میں خیال آیا کہ میں جا کر ان سے ملاقات کروں اور دیکھوں کہ یہ مسلمان کیا کہتے ہیں اور کیا کرتے ہیں؟ چنانچہ بکریاں چراتا ہوا مسلمانوں کے لشکر میں پہنچا اور ان سے پوچھا کہ "تمہارے سردار کہاں ہیں؟" صحابہ کرام نے اس کو بتایا کہ ہمارے سردار محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس خیمے کے اندر ہیں۔ پہلے تو اس چرواہے کو ان کی باتوں پر یقین نہیں آیا، اس نے سوچا کہ اتنے بڑے سردار ایک معمولی سے خیمے میں کیسے بیٹھ سکتے ہیں۔ اس کے ذہن میں یہ تھا کہ جب آپ اتنے بڑے بادشاہ ہیں تو بہت ہی

(۱) مسند احمد ۳۷۵/۱۹ (۱۲۳۸۳) ومسند عبد بن حمید ص ۲۳۰ (۱۱۹۶) طبع مكتبة السنة القاهرة. ومسند أبي يعلى ۲٤٦/٥ (۲۸٦۳) طبع دار المأمون وقال الهيثمي في "مجمع الزوائد" ۹٦/۱ (۳٤۱): رواه أحمد وأبو يعلى والبزار والطبراني في الأوسط، وفيه أبو هلال وثقه ابن معين وغيره، وضعفه النسائي وغيره (طبع مكتبة القدسي القاهرة).

شان و شوکت اور ٹھاٹ باٹھ کے ساتھ رہتے ہوں گے، لیکن وہاں تو کھجور کے پتوں کی چٹائی سے بنا ہوا خیمہ تھا۔ خیر وہ اس خیمے کے اندر آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے ملاقات کے لیے داخل ہوگیا اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ملاقات کی اور پوچھا کہ "آپ کیا پیغام لے کر آئے ہیں؟ اور کس بات کی دعوت دیتے ہیں؟" حضورِ اقدس سرورِ دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس کے سامنے اسلام اور ایمان کی دعوت رکھی اور اسلام کا پیغام دیا۔ اس نے پوچھا کہ "اگر میں اسلام کی دعوت قبول کرلوں تو میرا کیا انجام ہوگا؟ اور کیا رُتبہ ہوگا؟" حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ

"اسلام لانے کے بعد تم ہمارے بھائی بن جاؤ گے اور ہم تمہیں گلے سے لگائیں گے۔"

اس چرواہے نے کہا کہ "آپ مجھ سے مذاق کرتے ہیں، میں کہاں اور آپ کہاں! میں ایک معمولی سا چرواہا اور میں ایک سیاہ فام انسان ہوں، میرے بدن سے بدبو آرہی ہے، ایسی حالت میں آپ مجھے کیسے گلے سے لگائیں گے؟" حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ

"ہم تمہیں ضرور گلے سے لگائیں گے اور تمہارے جسم کی سیاہی کو اللہ تعالیٰ تابانی میں بدل دیں گے اور اللہ تعالیٰ تمہارے جسم سے اُٹھنے والی بدبو کو خوشبو سے تبدیل کردیں گے۔"

یہ باتیں سن کر وہ فوراً مسلمان ہوگیا اور کلمہ شہادت:

"اشہد ان لا الہ الا اللہ و اشہد ان محمدا رسول اللہ"

پڑھ لیا۔ پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ یارسول اللہ! اب میں کیا کروں؟

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ

''تم ایسے وقت میں اسلام لائے ہو کہ نہ تو اس وقت کسی نماز کا وقت ہے کہ تم سے نماز پڑھواؤں اور نہ ہی روزہ کا زمانہ ہے کہ تم سے روزے رکھواؤں اور زکوٰۃ تم پر فرض نہیں ہے، اس وقت تو صرف ایک ہی عبادت ہو رہی ہے جو تلوار کی چھاؤں میں انجام دی جاتی ہے وہ ہے جہاد فی سبیل اللہ۔''

اس چرواہے نے کہا کہ یارسول اللہ! میں اس جہاد میں شامل ہو جاتا ہوں، لیکن جو شخص جہاد میں شامل ہوتا ہے اس کے لیے دو میں ایک صورت ہوتی ہے یا غازی یا شہید۔ تو اگر میں اس جہاد میں شہید ہو جاؤں تو آپ میری کوئی ضمانت لیجیے۔ حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ

''میں اس بات کی ضمانت لیتا ہوں کہ اگر تم اس جہاد میں شہید ہو گئے تو اللہ تعالیٰ تمہیں جنت میں پہنچا دیں گے اور تمہارے جسم کی بدبو کو خوشبو سے تبدیل فرما دیں گے اور تمہارے چہرے کی سیاہی کو سفیدی میں تبدیل فرما دیں گے۔''

بکریاں واپس کر کے آؤ

چونکہ وہ چرواہا یہودیوں کی بکریاں چراتا ہوا وہاں پہنچا تھا اس لیے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ

''تم یہودیوں کی جو بکریاں لے کر آئے ہو، ان کو جا کر واپس کرو، اس لیے کہ یہ بکریاں تمہارے پاس امانت ہیں۔''

اس سے اندازہ لگائیں کہ جن لوگوں کے ساتھ جنگ ہو رہی ہے، جن کا محاصرہ کیا ہوا ہے، ان کا مال، مالِ غنیمت ہے، لیکن چونکہ وہ چرواہا بکریاں معاہدے پر لے کر آیا تھا، اس لیے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حکم دیا کہ پہلے وہ بکریاں واپس کر کے آؤ، پھر آ کر جہاد میں شامل ہونا۔ چنانچہ اس چرواہے نے جا کر بکریاں واپس کیں اور واپس آ کر جہاد میں شامل ہوا اور شہید ہو گیا۔ اس کا نام ہے ''اسلام''۔ (۱)

حضرت حذیفہ بن یمان رضی اللہ عنہ

حضرت حذیفہ بن یمان رضی اللہ عنہ مشہور صحابی ہیں اور حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے راز دار ہیں۔ جب یہ اور ان کے والد حضرت یمان رضی اللہ عنہ مسلمان ہوئے تو مسلمان ہونے کے بعد حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں مدینہ طیبہ آ رہے تھے، راستے میں ان کی ملاقات ابوجہل اور اس کے لشکر سے ہو گئی، اس وقت ابوجہل اپنے لشکر کے ساتھ حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے لڑنے کے لیے جا رہا تھا۔ جب حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ کی ملاقات ابوجہل سے ہوئی تو اس نے پکڑ لیا اور پوچھا کہ کہاں جا رہے ہو؟ انہوں نے بتایا کہ ہم حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں مدینہ طیبہ جا رہے ہیں۔ ابوجہل نے کہا کہ پھر تو ہم تمہیں نہیں چھوڑیں گے، اس لیے کہ تم مدینہ جا کر

---

(۱) دلائل النبوۃ للبیہقی ۲۲۰/٤ باب ما جاء فی قصۃ العبد الاسود الذی اسلم یوم خیبر۔

ہمارے خلاف جنگ میں حصہ لوگے۔ انہوں نے کہا ہمارا مقصد تو صرف حضور اقدس ﷺ کی ملاقات اور زیارت ہے ہم جنگ میں حصہ نہیں لیں گے۔ ابوجہل نے کہا کہ اچھا ہم سے وعدہ کرو کہ وہاں جاکر صرف ملاقات کروگے، لیکن جنگ میں حصہ نہیں لوگے، انہوں نے وعدہ کرلیا، چنانچہ ابوجہل نے آپ کو چھوڑ دیا۔ آپ جب مدینہ منورہ پہنچے تو اس وقت حضورِ اقدس ﷺ اپنے صحابہ کرام کے ساتھ غزوۂ بدر کے لیے مدینہ منورہ سے روانہ ہوچکے تھے، لہٰذا ان کی راستے میں حضور ﷺ سے ملاقات ہوگئی۔

حق و باطل کا پہلا معرکہ ''غزوۂ بدر''

اب اندازہ لگایئے! اسلام کا پہلا حق و باطل کا معرکہ (غزوۂ بدر) ہورہا ہے اور یہ وہ معرکہ ہے جس کو قرآن کریم نے ''یوم الفرقان'' فرمایا[۱] یعنی حق و باطل کے درمیان فیصلہ کردینے والا معرکہ، یہ وہ معرکہ ہورہا ہے جس میں جو شخص شامل ہوگیا وہ ''بدری'' کہلایا اور صحابہ کرام میں ''بدری'' صحابہ کا بہت اونچا مقام ہے اور ''اسمائے بدریین'' بطور وظیفے کے پڑھے جاتے ہیں۔ ان کے نام پڑھنے سے اللہ تعالیٰ دعائیں قبول فرماتے ہیں۔ وہ ''بدریین'' ہیں جن کے بارے میں نبی کریم ﷺ نے یہ پیشین گوئی فرمادی کہ اللہ تعالیٰ نے سارے اہلِ بدر کی جنہوں نے بدر کی لڑائی میں حصہ لیا، بخشش فرمادی ہے[۲]، ایسا معرکہ ہونے والا ہے۔

(۱) سورۃ الانفال آیت (۴۱)۔
(۲) صحیح البخاری ۷۷/۵ (۳۹۸۳)۔

گردن پر تلوار رکھ کر لیا جانے والا وعدہ

بہر حال! جب حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ملاقات ہوئی تو حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ نے سارا قصہ سنا دیا کہ اس طرح راستے میں ہمیں ابوجہل نے پکڑ لیا تھا اور ہم نے یہ وعدہ کر کے بمشکل جان چھڑوائی کہ ہم لڑائی میں حصہ نہیں لیں گے اور پھر درخواست کی کہ یا رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)! یہ بدر کا معرکہ ہونے والا ہے، آپ اس میں تشریف لے جا رہے ہیں، ہماری بڑی خواہش ہے کہ ہم بھی اس میں شریک ہو جائیں اور جہاں تک اس وعدے کا تعلق ہے وہ تو انہوں نے ہماری گردن پر تلوار رکھ کر ہم سے یہ وعدہ لیا تھا کہ ہم جنگ میں حصہ نہیں لیں گے، اگر ہم وعدہ نہ کرتے تو وہ ہمیں نہ چھوڑتے، اس لیے ہم نے وعدہ کر لیا، لہٰذا آپ ہمیں اجازت دے دیں کہ ہم اس جنگ میں حصہ لے لیں اور فضیلت اور سعادت ہمیں حاصل ہو جائے[1]۔

تم وعدہ کر کے زبان دے کر آئے ہو

لیکن سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جواب میں فرمایا کہ نہیں، تم وعدہ کر کے آئے ہو اور زبان دے کر آئے ہو اور اسی شرط پر تمہیں رہا کیا گیا ہے کہ تم وہاں جا کر محمد رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی زیارت کرو گے، لیکن ان کے ساتھ جنگ میں حصہ نہیں لو گے، اس لیے میں تم کو جنگ میں حصہ لینے کی اجازت نہیں دیتا۔

یہ وہ مواقع ہیں جہاں انسان کا امتحان ہوتا ہے کہ وہ اپنی زبان اور اپنے وعدے کا کتنا پاس کرتا ہے۔ اگر ہم جیسا آدمی ہوتا تو ہزار تاویلیں کر لیتا، مثلاً یہ

(۱) صحیح مسلم ۳/۱٤۱٤ (۱۷۸۷) و مسند احمد ۳۸/۳۷۷ (۲۳۳۵٤)۔

تاویل کرلیتا کہ ان کے ساتھ جو وعدہ کیا تھا وہ سچے دل سے تو نہیں کیا تھا، وہ تو ہم سے زبردستی لیا گیا تھا اور خدا جانے کیا کیا تاویلیں ہمارے ذہنوں میں آجاتیں یا یہ تاویل کرلیتا کہ یہ حالتِ عذر ہے، اس لیے حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ جہاد میں شامل ہونا ہے اور کفر کا مقابلہ کرنا ہے۔ جب کہ وہاں ایک ایک آدمی کی بڑی قیمت ہے، کیونکہ مسلمانوں کے لشکر میں صرف ۳۱۳ نہتے افراد ہیں، جن کے پاس صرف ۷۰ اونٹ، ۲ گھوڑے اور ۸ تلواریں ہیں۔ باقی افراد میں سے کسی نے لاٹھی اُٹھائی ہے، کسی نے ڈنڈے اور کسی نے پتھر اُٹھالیے ہیں۔ یہ لشکر ایک ہزار مسلح سورماؤں کا مقابلہ کرنے کے لیے جارہا ہے، اس لیے ایک ایک آدمی کی جان قیمتی ہے۔ لیکن محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو بات کہہ دی گئی ہے اور جو وعدہ کرلیا گیا ہے اس وعدہ کی خلاف ورزی نہیں ہوگی۔ اس کا نام ہے ''اسلام''۔

جہاد کا مقصد حق کی سربلندی

اس لیے کہ یہ جہاد کوئی ملک حاصل کرنے کے لیے نہیں ہورہا تھا، کوئی اقتدار حاصل کرنے کے لیے نہیں ہورہا تھا، بلکہ یہ جہاد حق کی سربلندی کے لیے ہورہا تھا اور حق کو پامال کرکے جہاد کیا جائے یا گناہ کا ارتکاب کرکے اللہ تعالیٰ کے دین کا کام کیا جائے؟ یہ نہیں ہوسکتا۔ آج ہم لوگوں کی یہ ساری کوششیں بے کار جارہی ہیں اور ساری کوششیں بے اثر ہورہی ہیں، اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم یہ چاہتے ہیں کہ گناہ کرکے اسلام کی تبلیغ کریں، گناہ کرکے اسلام کو نافذ کریں، ہمارے دل و دماغ پر ہر وقت ہزاروں تاویلیں مسلط رہتی ہیں، چنانچہ کہا جاتا ہے کہ اس وقت مصلحت کا یہ تقاضا ہے، چلو، شریعت کے اس حکم کو نظر انداز

کردو اور یہ کہا جاتا ہے کہ اس وقت مصلحت اس کام کے کرنے میں ہے، چلو یہ کام کرلو۔

یہ ہے وعدہ کا ایفاء

لیکن وہاں تو ایک ہی مقصود تھا، یعنی اللہ تعالیٰ کی رضا حاصل ہونا، نہ مال مقصود ہے، نہ فتح مقصود ہے، نہ بہادر کہلانا مقصود ہے، بلکہ مقصود یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ راضی ہوجائے اور اللہ تعالیٰ کی رضا اس میں ہے کہ جو وعدہ کرلیا گیا ہے اس کو نبھاؤ۔ چنانچہ حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ اور ان کے والد حضرت یمان رضی اللہ عنہ دونوں کو غزوۂ بدر جیسی فضیلت سے محروم رکھا گیا، اس لیے کہ یہ دونوں جنگ میں شرکت نہ کرنے پر زبان دے کر آئے تھے۔ یہ ہے ''اسلام'' جس کے بارے میں فرمایا کہ اس اسلام میں پورے کے پورے داخل ہوجاؤ۔

حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ

حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ ان صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں سے ہیں جن کے بارے میں لوگوں نے معلوم نہیں کیا کیا غلط قسم کے پروپیگنڈے کیے ہیں، اللہ تبارک وتعالیٰ بچائے ۔آمین۔ لوگ ان کی شان میں گستاخیاں کرتے رہتے ہیں۔ ان کا ایک قصہ سن لیجیے۔

فتح حاصل کرنے کے لیے جنگی تدبیر

حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ چونکہ شام میں تھے، اس لیے روم کی حکومت سے ان کی ہر وقت جنگ رہتی تھی، ان کے ساتھ برسرپیکار رہتے تھے۔ روم اس وقت کی

سپر پاور سمجھی جاتی تھی اور بڑی عظیم الشان عالمی طاقت تھی۔ ایک مرتبہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے ان کے ساتھ جنگ بندی کا معاہدہ کرلیا اور ایک تاریخ متعین کرلی کہ اس تاریخ تک ہم ایک دوسرے سے جنگ نہیں کریں گے، ابھی جنگ بندی کے معاہدے کی مدت ختم نہیں ہوئی تھی، اس وقت حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے دل میں خیال آیا کہ جنگ بندی کی مدت تو درست ہے، لیکن اس مدت کے اندر میں اپنی فوجیں رومیوں کی سرحد پر لے جاکر ڈال دوں، تاکہ جس وقت جنگ بندی کی مدت ختم ہو، اس وقت میں فوراً حملہ کردوں، اس لیے کہ دشمن کے ذہن میں تو یہ ہوگا کہ جب جنگ بندی کی مدت ختم ہوگی، پھر کہیں جاکر لشکر روانہ ہوگا اور یہاں آنے میں وقت لگے گا، اس لیے معاہدے کی مدت ختم ہوتے ہی فوراً مسلمانوں کا لشکر حملہ آور نہیں ہوگا، لہٰذا وہ اس حملے کے لیے تیار نہیں ہوں گے۔ اس لیے اگر میں اپنا لشکر سرحد پر ڈال دوں اور مدت ختم ہوتے ہی فوراً حملہ کردوں تو جلدی فتح حاصل ہوجائے گی۔

یہ معاہدے کی خلاف ورزی ہے

چنانچہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے اپنی فوجیں سرحد پر ڈال دیں اور فوج کا کچھ حصہ سرحد کے اندر ان کے علاقے میں ڈال دیا اور حملے کے لیے تیار ہوگئے اور جیسے ہی جنگ بندی کے معاہدے کی آخری تاریخ کا سورج غروب ہوا، فوراً حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے لشکر کو پیش قدمی کا حکم دے دیا، چنانچہ جب لشکر نے پیش قدمی کی تو یہ چال بڑی کامیاب ثابت ہوئی۔ اس لیے کہ وہ لوگ اس حملے کے لیے تیار نہیں تھے اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کا لشکر شہر کے شہر، بستیاں کی بستیاں فتح کرتا ہوا چلا جارہا تھا، اب فتح کے نشے کے اندر پورا لشکر آگے بڑھتا

جا رہا تھا کہ اچانک دیکھا کہ پیچھے سے ایک گھڑ سوار دوڑتا چلا آ رہا ہے اس کو دیکھ کر حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ اس کے انتظار میں رُک گئے کہ شاید یہ امیر المومنین کا کوئی نیا پیغام لے کر آیا ہو، جب وہ گھڑ سوار قریب آیا تو اس نے آوازیں دینا شروع کردیں۔

"اللہ اکبر، اللہ اکبر، قفوا عباد اللہ قفوا عباد اللہ"

اللہ کے بندو ٹھہر جاؤ، اللہ کے بندو ٹھہر جاؤ۔

جب وہ اور قریب آیا تو حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے دیکھا کہ وہ حضرت عمرو بن عبسہ رضی اللہ عنہ ہیں۔ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے پوچھا کہ کیا بات ہے؟ انہوں نے فرمایا کہ

"وفاء لا غدر، وفاء لا غدر"

مؤمن کا شیوہ وفاداری ہے، غداری نہیں ہے، عہد شکنی نہیں ہے۔

حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ میں نے تو کوئی عہد شکنی نہیں کی ہے، میں نے اس وقت حملہ کیا ہے جب جنگ بندی کی مدت ختم ہوگئی تھی۔ حضرت عمرو بن عبسہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا اگرچہ جنگ بندی کی مدت ختم ہوگئی تھی لیکن آپ نے اپنی فوجیں جنگ بندی کی مدت کے دوران ہی سرحد پر ڈال دی تھیں اور فوج کا کچھ حصہ سرحد کے اندر بھی داخل کردیا تھا اور یہ جنگ بندی کے معاہدے کی خلاف ورزی تھی۔ اور میں نے اپنے ان کانوں سے حضورِ اقدس سرورِ دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ

"من كان بينه و بين قوم عهد فلا يحلن عهدا و لا يشدنه حتى يمضي امده او ينبذ اليهم على سواء."(۱)

یعنی جب تمہارا کسی قوم کے ساتھ معاہدہ ہوتو اس وقت تک عہد نہ کھولے اور نہ باندھے جب تک کہ اس کی مدت نہ گزر جائے یا ان کے سامنے پہلے کھلم کھلا یہ اعلان نہ کردے کہ ہم نے وہ عہد ختم کردیا۔ مدت گزرنے سے پہلے یا عہد کے ختم کرنے کا اعلان کیے بغیر ان کے علاقے کے پاس جاکر فوجوں کو ڈال دینا حضورِ اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ وسلم کے اس ارشاد کے مطابق آپ کے لیے جائز نہیں تھا۔

سارا مفتوحہ علاقہ واپس کردیا

اب آپ اندازہ لگائیے کہ ایک فاتح لشکر ہے، جو دشمن کا علاقہ فتح کرتا ہوا جارہا ہے اور بہت بڑا علاقہ فتح کرچکا ہے اور فتح کے نشے میں چُور ہے، لیکن جب حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ وسلم کا یہ ارشاد کان میں پڑا کہ اپنے عہد کی پابندی مسلمان کے ذمے لازم ہے۔ اسی وقت حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے حکم دیا کہ جتنا علاقہ فتح کیا ہے وہ سب واپس کردو، چنانچہ پورا علاقہ واپس کردیا اور اپنی سرحد میں دوبارہ واپس آگئے۔ پوری دنیا کی تاریخ میں کوئی قوم اس کی نظیر پیش نہیں کرسکتی کہ اس نے صرف عہد شکنی کی بناء پر اپنا مفتوحہ علاقہ اس طرح واپس کردیا ہو، لیکن یہاں پر چونکہ کوئی زمین کا حصہ پیش نظر نہیں تھا، کوئی اقتدار اور سلطنت مقصود نہیں تھی، بلکہ مقصود اللہ تعالیٰ کو راضی کرنا تھا، اس لیے جب اللہ تعالیٰ کا حکم معلوم ہوگیا کہ

(۱) سنن الترمذی ۲۳۷/۳ (۱۵۸۰) وقال هذا حديث حسن صحيح (طبع دار الغرب الاسلامی) وسنن ابی داود ۸۳/۳ (۲۷۵۹) طبع المكتبة العصرية صيدا۔

وعدہ کی خلاف ورزی درست نہیں ہے اور چونکہ یہاں وعدہ کی خلاف ورزی کا تھوڑا سا شائبہ پیدا ہو رہا تھا اس لیے واپس لوٹ گئے۔ یہ ہے "اسلام" جس کے بارے میں حکم دیا گیا کہ

"اُدْخُلُوا فِي السِّلْمِ كَآفَّةً"(۱)

کہ پورے کے پورے اسلام میں داخل ہو جاؤ۔

حضرت فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ اور معاہدہ

حضرت فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ نے جب بیت المقدس فتح کیا تو اس وقت وہاں پر جو عیسائی اور یہودی تھے ان سے یہ معاہدہ ہوا کہ ہم تمہاری حفاظت کریں گے، تمہارے جان و مال کی حفاظت کریں گے اور اس کے معاوضے میں تم ہمیں "جزیہ" ادا کرو گے۔ "جزیہ" ایک ٹیکس ہوتا ہے جو غیر مسلموں سے وصول کیا جاتا ہے۔ چنانچہ جب معاہدہ ہو گیا تو وہ لوگ ہر سال جزیہ ادا کرتے تھے۔ ایک مرتبہ ایسا ہوا کہ مسلمانوں کا دوسرے دشمنوں کے ساتھ معرکہ پیش آ گیا، جس کے نتیجے میں وہ فوج جو بیت المقدس میں متعین تھی ان کی ضرورت پیش آئی۔ کسی نے یہ مشورہ دیا کہ اگر فوج کی کمی ہے تو بیت المقدس میں فوجیں بہت زیادہ ہیں، اس لیے وہاں سے ان کو محاذ پر بھیج دیا جائے۔ حضرت فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ یہ مشورہ اور تجویز بہت اچھی ہے، لہٰذا فوجیں وہاں سے اُٹھا کر محاذ پر بھیج دو، لیکن اس کے ساتھ ایک کام اور بھی کرو، وہ یہ کہ بیت المقدس کے جتنے بھی عیسائی اور یہودی ہیں، ان سب کو ایک جگہ جمع کرو اور ان سے کہو کہ ہم نے آپ کی جان

(۱) سورۃ البقرۃ آیت (۲۰۸)۔

و مال کی حفاظت کا ذمہ لیا تھا اور یہ معاہدہ بھی کیا تھا کہ آپ کے جان و مال کی حفاظت کریں گے اور اس کام کے لیے ہم نے وہاں فوج ڈالی ہوئی تھی، لیکن اب ہمیں دوسری جگہ فوج کی ضرورت پیش آ گئی ہے، اس لیے ہم آپ کی حفاظت نہیں کر سکتے، لہٰذا اس سال آپ نے ہمیں جو جزیہ بطور ٹیکس ادا کیا ہے وہ ہم آپ کو واپس کر رہے ہیں اور اس کے بعد ہم اپنی فوجوں کو یہاں سے لے جائیں گے اور اب آپ لوگ اپنی حفاظت کا انتظام خود کریں[1]۔

یہ ہے ''اسلام''۔ یہ نہیں کہ صرف نماز پڑھ لی، روزہ رکھ لیا اور بس مسلمان ہو گئے، بلکہ جب تک اپنا پورا وجود، اپنی زبان، اپنی آنکھ، اپنے کان، اپنی زندگی کا طرزِ عمل پورا کا پورا اللہ کی مرضی کے مطابق نہیں ہوگا اس وقت تک کامل مسلمان نہیں ہوں گے۔

دوسروں کو تکلیف پہنچانا اسلام کے خلاف ہے

جنابِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ فرمادیا کہ ''مسلمان وہ ہے جس کے ہاتھ اور زبان سے دوسرے مسلمان محفوظ رہیں''[2] اور دوسرے مسلمان کو تکلیف پہنچانا گناہِ کبیرہ ہے اور حرام ہے اور یہ ایسا ہی بڑا گناہ ہے جیسے شراب پینا گناہ ہے۔ جیسے بدکاری کرنا گناہ ہے، جیسے سور کھانا گناہ ہے اور تکلیف پہنچانے کے جتنے راستے ہیں وہ سب گناہِ کبیرہ ہیں۔ ایک مسلمان کا فرض یہ ہے کہ اپنی ذات سے کسی دوسرے کو تکلیف نہ پہنچائے۔ مثلاً آپ گاڑی لے کر جا رہے ہیں اور

---

(۱) فتوح البلدان للبلاذری ص ۱۳۹ طبع مکتبۃ الہلال بیروت۔
(۲) صحیح البخاری ۱/۱۱ (۱۰) و ۸/۱۰۲ (٦٤٨٤)۔

کسی جگہ جاکر گاڑی کھڑی کرنے کی ضرورت پیش آئی تو آپ نے ایسی جگہ جاکر گاڑی کھڑی کردی جو دوسرے لوگوں کے لیے گزرنے کی جگہ تھی، آپ کے گاڑی کھڑی کرنے کی وجہ سے دوسرے لوگوں کو گزرنا مشکل ہوگیا، اب آپ تو یہ سمجھ رہے ہیں کہ ہم نے زیادہ سے زیادہ ٹریفک قانون کی خلاف ورزی کی ہے آپ اس کو دین کی خلاف ورزی اور گناہ نہیں سمجھتے حالانکہ یہ صرف بداخلاقی کی بات نہیں بلکہ گناہِ کبیرہ ہے۔ ایسا ہی گناہ ہے جیسے شراب پینا گناہ ہے۔ اس لیے کہ حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمادیا کہ مسلمان وہ ہے جس کے ہاتھ اور زبان سے یعنی اس کے پورے وجود سے دوسرے انسان محفوظ رہیں، ان کو تکلیف نہ پہنچے۔ آپ نے اپنی گاڑی غلط جگہ پارک کرکے دوسروں کو تکلیف پہنچائی۔ آج ہم نے دین اسلام کو عبادت کی حد تک اور نماز روزے کی حد تک اور مسجد کی حد تک اور وظائف وتسبیحات کی حد تک محدود کرلیا ہے اور بندوں کے جو حقوق اللہ تعالیٰ نے مقرر فرمائے ہیں ان کو ہم نے دین سے بالکل خارج کردیا۔

حقیقی مفلس کون؟

حدیث شریف میں ہے کہ ایک مرتبہ حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے پوچھا کہ "بتاؤ مفلس کون ہے؟" صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے عرض کیا یارسول اللہ! ہم لوگ تو اس شخص کو مفلس سمجھتے ہیں جس کے پاس روپیہ پیسہ نہ ہو۔ حضورِ اقدس سرورِ دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا کہ حقیقی مفلس وہ نہیں جس کے پاس روپیہ پیسہ نہ ہو، بلکہ حقیقی مفلس وہ ہے جو قیامت کے دن اللہ تعالیٰ کے سامنے جب حاضر ہوگا تو اس طرح حاضر ہوگا کہ اس کے اعمال نامے میں بہت سارے روزے ہوں گے، بہت سی نمازیں اور وظیفے ہوں گے، تسبیحات اور

نوافل کا ڈھیر ہوگا، لیکن دوسری طرف کسی کا مال کھایا ہوگا، کسی کو دھوکہ دیا ہوگا، کسی کی دل آزاری کی ہوگی، کسی کو تکلیف پہنچائی ہوگی اور اس طرح اس نے بہت سے انسانوں کے حقوق غصب کیے ہوں گے۔ اب اصحابِ حقوق اللہ تعالیٰ سے فریاد کریں گے کہ یااللہ! اس شخص نے ہمارا حق غصب کیا تھا اس سے ہمارا حق دلوایئے۔ اب وہاں پر روپے پیسے تو چلیں گے نہیں کہ ان کو دے کر حساب کتاب برابر کرلیا جائے، وہاں کی کرنسی تو نیکیاں ہیں، چنانچہ صاحبِ حقوق کو اس کی نیکیاں دینی شروع کی جائیں گی، کسی کو نماز دے دی جائے گی، کسی کو روزے دے دیئے جائیں گے، اس طرح ایک ایک صاحبِ حق اس کی نیکیاں لے کر چلتا جائے گا یہاں تک کہ اس کی ساری نیکیاں ختم ہوجائیں گی اور یہ شخص خالی ہاتھ رہ جائے گا، نماز روزے کے جتنے ڈھیر لایا تھا، وہ سب ختم ہوجائیں گے، لیکن حق والے اب بھی باقی رہ جائیں گے۔ تو اب اللہ تعالیٰ حکم فرمائیں گے کہ اب حق دلوانے کا طریقہ یہ ہے کہ صاحبِ حق کے اعمال میں جو گناہ ہیں وہ اس شخص کے نامۂ اعمال میں ڈال دیے جائیں، چنانچہ وہ شخص نیکیوں کے انبار لے کر آیا تھا، لیکن بعد میں نیکیاں تو ساری ختم ہوجائیں گی اور دوسرے لوگوں کے گناہوں کے انبار لے کر واپس جائے گا یہ شخص حقیقی مفلس ہے۔[1]

آج ہم پورے اسلام میں داخل نہیں

اس سے اندازہ لگائیں کہ حقوق العباد کا معاملہ کتنا سنگین ہے، لیکن ہم لوگوں نے اس کو دین سے بالکل خارج کردیا ہے۔ قرآنِ کریم تو کہہ رہا ہے کہ

(۱) صحیح مسلم ۱۹۹۷/٤ (۲۵۸۱) وسنن الترمذی ۲۱۷/٤ (۲٤۱۸)۔

اے ایمان والو! اسلام میں داخل ہوجاؤ، آدھے نہیں، بلکہ پورے کے پورے داخل ہوجاؤ۔ تمہارا وجود، تمہاری زندگی، تمہاری عبادت، تمہارے معاملات، تمہاری معاشرت، تمہارے اخلاق ہر چیز اسلام کے اندر داخل ہونی چاہیے۔ اس کے ذریعے تم صحیح معنی میں مسلمان بن سکتے ہو۔ یہی وہ چیز تھی جس کے ذریعے درحقیقت اسلام پھیلا ہے۔ اسلام محض تبلیغ سے نہیں پھیلا، بلکہ انسانوں کی سیرت اور کردار سے پھیلا ہے، مسلمان جہاں بھی گئے انہوں نے اپنی سیرت اور کردار کا لوہا منوایا، اس سے اسلام کی طرف رغبت اور کشش پیدا ہوئی۔ آج ہماری سیرت اور کردار دیکھ کر لوگ اسلام سے متنفر ہو رہے ہیں۔

پورے داخل ہونے کا عزم کریں

آج ہم لوگ جو دین کی باتیں سننے کے لیے اس محفل میں جمع ہوئے ہیں اس سے کچھ فائدہ اُٹھائیں اور وہ فائدہ یہ ہے کہ ہم یہ عزم کریں کہ اپنی زندگی میں اسلام کو داخل کریں گے، زندگی کے ہر شعبے میں اسلام کو داخل کریں گے، عبادات بھی، معاملات بھی، معاشرت بھی، اخلاق بھی، ہر چیز اسلام کے مطابق بنانے کی کوشش کریں گے۔

دین کی معلومات حاصل کریں

ایک گزارش آپ حضرات سے یہ کرتا ہوں کہ چوبیس گھنٹوں میں سے کچھ وقت دین کی معلومات حاصل کرنے کے لیے نکال لیں، مستند کتابیں چھپی ہوئی ہیں، ان کو اپنے گھروں کے اندر پڑھنے کا معمول بنائیں، جس کے ذریعے دینی تعلیمات سے واقفیت ہو۔ آج مصیبت یہ ہے کہ ہم لوگ دین کی تعلیمات سے

واقف نہیں۔ اگر ہم یہ فائدہ حاصل کر سکیں اور اس کے ذریعے ہمارے دلوں میں دین پر چلنے کا جذبہ پیدا ہو جائے تو ان شاء اللہ یہ مجلس مفید ہوگی ورنہ کہنے سننے کی مجلسیں تو بہت ہوتی رہتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ اپنی رحمت سے مجھے بھی اور آپ سب کو بھی ان باتوں پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

وَاٰخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ
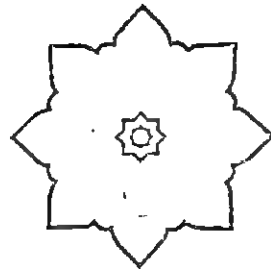
کلمۂ طیبہ کے تقاضے اور اللہ والوں کی معیّت

(اصلاحی خطبات ج ۱۴ ص ۹۱)
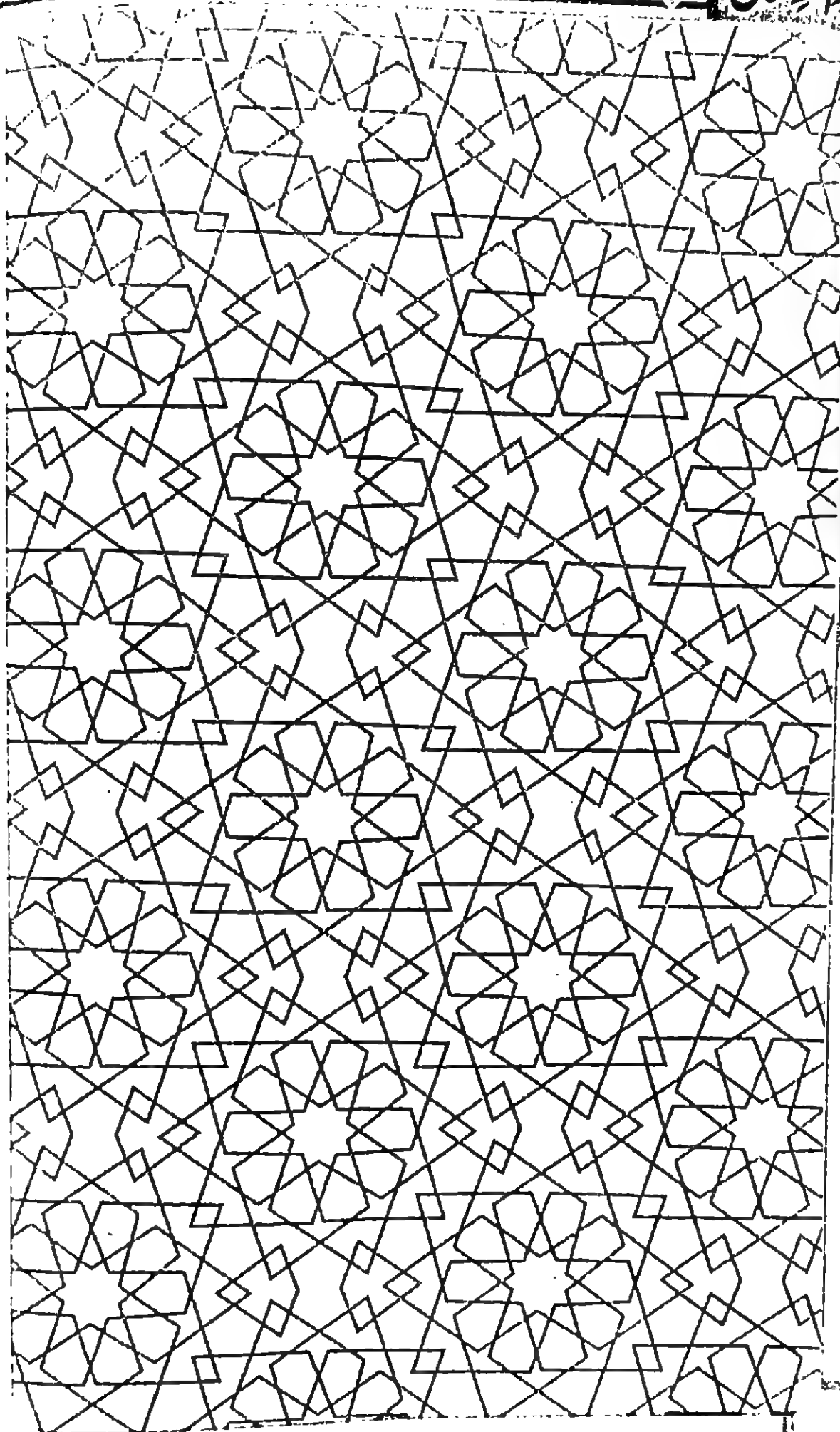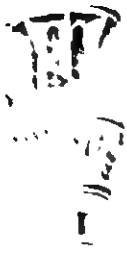
بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

کلمۂ طیبہ کے تقاضے اور اللہ والوں کی معیّت

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَنَسْتَعِيْنُهٗ وَنَسْتَغْفِرُهٗ وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّئَاتِ اَعْمَالِنَا، مَنْ يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهٗ وَمَنْ يُّضْلِلْهُ فَلَاهَادِيَ لَهٗ، وَأَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَاشَرِيْكَ لَهٗ وَأَشْهَدُ اَنَّ سَيِّدَنَا وَنَبِيَّنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَعَلٰى اٰلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ وَبَارَكَ وَسَلَّمَ تَسْلِيْمًا كَثِيْرًا كَثِيْرًا۔ أَمَّا بَعْدُ!

فَاَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيْمِ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَكُوْنُوْا مَعَ الصّٰدِقِيْنَ (۱)

---

(۱) سورۃ التوبۃ الآیۃ (۱۱۹)۔

آمنت باللہ صدق اللہ مولانا العظیم، وصدق رسولہ النبی الکریم، ونحن علیٰ ذٰلک من الشاھدین والشاکرین، والحمد للہ رب العالمین۔

تمہید

آج اس مبارک مدرسے میں حاضر ہوکر ایک زمانۂ دراز کی دلی تمنا پوری ہورہی ہے، عرصۂ دراز سے اس مبارک درس گاہ میں حاضری کا شوق تھا اور میرے مخدوم بزرگ حضرت مولانا مفتی عبدالشکور صاحب ترمذی دامت برکاتہم العالیہ (ان کا انتقال ہوچکا ہے، رحمۃ اللہ علیہ) کی زیارت اور ان کی صحبت سے استفادہ کی غرض سے باربار یہاں آنے کو دل چاہتا تھا، لیکن مصروفیات اور مشاغل نے اب تک مہلت نہ دی، اللہ تعالیٰ کا فضل وکرم ہے کہ آج یہ دیرینہ آرزو اس نے پوری فرمائی۔ یہاں حاضری کا میرا اصل مقصد حضرت دامت برکاتہم کی زیارت اور ان کے حکم کی تکمیل تھی۔ جب میں یہاں حاضری کا ارادہ کررہا تھا تو ذہن میں بالکل نہیں تھا کہ ماشاء اللہ مسلمانوں کا اتنا بڑا اجتماع موجود ہوگا اور ان سے خطاب کرنے کی نوبت آئے گی۔ بہرصورت! یہ اللہ تعالیٰ کا فضل وکرم ہے کہ اس نے حضرت مولانا کی زیارت کے ساتھ ساتھ مسلمانوں کے اتنے بڑے مجمع کی بھی زیارت کی توفیق عطا فرمائی جو خالصتاً اللہ اور اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت اور اللہ کے دین کی طلب کی خاطر اس صحن میں جمع ہے۔

○ ان کا حسنِ ظن سچا ہو جائے

میرے بزرگ حضرت مولانا مشرف علی صاحب تھانوی، اللہ تبارک وتعالیٰ ان کو دنیا اور آخرت کی کامیابیاں عطا فرمائے اور ان کے فیوض سے ہمیں مستفید فرمائے، انہوں نے مجھ ناکارہ کے بارے میں جو تعارفی کلمات ارشاد فرمائے، وہ میرے لیے باعثِ شرم ہیں اور ان کی شفقت ہے اور کرم فرمائی ہے کہ انہوں نے مجھ ناکارہ کے بارے میں ان خیالات کا اظہار فرمایا، میں سوائے اس کے اور کیا عرض کروں کہ اللہ تبارک وتعالیٰ ان کے اس حسنِ ظن کو میرے حق میں سچا فرمادے، آپ حضرات سے بھی اسی دُعا کی درخواست ہے۔

سوچ رہا تھا کہ اس موقع پر آپ حضرات کی خدمت میں کیا عرض کروں؟ حضرت مفتی عبدالشکور صاحب مدظلہم العالی سے بھی پوچھا کہ کس موضوع پر بیان کروں؟ سمجھ میں نہیں آرہا تھا، یہاں بیٹھنے کے بعد دل میں ایک بات آئی اور اسی کے بارے میں چند مختصر گزارشات آپ حضرات کی خدمت میں عرض کروں گا۔

○ یہ اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی محبت کا نتیجہ ہے

میں دیکھ رہا ہوں کہ ماشاء اللہ مسلمانوں کا اتنا بڑا اجتماع ہے کہ چہروں پر مسرت کے آثار ہیں، شوق و ذوق کے آثار ہیں، طلب کے آثار ہیں۔ یہ آخر کیوں؟ دل میں خیال پیدا ہوا کہ مجھ جیسا ایک ناکارہ، مفلسِ علم، بے عمل انسان ان کے سامنے بیٹھا ہے، اکثر حضرات وہ ہیں کہ جن سے اس سے پہلے ملاقات کی سعادت حاصل نہیں ہوئی، لیکن آخر وہ کیا بات ہے کہ ایک ان دیکھا شخص

جس کو پہلے کبھی دیکھا نہیں، کبھی برتا نہیں، ایسے شخص کو دیکھنے کے لیے اتنا شوق وذوق! اس کی بات سننے کے لیے اتنا ذوق و شوق! یہ آخر کیا بات ہے؟ ذہن میں یہ آیا کہ میری حالت تو جو کچھ ہے وہ اللہ ہی جانتا ہے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ اس کی اصلاح فرمائے۔ لیکن جو طلب اور جو ذوق و شوق لے کر یہ اللہ کے بندے، یہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے امتی اس صحن کے اندر جمع ہوئے ہیں، یہ ہم سب کے لیے اتنی بڑی سعادت اور اتنی بڑی خوش نصیبی کی بات ہے کہ اس کا بیان الفاظ سے نہیں ہوسکتا۔ یہ درحقیقت محبت ایک شخص سے نہیں، ایک ذات سے نہیں، یہ محبت ہے اللہ کی اور اللہ کے رسول محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی، اس کی خاطر یہ سب نظارے دیکھنے میں آتے ہیں اور میں یہ نظارے آج پہلی مرتبہ نہیں دیکھ رہا ہوں، اس سے پہلے بھی ایسے ایسے مقامات پر دیکھے ہیں جہاں اس کا کوئی تصور بھی انسان کے ذہن میں نہیں آتا۔

کلمۂ طیبہ نے ہم سب کو ملا دیا ہے

اللہ تبارک وتعالیٰ نے دنیا کے بہت سے ملکوں میں جانے کا موقع فراہم فرمایا، ایسے ایسے کفرستانوں میں جہاں کفر کی ظلمت چھائی ہوئی ہے، اندھیرا چھایا ہوا ہے، ایسی ایسی جگہوں پر جو ہماری زبان نہیں جانتے، ایک جملہ ہم بولیں تو وہ اس کو سمجھ نہیں سکتے، وہ اگر کوئی جملہ بولیں تو ہم اس کو نہیں سمجھ سکتے، لیکن ابھی گزشتہ سال مجھے چین جانے کا اتفاق ہوا، آبادی کے لحاظ سے دنیا کا سب سے بڑا ملک ہے اور وہاں پر کافر اور غیر مسلم آباد ہیں، لیکن وہاں پر اللہ کے مسلمان بندے بھی ہیں، وہاں جا کر پہلی بار یہ بات تحقیق سے معلوم ہوئی کہ چین کے اندر مسلمانوں کی تعداد کم از کم آٹھ کروڑ ہے۔ جب گاؤں اور دیہات میں یہ اطلاع

پہنچی کہ پاکستان سے کچھ مسلمان آرہے ہیں تو گھنٹوں پہلے سے دونوں طرف دورویہ قطاریں لگا کر انتظار میں کھڑے ہوگئے، حالانکہ برف باری ہورہی تھی، لیکن اس انتظار میں کہ پاکستان سے کچھ مسلمان آئے ہیں ان کو دیکھیں، چنانچہ جب ہم وہاں پہنچے اور انہوں نے ہمیں دیکھا تو کوئی جملہ وہ ہم سے نہیں کہہ سکتے تھے اور ہم کوئی جملہ ان سے نہیں کہہ سکتے تھے، کیونکہ وہ ہماری زبان نہیں جانتے اور ہم ان کی زبان نہیں جانتے، لیکن ایک لفظ ایسا ہے جو ہمارے دین نے ہمیں مشترک دے دیا ہے، خواہ کوئی زبان انسان بولتا ہو، اپنے دل کی ترجمانی وہ اس لفظ کے ذریعے کرسکتا ہے، وہ ہے ''السلام علیکم ورحمۃ اللہ'' تو ہر شخص دیکھنے کے بعد السلام علیکم کا نعرہ لگاتا، اور یہ کہہ کر اس کی آنکھوں سے آنسو جاری ہوجاتے۔ ایک رشتہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے ہمارے درمیان پیدا فرمادیا، چاہے وہ مشرق کا رہنے والا ہو یا مغرب کا، کوئی بھی زبان بولتا ہو، بات اس کی سمجھ میں آتی ہو یا نہ آتی ہو، اس کی معاشرت، اس کی تہذیب اور اس کی قومیت کچھ بھی ہو، لیکن جب یہ پتہ چل گیا کہ یہ مسلمان ہے اور کلمہ لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ کے رشتے میں ہمارے ساتھ شریک ہے تو اس کے لیے دل کے اندر محبت کے جذبات ابھرنے شروع ہوجاتے ہیں۔ ہمیں اور آپ کو اللہ تبارک وتعالیٰ نے بہت سے رشتوں میں جوڑا ہے، ان میں جو سب سے مضبوط رشتہ ہے جو کبھی ٹوٹ نہیں سکتا، جو کبھی ختم نہیں ہوسکتا، جو کبھی کمزور نہیں پڑسکتا، وہ رشتہ ہے لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ کا رشتہ۔

اس رشتے کو کوئی طاقت ختم نہیں کرسکتی

میرا بنگلہ دیش جانے کا اتفاق ہوا، جو کبھی بہرحال پاکستان ہی کا حصہ تھا،

مشرقی پاکستان کہلایا کرتا تھا۔ وہاں لوگوں کے اندر یہ بات مشہور ہے کہ جب سے بنگلہ دیش الگ ہوا، اس وقت سے پورے بنگلہ دیش میں ڈھاکہ سے لے کر چاٹ گام اور سلہٹ تک کسی جگہ اردو سنائی نہیں دیتی، اس لیے کہ اردو کا تو بیج مار دیا گیا، بلکہ اردو کا لفظ سن کر لوگوں کو غصہ آتا ہے کہ اردو زبان میں کیوں بات کی گئی؟ بنگلہ زبان میں بات کرو یا انگریزی میں۔

جب چاٹ گام پہنچا تو وہاں یہ اعلان ہوگیا کہ فلاں میدان میں بیان ہوگا، چنانچہ وہ میدان پورا بھر گیا، اس مجمع کے اندر میں نے اردو میں بیان کیا۔ اس میں لوگوں کا اندازہ یہ تھا کہ کم از کم پچاس ہزار مسلمانوں کا اجتماع تھا اور لوگوں کا کہنا یہ تھا کہ بنگلہ دیش بننے کے بعد اتنا بڑا اجتماع ہم نے نہیں دیکھا اور لوگوں کا کہنا یہ تھا کہ اگر کوئی اتنے بڑے جلسے کے اندر اردو زبان میں بیان کرے تو لوگ اس کے خلاف نعرے لگانا شروع کر دیتے ہیں، احتجاج شروع کر دیتے ہیں، لیکن لوگوں نے میری بات اتنی محبت سے، اتنے پیار سے اور اتنے اشتیاق سے سنی کہ لوگ حیرت زدہ رہ گئے۔ وہاں بھی میں نے یہ بات عرض کی کہ ہمارے درمیان سرحدیں قائم ہوسکتی ہیں، پولیس اور فوج کے پہرے حائل ہوسکتے ہیں، دریا اور سمندر اور پہاڑوں کے فاصلے حائل ہوسکتے ہیں، لیکن ان تمام باتوں کے باوجود اللہ تعالیٰ نے ہمیں ایک ایسے رشتے میں پرو دیا ہے کہ اس کو دنیا کی کوئی طاقت ختم نہیں کرسکتی اور وہ ہے کلمہ لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ۔

اس کلمے کے ذریعے زندگی میں انقلاب آجاتا ہے

یہ کلمہ جس نے ہمیں اور آپ کو جوڑا ہوا ہے، عجیب و غریب چیز ہے، عجیب و غریب مناظر دکھاتا ہے۔ آپ جانتے ہیں کہ یہ کلمہ ایسا ہے کہ انسان کی زندگی

میں اس کلمے کے پڑھتے ہی اتنا بڑا انقلاب برپا ہوتا ہے کہ اس سے بڑا انقلاب کوئی ہو نہیں سکتا، ایک شخص جو اس کلمے کے پڑھنے سے پہلے کافر تھا، کلمہ پڑھ کر مسلمان ہو گیا، اس کا مطلب یہ ہے کہ جب تک اس شخص نے یہ کلمہ نہیں پڑھا تھا، اس وقت تک وہ جہنمی تھا، اللہ کا مبغوض تھا، دوزخ کا مستحق تھا اور اس کلمے کو پڑھنے کے بعد ایک لمحے کے اندر وہ شخص جنتی بن گیا اور اللہ تبارک وتعالیٰ کا محبوب بن گیا۔ حدیث میں آتا ہے کہ نبی کریم سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ

"من قال لا الٰہ الا اللہ دخل الجنۃ"[1]

جو شخص لا الٰہ الا اللہ کہہ دے بس جنتی ہے۔

گناہوں کی سزا بھگتے گا اگر گناہ کیے ہیں، گناہوں کی سزا بھگتنے کے بعد آخر انجام اس کا جنت ہے۔ گناہ کیے، غلطیاں کیں، کوتاہیاں کیں، اگر اس نے توبہ نہیں کی تو سزا ملے گی، لیکن سزا ملنے کے بعد آخری انجام اس کا جنت ہے۔ یہ میری بات نہیں، یہ سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا کلام ہے کہ اس سے زیادہ سچا اس کائنات میں کوئی اور کلام ہو نہیں سکتا کہ وہ جنتی ہے اور کلمہ شریف پڑھنے کے بعد ایک شخص جہنم کے ساتویں طبقے سے نکل کر جنت الفردوس کے اعلیٰ ترین طبقے تک پہنچ جاتا ہے۔

ایک چرواہے کا واقعہ

غزوہ خیبر کا واقعہ یاد آیا، غزوہ خیبر وہ جہاد ہے جس میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

(۱) صحیح البخاری ۱۴۹/۷ (۵۸۲۷)۔

نے یہودیوں کے خلاف حملہ کیا تھا، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم خیبر تشریف لے گئے تھے، خیبر کے قلعے کے باہر پڑاؤ ڈالا ہوا تھا اور اس کا محاصرہ کیا ہوا تھا، اس میں کئی دن گزر گئے، لیکن قلعہ ابھی فتح نہیں ہوا تھا۔ اندر سے یہودیوں کا ایک چرواہا باہر نکلا، وہ بکریاں چرا رہا تھا، سیاہ فام تھا، کالی رنگت تھی اور کسی یہودی نے اس کو بکریاں چرانے کے لیے اپنا نوکر رکھا ہوا تھا، وہ بکریاں چرانے کی غرض سے خیبر کے قلعے سے باہر نکلا، تو دیکھا کہ مسلمانوں کا لشکر پڑا ہوا ہے۔ اس نے یہ سن رکھا تھا کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم حجاز سے یہاں پر حملہ کرنے کے لیے آئے ہیں، یثرب کے بادشاہ ہیں، اس کے دل میں خیال آیا کہ ذرا میں بھی دیکھوں، آج تک میں نے کوئی بادشاہ نہیں دیکھا اور دیکھ کے آؤں کہ یثرب کا بادشاہ کیسا ہے اور وہ کیا بات کہتا ہے؟

اس نے لوگوں سے پوچھا کہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کہاں تشریف فرما ہیں؟ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین نے اشارہ کر کے بتادیا کہ فلاں خیمے کے اندر تشریف رکھتے ہیں۔ اوّل تو وہ خیمے کو دیکھ کر ہی حیران رہ گیا، اس کے ذہن میں یہ تھا کہ جب یہ یثرب کے بادشاہ ہیں اور جن کی قوت اور طاقت کا ڈنکا بجا ہوا ہے تو ان کا جو خیمہ ہوگا وہ قالینوں سے مزین ہوگا، اس میں شاندار پردے پڑے ہوئے ہوں گے، باہر پہرے دار کھڑے ہوئے پہرہ دے رہے ہوں گے۔ وہاں جاکر دیکھا تو ایک معمولی کھجور کا بنا ہوا خیمہ نظر آرہا ہے، نہ کوئی چوکیدار ہے نہ کوئی پہردار ہے، نہ کوئی مصاحب ہے نہ کوئی ہٹو بچو کے نعرے لگانے والا ہے۔ خیر وہ چرواہا اندر داخل ہوگیا، اندر سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تشریف فرما تھے، اس نے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو دیکھا تو بڑی عجیب وغریب نورانی صورت نظر آئی، وہ جلوہ نظر آیا تو دل کچھ

کھنچنا شروع ہوا، جا کر عرض کیا کہ آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا پیغام اور آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی دعوت کیا ہے؟ نبی کریم سرورِ دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ میری تو ایک ہی دعوت ہے اور وہ یہ کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کو اپنا معبود نہ مانو اور لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ پڑھ لو، کچھ نبی کریم سرور دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے جلوہ جہاں آرا اور کچھ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ارشادات ان دونوں کا طبیعت پر اثر ہونا شروع ہوا تو اس نے پوچھا: اچھا یہ بتائیے کہ اگر میں آپ کی اس دعوت کو قبول کرلوں اور لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ پڑھ لوں تو میرا انجام کیا ہوگا؟ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ تمہارا انجام یہ ہوگا کہ تم تمام مسلمانوں کے برابر حقوق حاصل کرلو گے، ہم تمہیں سینے سے لگائیں گے اور جو ایک مسلمان کا حق ہے وہی تمہارا بھی حق ہوگا۔ اس نے کہا کہ آپ مجھے سینے سے لگائیں گے؟ ساری عمر کبھی یہ بات اس کے تصور میں بھی نہیں آئی تھی کہ کوئی سردار یا کوئی بادشاہ یا کوئی سربراہ مجھے گلے لگا سکتا ہے۔ اس نے کہا کہ میرا حال تو یہ ہے کہ میں سیاہ فام ہوں، میری رنگت کالی ہے، میرے جسم سے بدبو اٹھ رہی ہے، اس حالت میں آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) مجھے کیسے سینے سے لگائیں گے؟ آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا کہ جب تم یہ ایمان قبول کرلو گے تو پھر سب تمہیں سینے سے لگائیں گے، تمہارے حقوق تمام مسلمانوں کے برابر ہوں گے۔

اس نے کہا کہ اگر یہ بات ہے تو میں مسلمان ہوتا ہوں، پھر اشھد ان لا الہ الا اللہ و اشھد ان محمداً رسول اللہ پڑھ کر مسلمان ہوگیا۔ پھر اس نے کہا کہ یارسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اب میں مسلمان ہوچکا، اب مجھے بتائیے کہ مجھے کیا کرنا ہے؟ میرے ذمہ فرائض کیا ہیں؟ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ تم ایسے وقت میں مسلمان ہوئے ہو کہ نہ تو یہ کوئی نماز کا وقت ہے کہ تمہیں نماز پڑھوائی

جائے، نہ یہ رمضان کا مہینہ ہے کہ تم سے روزہ رکھوایا جائے، نہ تمہارے پاس مال ودولت ہے کہ تم سے زکوٰۃ دلوائی جائے۔ اس وقت تک حج فرض نہیں ہوا تھا۔ وہ عبادتیں جو عام مشہور ہیں ان کا تو کوئی موقع نہیں، البتہ اس وقت خیبر کے میدان میں ایک عبادت ہورہی ہے اور یہ وہ عبادت ہے جو تلواروں کے سائے میں انجام دی جاتی ہے، وہ ہے جہاد فی سبیل اللہ، تو آؤ اور دوسرے مسلمانوں کے ساتھ اس جہاد میں شامل ہوجاؤ۔

اس نے کہا کہ یارسول اللہ! میں جہاد میں شامل تو ہوجاؤں، لیکن جہاد میں دونوں باتیں ممکن ہیں، یہ بھی ممکن ہے کہ اللہ تعالیٰ فتح عطا فرمادے اور یہ بھی ممکن ہے کہ انسان اپنا خون دے کر آئے، تو اگر میں اس جہاد میں مر گیا اور شہید ہوگیا تو پھر میرا کیا ہوگا؟ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اگر تم اس جہاد میں شہید ہوگئے تو میں تمہیں بشارت دیتا ہوں اس بات کی کہ اللہ تبارک وتعالیٰ تمہیں سیدھے جنت الفردوس کے اندر لے جائیں گے، تمہارے اس سیاہ جسم کو اللہ تبارک وتعالیٰ منور جسم بنادیں گے، نورانی جسم بنادیں گے اور تم کہتے ہو کہ میرے جسم سے بدبو اٹھ رہی ہے تو اللہ تبارک وتعالیٰ تمہارے جسم کی بدبو کو خوشبو میں تبدیل فرمادیں گے۔ اس نے کہا کہ اگر یہ بات ہے تو بس مجھے اور کسی چیز کی حاجت نہیں۔ وہ جو بکریاں لے کر آیا تھا اس کے بارے میں نبی کریم سرور دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا کہ یہ بکریاں جو تم لے کر آئے ہو، یہ کسی اور کی ہیں، ان کو پہلے واپس کرکے آؤ۔

اندازہ لگایئے! میدانِ جنگ ہے، دشمن کی بکریاں ہیں، وہ چرواہا دشمن سے بکریاں باہر لے کر آیا ہے، اگر آپ چاہتے تو ان بکریوں کے ریوڑ کو پکڑ کر مالِ

غنیمت میں شامل فرمالیتے، لیکن وہ چرواہا ان کو بطورِ امانت لے کر آیا تھا اور امانت کو واپس دلوانا یہ نبی کریم سرورِ دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تعلیمات میں سرفہرست تھا، اس واسطے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ پہلے ان بکریوں کو قلعے کی طرف بھگادو تاکہ یہ شہر کے اندر چلی جائیں اور جو مالک ہے اس تک پہنچ جائیں تو پہلے نبی کریم سرورِ دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بکریاں واپس کروائیں پھر اس کے بعد وہ چرواہا جہاد میں شامل ہوگیا، کئی روز تک جہاد جاری رہا، جب جہاد ختم ہوا اور نبی کریم سرورِ دوعالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم حسب معمول شہداء اور زخمیوں کا جائزہ لینے کے لیے نکلے تو جہاں بہت سی لاشیں رکھی ہوئی تھیں اور متعدد صحابہ کرام رضی اللہ عنہم شہید ہوئے تھے، دیکھا کہ ایک لاش رکھی ہوئی ہے، اس کے گرد صحابہ کرام رضی اللہ عنہم جمع ہیں اور آپس میں یہ مشورہ کررہے ہیں کہ یہ کس کی لاش ہے؟ اس واسطے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو پتہ نہیں تھا کہ یہ کون ہے، پہچانتے نہیں تھے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تشریف لے گئے، جاکر دیکھا تو یہ وہی اسود عنسی چرواہے کی لاش تھی، نبی کریم سرور دوعالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس کو دیکھ کر ارشاد فرمایا کہ یہ شخص بھی عجیب وغریب انسان ہے، یہ ایسا انسان ہے کہ اس نے اللہ کے لیے کوئی سجدہ نہیں کیا، ایک نماز نہیں پڑھی، اس نے کوئی روزہ نہیں رکھا، اس نے ایک پیسہ اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ نہیں کیا، لیکن میری آنکھیں دیکھ رہی ہیں کہ یہ سیدھا جنت الفردوس میں پہنچا ہے اور اللہ تبارک وتعالیٰ نے اس کے جسم کی بدبو کو خوشبو سے تبدیل فرمادیا ہے، میں اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا ہوں کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے اس کا یہ انجام فرمایا۔(۱)

---

(۱) دلائل النبوۃ للبیھقی ۲۲۰/٤ باب ما جاء فی قصۃ العبد الاسود الذی اسلم یوم خیبر۔

بہرحال! یہ جو میں عرض کر رہا تھا کہ ایک لمحے میں یہ کلمہ انسان کو جہنم کے ساتویں طبقے سے نکال کر جنت الفردوس کے اعلیٰ ترین طبقے تک پہنچادیتا ہے، یہ کوئی مبالغہ کی بات نہیں، واقعہ پیش آیا ہے۔ یہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے ایسا کلمہ بنایا ہے۔

کلمۂ طیبہ پڑھ لینا، معاہدہ کرنا ہے

لیکن سوال یہ ہے کہ یہ کلمہ جو اتنا بڑا انقلاب برپا کرتا ہے کہ جو پہلے دوست تھے وہ دشمن بن گئے، جو پہلے دشمن تھے وہ اب دوست بن گئے، بدر کے میدان میں باپ نے بیٹے کے خلاف اور بیٹے نے باپ کے خلاف تلوار اٹھائی ہے اس کلمہ لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ کی وجہ سے، تو اتنا بڑا انقلاب جو برپا ہورہا ہے، کیا یہ کوئی منتر ہے یا کوئی جادو ہے کہ یہ منتر پڑھا اور جادو کے کلمات زبان سے ادا کیے اور اس کے بعد انسان کے اندر انقلاب برپا ہوگیا۔ ان الفاظ میں کوئی تاثیر ہے یا کیا بات ہے؟ حقیقت میں یہ کوئی منتر یا جادو یا طلسم قسم کے کلمات نہیں، حقیقت میں اس کلمے کے ذریعے جو انقلاب برپا ہوتا ہے یا وہ اس واسطے ہوتا ہے کہ جب میں نے کہہ دیا کہ اشہد ان لا الٰہ الا اللہ میں گواہی دیتا ہوں اس بات کی کہ اس کائنات میں اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں، تو اس کے معنی یہ ہیں کہ میں نے ایک معاہدہ کرلیا اور ایک اقرار کرلیا اس بات کا کہ آئندہ حکم مانوں گا تو صرف اللہ کا مانوں گا، اللہ تبارک وتعالیٰ کے حکم کے آگے سر جھکاؤں گا اور اللہ تبارک وتعالیٰ کے علاوہ کسی اور کو اپنا معبود قرار نہیں دوں گا، کسی اور کی بات اللہ کے خلاف نہیں مانوں گا۔ یہ ایک معاہدہ ہے جو انسان نے کرلیا اور جب اللہ کو اللہ قرار دے لیا اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ کا

رسول مان لیا، جس کے معنی یہ ہوئے کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے جو پیغام لے کر آئیں گے، اس کے آگے سر تسلیم خم کردوں گا، چاہے سمجھ میں آئے یا نہ آئے، چاہے عقل مانے یا نہ مانے، دل چاہے یا نہ چاہے، لیکن اللہ اور اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا جب حکم آ گیا تو اس کے بعد پھر اس کی سرتابی کرنے کی مجال نہیں ہوگی۔ یہ ہے معاہدہ، یہ ہے اقرار، یہ ہے میثاق، یہ ہے اعلان اس بات کا کہ آج سے میں نے اپنی زندگی کو اللہ اور اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی مرضی کے تابع بنالیا۔ انسان جب یہ اقرار کرلیتا ہے اور یہ معاہدہ کرلیتا ہے تو اس دن سے وہ اللہ تعالیٰ کا محبوب بن جاتا ہے اور اس کی زندگی میں اتنا بڑا انقلاب برپا ہوجاتا ہے۔

کلمۂ طیبہ کے کیا تقاضے ہیں؟

اس سے پتہ چلا کہ کلمہ لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ یہ محض کوئی زبانی جمع خرچ نہیں ہے کہ زبان سے کہہ لیا اور بات ختم ہوگئی، بلکہ آپ نے جس دن یہ کلمہ پڑھا، اس دن آپ نے اپنے آپ کو اللہ اور اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے حوالے کردیا اور اس بات کا وعدہ کرلیا کہ اب میری کچھ نہیں چلے گی، اب تو اللہ تبارک وتعالیٰ کے حکم کے تابع زندگی گزاروں گا۔ لہٰذا اس کلمہ لا الہ الا اللہ کے کچھ تقاضے ہیں کہ زندگی گزارو تو کس طرح گزارو، عبادت کس طرح کرو؟ لوگوں کے ساتھ معاملات کس طرح کرو؟ اخلاق تمہارے کیسے ہوں؟ معاشرت تمہاری کیسی ہو؟ زندگی کے ایک ایک شعبے میں ہدایات ہیں جو اس کلمے کے دائرے کے اندر آتی ہیں اور وہ ہدایات سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم زبان مبارک سے بھی دے

کر گئے ہیں اور اپنے افعال سے بھی، اپنی زندگی کی ایک ایک نقل و حرکت سے اور ایک ایک ادا سے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم دین کا طریقہ سکھا کر اِس دنیا سے تشریف لے گئے۔ اب مسلمان کا کام یہ ہے کہ وہ اللہ اور اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے احکام کا علم حاصل کر کے اس کے مطابق اپنی زندگی گزارے اور زندگی اس کے مطابق گزارنے کا نام ہی درحقیقت تقویٰ ہے، تقویٰ کے معنی ہیں اللہ کا ڈر، کہیں ایسا تو نہیں کہ میں نے اللہ تبارک وتعالیٰ کے حضور معاہدہ تو کرلیا، لیکن میں جب آخرت میں باری تعالیٰ کی بارگاہ میں پیش ہوں تو مجھے شرمندگی اٹھانی پڑے کہ جو معاہدہ میں نے کیا تھا، میں نے اس معاہدے کو پورا نہیں کیا، اس بات کا خوف اور اس بات کے ڈر کا نام ہے تقویٰ!

۵ تقویٰ حاصل کرنے کا طریقہ

پورا قرآن کریم اس سے بھرا ہوا ہے کہ اے ایمان والو! تقویٰ اختیار کرو، سارے دین کا خلاصہ اس تقویٰ کے اندر آجاتا ہے۔ ایک جگہ فرمایا کہ

يَاأَيُّهَا الَّذِينَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَكُونُوا مَعَ الصّٰدِقِينَ (۱)

اللہ تبارک وتعالیٰ کا کلام بھی عجیب وغریب ہے اور اس کے بڑے عجیب وغریب اعجازات ہیں، باری تعالیٰ جتنا کچھ انسان کے کرنے کا کام ہوتا ہے وہ بھی سارا کا سارا ایک جملے کے اندر بتادیتے ہیں اور پھر اس پر عمل کرنے کا جو طریقہ ہے اور اس کا جو آسان راستہ ہے وہ بھی اپنی رحمت سے اپنے بندوں کو بتادیتے ہیں کہ ویسے کرنا تمہارے لیے مشکل ہوگا، ہم تمہیں اس کا راستہ بتائے

(۱) سورۃ التوبۃ آیت (۱۱۹)۔

دیتے ہیں۔ فرمایا کہ اے ایمان والو! تقویٰ اختیار کرو۔ تقویٰ اختیار کرلیا تو اب اس کے بعد کسی چیز کی ضرورت نہیں رہتی، تقویٰ میں سبھی کچھ آ گیا، لیکن سوال پیدا ہوا کہ تقویٰ کیسے اختیار کریں؟ تقویٰ تو بڑا اونچا مقام ہے، اس کے لیے بڑے تقاضے ہیں، بڑی شرائط ہیں، وہ کیسے اختیار کریں، کہاں سے اختیار کریں؟ اس کا جواب اگلے جملے میں باری تعالیٰ نے دے دیا کہ ویسے تقویٰ اختیار کرنا تمہارے لیے مشکل ہوگا، لیکن آسان راستہ تمہیں بتائے دیتے ہیں، وہ یہ ہے کہ وَكُوْنُوْا مَعَ الصّٰدِقِیْنَ سچے لوگوں کے ساتھی بن جاؤ، صادقین کے ساتھی بن جاؤ۔ سچے کے معنی صرف یہی نہیں کہ وہ سچ بولتے ہوں اور جھوٹ نہ بولتے ہوں، بلکہ سچے کے معنی یہ ہیں کہ جو زبان کے سچے، جو بات کے سچے، جو معاملات کے سچے، جو معاشرت کے سچے، جو اللہ تبارک وتعالیٰ کے ساتھ اپنے کیے ہوئے معاہدے میں سچے ہیں، ان کے ساتھی بن جاؤ اور ان کی صحبت اختیار کرو، ان کے ساتھ اٹھنا بیٹھنا شروع کرو، جب اٹھنا بیٹھنا شروع کرو گے تو اللہ تبارک وتعالیٰ ان کے تقویٰ کی جھلک تمہارے اندر بھی پیدا فرمادیں گے۔ یہ ہے تقویٰ حاصل کرنے کا طریقہ اور اسی طریقے سے دین منتقل ہوتا چلا آیا ہے۔ نبی کریم سرکارِ دو عالم محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے وقت سے لے کر آج تک جو دین آیا ہے، وہ سچے لوگوں کی صحبت سے آیا، صادقین کی صحبت سے آیا۔

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین نے دین کہاں سے حاصل کیا؟

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین نے دین کہاں سے حاصل کیا؟ کسی یونیورسٹی میں پڑھا؟ کسی کالج میں پڑھا؟ کوئی سرٹیفکیٹ حاصل کیا، کوئی ڈگری لی؟ ایک ہی یونیورسٹی تھی وہ سرکارِ دو عالم محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذاتِ والا صفات تھی،

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں رہے، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی صحبت اٹھائی، اس سے اللہ تبارک وتعالیٰ نے دین کا رنگ چڑھادیا، ایسا چڑھایا ایسا چڑھایا کہ ان آسمان و زمین کی نگاہوں نے دین کا ایسا چڑھا ہوا رنگ نہ اس سے پہلے کبھی دیکھا تھا، نہ اس کے بعد دیکھ سکے گی۔ وہ لوگ جو دنیا کے معمولی معمولی معاملات کے اوپر جان قربان کرنے کے لیے تیار ہوتے تھے، ایک دوسرے کے خون کے پیاسے بن جاتے تھے، ایک دوسرے کی جان لینے پر آمادہ ہوجاتے تھے، ان کی نظر میں دنیا ایسی بے حقیقت ہوئی اور ایسی ذلیل ہوئی اور ایسی خوار ہوئی کہ وہ اللہ تعالیٰ کے احکام کے آگے اور آخرت کے بہبود کے آگے ساری دنیا کے خزانوں کو خاطر میں نہیں لاتے تھے۔

حضرت ابوعبیدہ بن جرّاح رضی اللہ عنہ کا دنیا سے اعراض

حضرت ابوعبیدہ بن جراح رضی اللہ عنہ کا واقعہ یاد آیا، حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے عہدِ مبارک میں قیصر وکسریٰ کی بڑی بڑی سلطنتیں جو اس زمانے کی سپر پاور سمجھی جاتی تھیں (جیسے آج کل روس اور امریکہ) ان کا غرور اللہ تبارک وتعالیٰ نے حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے ہاتھوں خاک میں ملادیا، ابوعبیدہ بن جراح رضی اللہ عنہ کو شام کا گورنر مقرر فرمایا۔ حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ شام کے دورے پر تشریف لے گئے کہ دیکھیں کیا حالات ہیں؟ تو وہاں حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے حضرت ابوعبیدہ بن جراح رضی اللہ عنہ سے فرمایا کہ میرا دل چاہتا ہے کہ میں اپنے بھائی کا گھر دیکھوں، دل میں شاید یہ خیال ہوگا کہ ابوعبیدہ بن جراح رضی اللہ عنہ مدینے سے آئے ہیں اور شام کے گورنر بن گئے ہیں، مدینہ منورہ کا علاقہ بے آب وگیاہ تھا اور اس میں کوئی زرخیزی نہیں تھی، معمولی کھیتی باڑی ہوا کرتی تھی اور شام میں

کھیت لہلہا رہے ہیں، زرخیز زمینیں ہیں اور روم کی تہذیب پوری طرح وہاں پر مسلط ہے تو یہاں آنے کے بعد کہیں ایسا تو نہیں کہ دنیا کی محبت ان کے دل میں پیدا ہوگئی ہو اور اپنا کوئی عالیشان گھر بنا لیا ہو جس میں بڑے عیش وعشرت کے ساتھ رہتے ہوں۔ شاید اسی قسم کا کچھ خیال حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کے دل میں پیدا ہوا ہو۔ حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ اپنے بھائی یعنی ابو عبیدہ رضی اللہ عنہ کا گھر دیکھنا چاہتا ہوں۔

حضرت ابو عبیدہ رضی اللہ عنہ نے جواب میں کہا کہ امیر المومنین! آپ میرا گھر دیکھ کر کیا کریں گے، آپ میرا گھر دیکھیں گے تو آپ کو شاید آنکھیں نچوڑنے کے سوا کوئی فائدہ حاصل نہ ہو۔ حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ میرا دل چاہتا ہے کہ بھائی کا گھر دیکھوں۔ حضرت ابو عبیدہ رضی اللہ عنہ ایک دن ان کو اپنے ساتھ لے کر چلے، چلتے جارہے ہیں چلتے جارہے ہیں، کہیں گھر نظر ہی نہیں آتا، جب شہر کی آبادی سے باہر نکلنے لگے تو حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے پوچھا کہ بھائی! میں تمہارا گھر دیکھنا چاہتا تھا، تم کہاں لے جارہے ہو؟ فرمایا امیر المومنین! میں آپ کو اپنے گھر ہی لے جارہا ہوں، بستی سے نکل گئے تو لے جاکر ایک گھاس پھونس کے جھونپڑے کے سامنے کھڑا کر دیا اور کہا امیر المومنین! یہ میرا گھر ہے۔ حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ اس جھونپڑے کے اندر داخل ہوئے، چاروں طرف نظریں دوڑا کر دیکھنے لگے، کوئی چیز ہی نظر نہیں آتی، ایک مصلّٰی بچھا ہوا ہے، اس کے سوا پورے اس جھونپڑے کے اندر کوئی اور چیز نہیں، پوچھا کہ ابو عبیدہ! تم زندہ کس طرح رہتے ہو، یہ تمہارے گھر کا سامان کہاں ہے؟ تو حضرت ابو عبیدہ بن جراح رضی اللہ عنہ آگے بڑھے، بڑھ کر ایک طاق سے پیالہ اٹھا کر لائے، دیکھا تو اس پیالے کے اندر پانی پڑا ہوا تھا اور اس میں روٹی کے کچھ سوکھے ٹکڑے بھیگے

ہوئے تھے اور عرض کیا کہ امیر المومنین! مجھے اپنی مصروفیات اور ذمہ داریوں میں مصروف رہ کر اتنا وقت نہیں ملتا کہ میں کھانا پکاسکوں، اس لیے میں یہ کرتا ہوں کہ ہفتہ بھر کی روٹیاں ایک خاتون سے پکوالیتا ہوں اور وہ ہفتے بھر کی روٹی پکا کر مجھے دے جاتی ہے، میں اس کو اس پانی میں بھگو کر کھالیتا ہوں، اللہ تبارک وتعالیٰ کے فضل وکرم سے زندگی اچھی گزر جاتی ہے۔

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے پوچھا کہ تمہارا اور سامان؟ کہا کہ اور سامان کیا یا امیر المومنین! یہ سامان اتنا ہے کہ قبر تک پہنچانے کے لیے کافی ہے۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے دیکھا تو رو پڑے اور کہا کہ ابوعبیدہ! اس دنیا نے ہم میں سے ہر شخص کو بدل دیا، لیکن خدا کی قسم تم وہی ہو جو سرکار دو عالم محمد مصطفی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانے میں تھے۔ حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ عنہ نے فرمایا کہ امیر المومنین! میں نے تو پہلے ہی کہا تھا کہ آپ میرے گھر پر جائیں گے تو آنکھیں نچوڑنے کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوگا۔ یہ وہ شخص ہے جو شام کا گورنر تھا، آج اس شام کے اندر جو ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ کے زیرنگیں تھا، مستقل چار ملک ہیں، اس شام کے گورنر تھے، ابو عبیدہ بن جراح رضی اللہ عنہ کے قدموں میں دنیا کے خزانے روزانہ ڈھیر ہورہے ہیں، روم کی بڑی بڑی طاقتیں ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ کا نام سن کر لرزہ براندام ہیں، ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ کے نام سے ان کے دانت کھٹے ہورہے ہیں اور روم کے محلات کے خزانے، زرو جواہر اور زیورات لاکر ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ کے قدموں میں ڈھیر کیے جارہے ہیں، لیکن حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ اسے ٹھوکر مار کر اس پھونس کے جھونپڑے میں رہ رہے ہیں۔ (۱)

---

(۱) الزهد لابن أبي الدنيا ص ٦٦ (١١٦) طبع دار ابن كثير، وحلية الأولياء لأبي نعيم ١٠١/١ طبع دار الكتاب العربي۔

نبی کریم سرور دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین کی جو جماعت تیار کی تھی، حقیقت یہ ہے کہ اس روئے زمین پر ایسی جماعت مل ہی نہیں سکتی، دنیا کو ایسا ذلیل اور ایسا خوار کر کے رکھا کہ دنیا کی کوئی حقیقت آنکھوں میں باقی رہی ہی نہیں تھی، اس واسطے کہ ہر وقت دل میں یہ خیال لگا ہوا تھا کہ کسی وقت اللہ تبارک وتعالیٰ کی بارگاہ میں پیش ہونا ہے، اصل زندگی ہے تو وہ ہے، یہ چند روزہ زندگی کیا حقیقت رکھتی ہے، یہ حقیقت نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین کے دلوں میں جاگزیں فرمادی تھی، اسی کا نام تقویٰ ہے۔ یہ کہاں سے حاصل ہوئی؟ یہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی صحبت سے حاصل ہوئی، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی صحبت میں چند دن جس نے گزار لیے، اس کے دل میں دنیا کی حقیقت بھی واضح ہوگئی اور آخرت بھی سامنے آ گئی، تو دین اس طریقے سے چلتا آیا ہے۔

٥ دین ہوتا ہے بزرگوں کی نظر سے پیدا

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین نے، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے تابعین نے اور تابعین سے تبع تابعین نے اور اسی طریقے سے آخر دم تک دین اس طرح پھیلا ہے اور پہنچا ہے۔ جن کی زندگیاں تقویٰ کے سانچے میں ڈھلی ہوتی ہیں، جو کلمہ لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ کے تقاضوں کو جاننے اور سمجھنے والے ہوتے ہیں، ان کی صحبت سے یہ چیز حاصل ہوتی ہے، یہ کتابیں پڑھنے سے نہیں آتی، یہ محض تقریر سن لینے سے یاد کر لینے سے نہیں آتی، یہ آتی ہے کسی اللہ والے کی صحبت میں کچھ وقت گزارنے سے، اس کا طرزِ عمل دیکھنے سے، اس کی زندگی کی ادا کو پڑھنے سے اور اس طرح دین کا یہ رنگ انسان کے اندر منتقل ہوتا ہے

اور جو لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ میں کتابیں پڑھ کر دین حاصل کراوں گا تو یہ ان کی خام خیالی ہے۔ بالکل صحیح بات کہی ہے۔

نہ کتابوں سے نہ کالج سے نہ زر سے پیدا
دین ہوتا ہے بزرگوں کی نظر سے پیدا

دین کتاب پڑھ لینے سے نہیں آتا، لفاظیوں سے نہیں آتا، بلکہ بزرگوں کی نظر سے اور ان کی صحبت سے دین آتا ہے۔ باری تعالیٰ نے فرمایا کہ تقویٰ اختیار کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ سچے لوگوں کی اور اللہ والوں کی صحبت اختیار کرو، تو اس صحبت کے نتیجے میں اللہ تبارک وتعالیٰ تمہیں بھی متقی بنا دیں گے، تمہارے اندر بھی وہ رنگ پیدا ہوجائے گا۔

سچے اور متقی لوگ کہاں سے لائیں؟

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ سچے لوگ کہاں سے لائیں؟ ہر شخص دعویٰ کرتا ہے کہ میں بھی سچا ہوں، میں بھی صادق ہوں اور اسی فہرست میں داخل ہوں، بلکہ لوگ یہ کہا کرتے ہیں کہ صاحب آج کل تو دھوکہ بازی کا دور ہے، ہر شخص لمبا کرتا پہن کر اور عمامہ سر پر لگا کر اور داڑھی لمبی کرکے کہتا ہے کہ میں بھی صادقین میں داخل ہوں، اقبال نے کہا تھا۔

خداوندا یہ تیرے سادہ دل بندے کدھر جائیں
کہ درویشی بھی عیاری ہے سلطانی بھی عیاری

یہ حالت نظر آتی ہے تو اب کہاں سے لائیں وہ صادقین جن کی صحبت انسان کو کیمیا بنا دیتی ہے، کہاں سے لائیں وہ اللہ والے جن کی ایک نظر سے

انسان کی زندگیاں بدل جاتی ہیں، وہ جنید وہ شبلی رحمۃ اللہ علیہ جیسے بڑے بڑے اولیاء کرام اس دور میں کہاں سے لے کر آئیں، کس طرح ان کی صحبت حاصل کریں، آج کل تو عیاری کا اور مکاری کا دور ہے۔

ہر چیز میں ملاوٹ

میرے والدِ ماجد حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب قدس اللہ سرہ اس کا ایک بڑا عمدہ جواب دیا کرتے تھے، وہ فرماتے تھے کہ میاں! لوگ یہ کہتے ہیں کہ آج کل صادقین کہاں سے تلاش کریں؟ ہر جگہ عیاری مکاری کا دور ہے، تو بات دراصل یہ ہے کہ یہ زمانہ ہے ملاوٹ کا، ہر چیز میں ملاوٹ، گھی میں ملاوٹ، چینی میں ملاوٹ، آٹے میں ملاوٹ، دنیا کی ہر چیز میں ملاوٹ، یہاں تک کہ کہتے ہیں کہ زہر میں بھی ملاوٹ۔

کسی نے لطیفہ سنایا کہ ایک شخص نے ہر چیز میں ملاوٹ دیکھی کہ کوئی چیز خالص نہیں ملتی تو عاجز آ گیا، اس نے سوچا کہ میں خودکشی کرلوں، اس دنیا میں زندہ رہنا فضول ہے جہاں پر کوئی چیز خالص نہیں ملتی، نہ آٹا خالص ملے، نہ چینی خالص ملے، نہ گھی خالص ملے، کچھ بھی خالص نہیں، تو اس نے سوچا کہ خودکشی کرلینی چاہیے اور اس دنیا سے چلے جانا چاہیے۔ چنانچہ وہ بازار سے زہر خرید کر لایا اور وہ زہر کھالیا، اب کھا کر بیٹھا ہے انتظار میں کہ اب موت آئے اور تب موت آئے، لیکن موت ہے کہ آتی ہی نہیں، معلوم ہوا کہ زہر بھی خالص نہیں تھا تو دنیا کی کوئی چیز خالص نہیں، ہر چیز میں ملاوٹ ہے۔

حضرت والد صاحب قدس اللہ سرہ فرمایا کرتے تھے کہ دنیا کی ہر چیز میں ملاوٹ ہے تو بھائی آٹے میں بھی ملاوٹ ہے اور یہ آٹا بھی خالص نہیں ملتا، لیکن

یہ بتاؤ کہ اگر آٹا خالص نہیں ملتا تو کسی نے آٹا کھانا چھوڑ دیا کہ صاحب! آٹا تو اب خالص ملتا نہیں، لہٰذا اب آٹا نہیں کھائیں گے، اب تو بھس کھایا کریں گے یا گھی اگر خالص نہیں ملتا تو کسی نے گھی کھانا چھوڑ دیا کہ صاحب! گھی تو اب خالص ملتا نہیں، لہٰذا اب مٹی کا تیل استعمال کریں گے، کسی نے بھی باوجود اس ملاوٹ کے دور کے نہ آٹا کھانا چھوڑا، نہ چینی کھانی چھوڑی، نہ گھی کھانا چھوڑا، بلکہ تلاش کرتا ہے کہ گھی کون سی دکان پر اچھا ملتا ہے اور کون سی بستی میں اچھا ملتا ہے، آدمی بھیج کر وہاں سے منگواؤ، مٹھائی کون سی دکان والا اچھی بناتا ہے، آٹا کس جگہ سے اچھا ملتا ہے، وہاں سے جاکر تلاش کرکے لائے گا، اسی کو حاصل کرے گا، اسی کو استعمال کرے گا۔

تو فرمایا کہ بے شک آٹا، گھی، چینی، کچھ خالص نہیں ملتی، لیکن تلاش کرنے والے کو آج بھی مل جاتی ہے۔ اسی طرح مولوی بھی خالص نہیں ملتا، لیکن تلاش کرنے والے کو آج بھی مل جاتا ہے، اگر کوئی اللہ کا بندہ تلاش کرنا چاہے، طلب کرنا چاہے تو اس کو آج کے دور میں بھی صادقین مل جائیں گے، یہ کہنا بالکل شیطان کا دھوکہ ہے کہ آج کے دور میں صادقین ختم ہوگئے۔ ارے جب اللہ تبارک وتعالیٰ فرمارہے ہیں کہ تم صادقین کے ساتھی بن جاؤ، یہ حکم کیا صرف صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے دور کے ساتھ مخصوص تھا کہ وہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اس پر عمل کرسکیں، بیسویں صدی میں آنے والے اس پر عمل نہیں کرسکتے؟ ظاہر ہے کہ قرآنِ کریم کے ہر حکم پر قیامت تک جب تک مسلمان باقی ہیں عمل کرنا ممکن رہے گا، تو اس کے معنی خود بخود نکال لو کہ صادقین اس وقت بھی ہیں، ہاں تلاش کرنے کی بات ہے، یہ نہیں کہ صاحب ملتا ہی نہیں، لہٰذا بیٹھے ہیں، تلاش کرو گے اور طلب پیدا کرو گے تو مل جائے گا۔

جیسی روح ویسے فرشتے

حضرت والد صاحب قدس اللہ سرہ فرمایا کرتے تھے کہ میاں! آج کل لوگوں کا حال یہ ہے کہ خود خواہ کسی حالت میں ہوں، گناہ میں، معصیت میں، کبائر میں، فسق وفجور میں مبتلا ہوں، لیکن اپنے لیے صادقین تلاش کریں گے تو معیار سامنے رکھیں گے جنید بغدادی رحمۃ اللہ علیہ کا، شیخ عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ کا اور بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ کا اور بڑے بڑے اولیاءِ کرام کا جن کے نام سن رکھے ہیں کہ صاحب! ہمیں تو ایسا صادق چاہیے جیسا کہ جنید بغدادی تھے یا شیخ عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ تھے۔ حالانکہ اصول یہ ہے کہ جیسی روح ویسے فرشتے، جیسے تم ہو ویسے ہی تمہارے مصلح ہوں گے، تم جس معیار کے ہو تمہارے لیے یہی لوگ کافی ہوسکتے ہیں، جنید وشبلی کے معیار کے نہ سہی لیکن تمہارے لیے یہ بھی کافی ہیں۔

مسجد کے مؤذن کی صحبت اختیار کرلو

بلکہ میرے والدِ ماجد قدس اللہ سرہ فرماتے تھے کہ میں تو قسم کھا کر کہتا ہوں کہ اگر کوئی شخص اللہ تعالیٰ کی طلب لے کر اپنی مسجد کے ان پڑھ مؤذن کی صحبت میں جا کر بیٹھے گا تو اس کی صحبت سے بھی فائدہ پہنچے گا۔ اس واسطے کہ وہ مؤذن کم از کم پانچ وقت اللہ کا نام بلند کرتا ہے، اس کی آواز فضاؤں میں پھیلتی ہے، وہ اللہ کے کلمے کو بلند کرتا ہے، اس کی صحبت میں جا کر بیٹھو، تمہیں اس سے بھی فائدہ پہنچے گا۔ یہی شیطان کا دھوکا ہے کہ صاحب! ہمیں تو اس معیار کا بزرگ اور اس معیار کا مصلح چاہیے، یہ انسان کو دھوکا دینے کی بات ہے، حقیقت میں تمہاری اپنی اصلاح کے واسطے تمہارے معیار کے اور تمہاری سطح کے مصلح

آج بھی موجود ہیں۔

بھائی بات لمبی ہوگئی، میں عرض یہ کرنا چاہ رہا تھا کہ دین حاصل کرنے کا اور اس کی سمجھ حاصل کرنے کا اور اس پر عمل کرنے کا طریقہ معلوم کرنے کا کوئی راستہ آج کل کے حالات میں اس کے سوانہیں ہے کہ کسی اللہ والے کو اپنا دامن پکڑا دے، اللہ تبارک وتعالیٰ کسی اللہ والے کی صحبت عطا فرمادے تو اس کے نتیجے میں اللہ تعالیٰ دین عطا فرمادیتے ہیں۔

میں آپ حضرات کو مبارک پیش کرتا ہوں (بہت سی جگہیں ایسی ہیں کہ وہاں کبھی جاکر یہ بات کہنے کی نوبت آتی ہے تو لوگ پوچھتے ہیں کہ صاحب ہم کہاں جائیں تو بتلانے کے لیے ذرا دشواری ہوتی ہے) لیکن اللہ تبارک وتعالیٰ کا اتنا بڑا کرم ہے اتنا بڑا کرم ہے کہ آپ اس کا شکر ادا کرہی نہیں سکتے کہ اس بستی میں جو دور افتادہ بستی ہے، کسی کے منہ پر کوئی بات کہنا اچھانہیں ہوتا، مگر ہمارا دین وہ ہے جو بے تکلف ہے تو اس بے تکلفی کی وجہ سے عرض کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ نے اس بستی کے اندر آپ اور ہم سب پر یہ بڑا فضل فرمایا ہے کہ حضرت مولانا مفتی عبدالشکور صاحب ترمذی دامت برکاتہم العالیہ کو اس بستی کے اندر بھیج دیا اور انہیں کا یہ نورظہور ہے جو آپ اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں، یہ مدرسہ، یہ بڑا اجتماع، یہ مسلمانوں کے اندر دینی جذبات، یہ ذوق وشوق اور یہ جوش وخروش، یہ سب کچھ ایک اللہ والے کے دل کی دھڑکنوں سے نکلنے والی آہوں اور دعاؤں کا نتیجہ ہے۔

اللہ تبارک وتعالیٰ کے فضل وکرم سے یہ نعمت میسر ہے اور ہماری قوم کا حال یہ ہے کہ جب تک نعمت میسر رہتی ہے اس کی قدر نہیں پہچانتے، جب چلی جاتی ہے تو قوم اس کو سر پر بٹھانے کے لیے تیار، اس کا عرس منانے کے لیے تیار، اس

کے مزار پر چادریں چڑھانے کے لیے تیار، اس کو آسمان پر اٹھانے کے لیے تیار، لیکن جب تک وہ نعمت موجود ہے قدر نہیں پہچانیں گے، قدر نہیں مانیں گے، ہمیشہ اس میں عیب ہی نظر آتے رہیں گے، تنقیدیں ہی کرتے رہیں گے، لہٰذا جہاں کوئی اللہ والا بیٹھ گیا ہو، اس کو بہت ہی غنیمت سمجھ کر اس سے استفادہ کی کوشش کیجیے۔

واقعہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت مفتی صاحب دامت برکاتہم کو وہ مقام بخشا ہے کہ لوگ سفر کر کے آئیں اور آ کر استفادہ کریں، اللہ تبارک وتعالیٰ نے اس بستی کے اندر آپ کو یہ نعمت عظمیٰ عطا فرمائی ہوئی ہے۔ میں دور سے آنے والا اوّل تو کچھ آتا جاتا نہیں، کوئی اہلیت نہیں، کوئی صلاحیت نہیں، میں آپ سے کیا عرض کروں، لیکن اگر اتنی بات آپ حضرات کے ذہن میں بیٹھ جائے اور اس نعمت کی قدر پہچاننے کی کوشش کرلیں اور اس سے استفادہ کی کوشش کرلیں تو میں سمجھتا ہوں کہ بہت بڑے بڑے جلسوں اور تقریروں کا خلاصہ اور اس کا فائدہ حاصل ہوگیا، یوں تو جلسے اور تقریریں اور کہنا سننا تو بہت ہوتا رہتا ہے اور عام طور پر لوگ کہتے بھی ہیں، سنتے بھی ہیں، لیکن کم از کم اگر دل میں یہ داعیہ اور یہ شوق پیدا ہوجائے کہ کسی اللہ والے کی صحبت سے استفادہ کرنا ہے تو میں سمجھتا ہوں کہ اس مجلس کا فائدہ حاصل ہوگیا۔ اللہ تعالیٰ مجھے بھی اور آپ کو بھی دین کی صحیح فہم عطا فرمائے۔ صادقین کی صحبت عطا فرمائے۔ ان کی محبت اور ان کی خدمت کے ذریعے دین کا صحیح مزاج ہمارے دلوں کے اندر پیدا فرمائے۔ آمین۔

وَاٰخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ

○ ○ ○
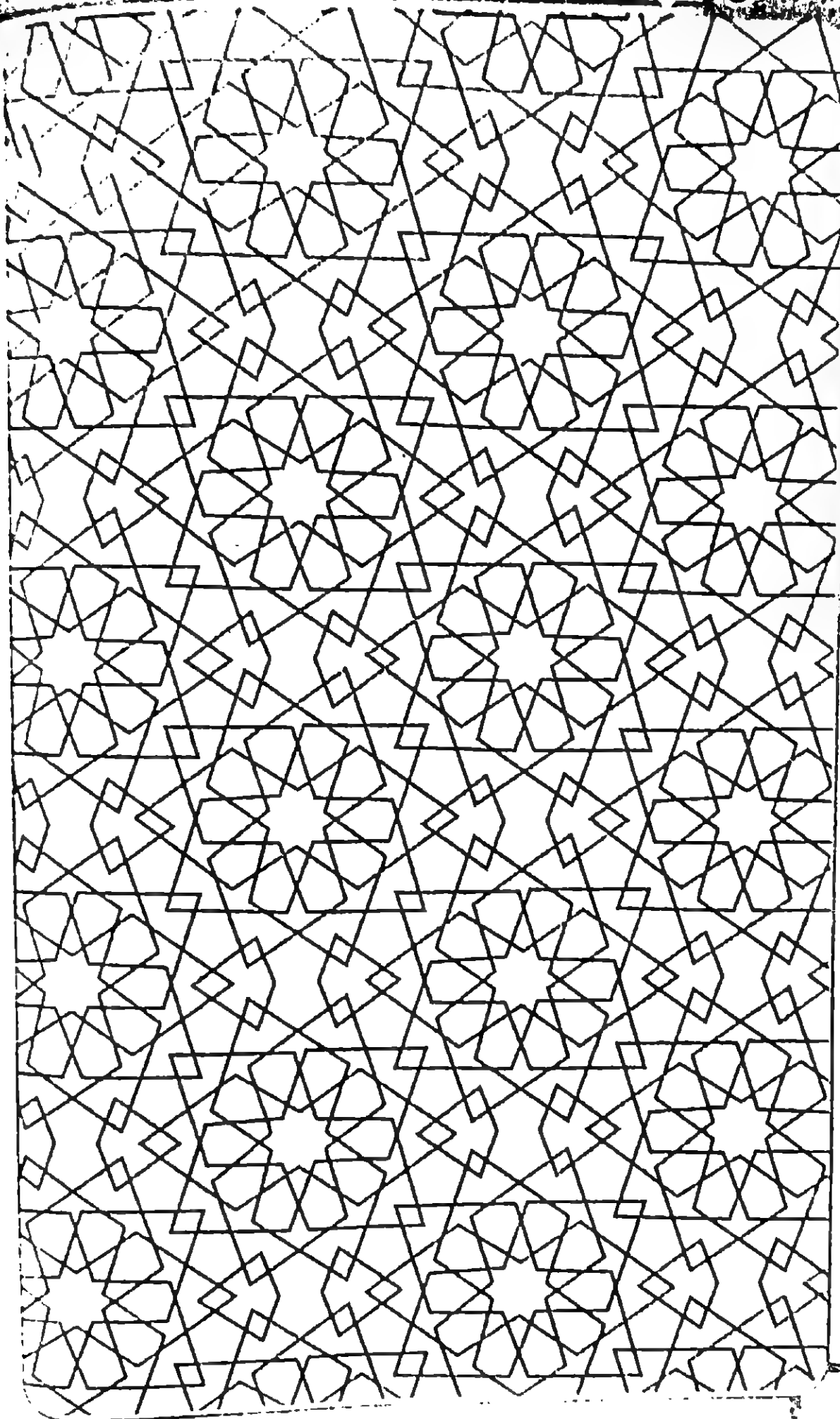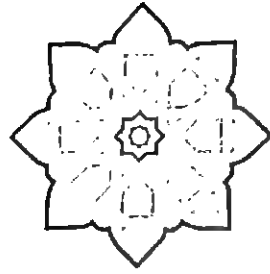
کلمہ طیبہ "لا اِلٰہ اِلَّا اللہ" کے تقاضے

(اصلاحی خطبات ج۲۱ ص۲۵)
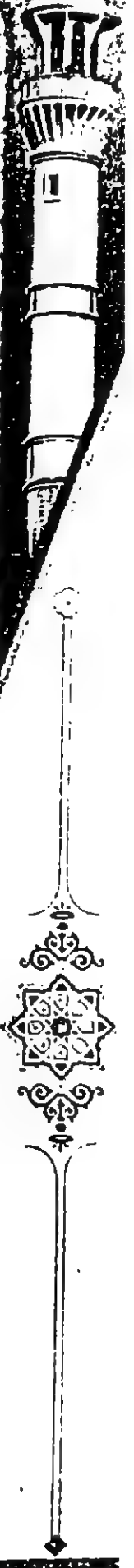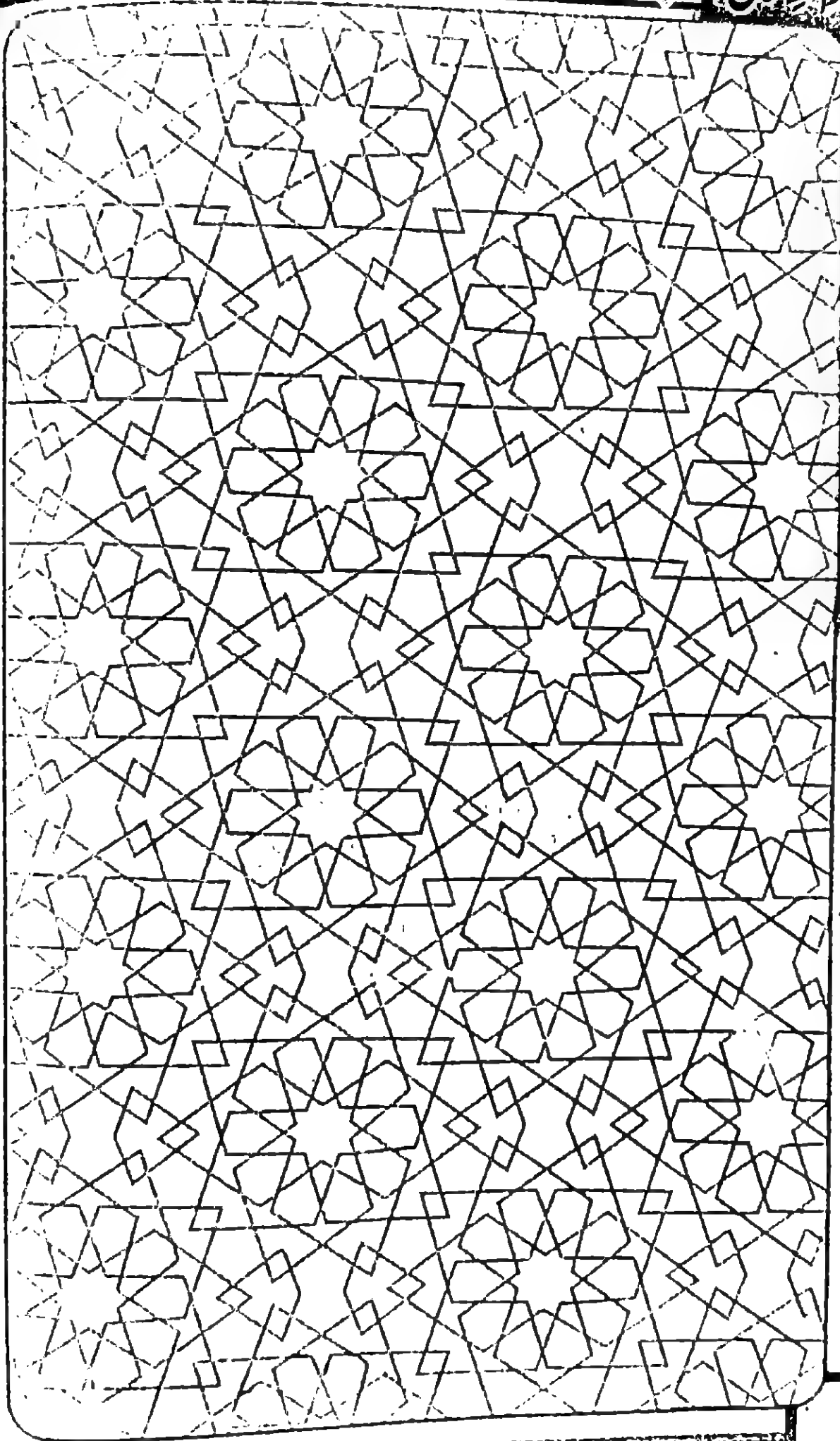
بسم اللہ الرحمن الرحیم

کلمہ طیبہ ''لا الہ الا اللہ'' کے تقاضے

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَنَسْتَعِيْنُهٗ وَنَسْتَغْفِرُهٗ وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّئَاتِ اَعْمَالِنَا، مَنْ يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهٗ وَمَنْ يُّضْلِلْهُ فَلَا هَادِيَ لَهٗ، وَأَشْهَدُ اَنْ لَّا إِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَاشَرِيْكَ لَهٗ وَأَشْهَدُ اَنَّ سَيِّدَنَا وَنَبِيَّنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَعَلٰى اٰلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ وَبَارَكَ وَسَلَّمَ تَسْلِيْمًا كَثِيْرًا كَثِيْرًا۔ أَمَّا بَعْدُ!

عن ابی ہریرۃ رضی اللہ عنہ عن النبی ﷺ قال: «الإيمانُ بِضعٌ و سبعون شعبةً، أفضلُها لا إله إلا اللّٰه، و أدناها إماطةُ الأذى عن الطريقِ، والحياءُ شعبةٌ من الإيمانِ».(1)

(1) صحیح مسلم ۱/۶۳ (۳۵)۔

ایمان کے ستر سے زائد شعبے

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

ایمان کے ستر سے زائد شعبے ہیں۔

یعنی ایمان کے تقاضے اور ایمان کے مطابق کرنے والے اعمال ستر سے زائد ہیں۔ ستر کا عدد جب اہل عرب بولتے تھے تو اس سے مراد ستر کی گنتی نہیں ہوتی تھی، بلکہ اس کا مطلب ہوتا تھا ''بہت زیادہ''۔ جیسے ہم بھی بعض اوقات اردو میں کہتے ہیں کہ میں نے یہ بات ستر مرتبہ کہی، اس کا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ میں نے ستر مرتبہ گن کر یہ بات کہی، بلکہ اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ میں نے بہت مرتبہ یہ بات کہی۔ لہٰذا ستر کے عدد سے کثرت بیان کرنی مقصود ہوتی ہے، اس لیے علماء نے فرمایا: اس حدیث کا یہ مطلب نہیں کہ ایمان کے شعبے گنتی کے اعتبار سے ستر ہیں، بلکہ مطلب یہ ہے کہ ایمان کے شعبے بہت زیادہ ہیں، لہٰذا ایمان کے اعمال کی تعداد ستر سے کہیں زیادہ ہے اور وہ سب شعبے ایمان کا حصہ ہیں۔ اگر انسان کسی ایک شعبے کو پکڑ کر بیٹھ جائے اور یہ سمجھے کہ میں مومن کامل ہوگیا، یہ بات درست نہیں۔

ہر جگہ ایمان کے تقاضوں پر عمل ضروری ہے

مثلاً کسی نے نماز پڑھنی شروع کردی یا مثلا روزہ رکھنا شروع کردیا یا عبادات پر عمل کرنا شروع کردیا تو وہ آدمی یہ نہ سمجھے کہ بس میرا ایمان کامل ہوگیا

اور اب مجھے کچھ کرنے کی ضرورت نہیں۔ مومن صرف مسجد میں اور مصلے پر مومن نہیں ہوتا، بلکہ جس وقت وہ گھر میں بیٹھ کر کام کررہا ہے اس وقت بھی مومن ہوتا ہے، جس وقت بازار میں خرید وفروخت کررہا ہے اس وقت بھی مومن، جب دفتر میں کام کررہا ہے اس وقت بھی مومن، وہ تو ہر جگہ مومن ہے اور جب ہر جگہ مومن ہے تو پھر ہر جگہ پر ایمان کے تقاضوں پر عمل کرنا بھی اس کے لیے ضروری ہے، چاہے وہ عبادت ہو یا معاملات ہوں، معاشرت ہو یا اخلاقیات ہوں، جتنے بھی زندگی کے شعبے ہیں ان سب میں ایک مومن کا فرض یہ ہے کہ وہ اللہ اور اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے احکام کی پیروی کرے۔ اس کے تو کوئی معنی نہیں کہ مسجد میں آکر تو عبادت کرلی اور اللہ تعالی کے حضور سجدہ کرلیا، لیکن بازار پہنچا تو اللہ کے بجائے شیطان کو محبوب بنالیا۔ اس کو یہ فکر نہیں کہ یہ لقمہ جو میں کھا رہا ہوں یہ حلال کا لقمہ ہے یا حرام کا لقمہ ہے اور اپنے بیوی بچوں کو جو کھلا رہا ہوں یہ حرام کھلا رہا ہوں یا حلال کھلا رہا ہوں۔ اگر اس کی فکر اس کے دل میں نہ ہو تو اس کا ایمان کامل نہیں۔

ایمان کے تین شعبوں کا ذکر

اس لیے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ ایمان کو صرف نماز روزے میں محصور نہ کرو، بلکہ ایمان کے ستر سے بھی زیادہ شعبے ہیں اور ان سب شعبوں پر عمل کرنا ایک مومنِ کامل کے لیے ضروری ہے۔ ان تمام شعبوں کا تو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بیان نہیں فرمایا، لیکن اس حدیث میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے تین شعبے ذکر فرمادیے، یہ تین شعبے اس لیے ذکر فرما دیے تاکہ ان شعبوں کی تھوڑی سی جھلک

سامنے آجائے اور ان شعبوں کا تعارف ہوجائے کہ وہ کیا کیا شعبے ہیں جو ایمان کے تقاضے کے لیے ضروری ہیں۔ اس پر علماءِ کرام نے مستقل کتابیں لکھی ہیں۔ امام بیہقی رحمۃ اللہ علیہ کی مشہور کتاب ہے "شعب الایمان" وہ درحقیقت اسی حدیث کی شرح ہے کہ ایمان کے شعبے کیا کیا ہیں؟ چنانچہ انہوں نے قرآن وحدیث سے وہ سارے اعمال اس کتاب میں جمع کردیے ہیں کہ ایک مومن کو کیا کیا عمل کرنا ضروری ہے۔ ان کے علاوہ اور بھی بہت سے حضرات نے اسی موضوع پر کتابیں لکھی ہیں۔

پہلا شعبہ "لا الہ الا اللہ" کہنا

اس حدیث میں حضوراقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم نے خاص طور پر تین شعبے ذکر فرمادیئے، پہلا شعبہ بیان کرتے ہوئے فرمایا:

"افضلها قول لا الہ الا اللہ"

یعنی ایمان کے شعبوں میں سب سے افضل شعبہ اور اعلیٰ درجے کا شعبہ کلمہ "لا الہ الا اللہ" کہنا ہے۔

یعنی توحید کا اقرار اور اعتراف کہ اس کائنات میں اللہ جل شانہ کے علاوہ کوئی معبود نہیں، یہ وہ اقرار ہے کہ اگر سچے دل سے اس کی صحیح روح کے ساتھ انسان اسے اپنالے تو اس کی پوری زندگی سنور جائے، کیونکہ "لا الہ الا اللہ" ایسا کلمہ ہے کہ اس کے ذریعہ وہ انسان جو ستر سال کا کافر ہے اور وہ سچے دل سے یہ کلمہ پڑھ لے تو اسی وقت مسلمان ہوگیا۔ یہ کلمہ انسان کو جہنم سے جنت میں پہنچادیتا ہے۔ یہ کلمہ انسان کو کفر سے ایمان میں داخل کردیتا ہے۔ یہ کلمہ انسان کو اللہ کے مبغوض ہونے سے نکال کر محبوب بنادیتا ہے۔ ایک لمحہ پہلے اگر مرجاتا تو

سیدھا جہنم میں چلا جاتا، لیکن لا الہ الا اللہ پڑھ کر اور اعتراف اور اقرار کر کے گیا تو سیدھا جنت میں پہنچ گیا۔

غزوۂ خیبر

یہ مبالغے کی بات نہیں، بلکہ سچے واقعات ہیں کہ بعض لوگ ایسے گزرے ہیں کہ جن کو اللہ تعالیٰ نے صرف اس کلمے کی بدولت جنت میں پہنچادیا اور جہنم سے نکال دیا۔ غزوۂ خیبر جس میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے یہودیوں پر حملہ کیا تھا، یہودی مسلمانوں کو پریشان کرتے رہتے تھے۔ مسلمانوں کو حکم ہوا کہ ان پر حملہ کریں، تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو لے کر خیبر کے مقام پر تشریف لے گئے۔ وہاں پر ان کے قلعوں کا محاصرہ کرلیا بالآخر اللہ تعالیٰ نے ان پر فتح عطا فرمادی۔

خیبر کے ایک چرواہے کا واقعہ

غزوۂ خیبر کے موقع پر جس وقت مسلمانوں نے خیبر کا محاصرہ کیا ہوا تھا خیبر کا رہنے والا ایک چرواہا بکریاں چرارہا تھا جس کا نام اسود تھا۔ سیاہ فام تھا اور بکریاں چرایا کرتا تھا۔ ایک روز وہ بکریاں چرانے کے لیے خیبر سے باہر آگیا۔ اس نے دیکھا کہ مسلمانوں کے لشکر نے یہاں پڑاؤ ڈالا ہوا ہے۔ اس کے دل میں خیال آیا کہ جاکر دیکھنا چاہیئے کہ یہ لوگ کون ہیں؟ اور کس لیے یہاں آئے ہیں؟ چنانچہ وہ بکریاں لے کر خیموں کے پاس پہنچ گیا۔ وہاں جاکر اس نے پوچھا کہ تمہارے سردار کون ہیں؟ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے بتایا کہ ہمارے سردار حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم ہیں جو فلاں خیمے کے اندر مقیم ہیں، تم وہاں چلے جاؤ تمہاری

ملاقات ہوجائے گی۔ اس کے وہم وگمان میں بھی نہیں تھا کہ کسی ملک کا بادشاہ یا کسی قبیلے کا سردار کسی معمولی خیمے میں مقیم ہو اور کوئی معمولی چرواہا براہِ راست ان سے جا کر مل لے۔ چنانچہ اس چرواہے نے کہا کہ تم مجھ سے مذاق کر رہے ہو؟ اتنا بڑا بادشاہ اس معمولی خیمے میں ہوگا اور وہ مجھ سے ملاقات کرلے گا۔ حضراتِ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین نے فرمایا کہ ہم مذاق نہیں کر رہے ہیں۔ ہمارے سردار اور ہمارے آقا ایسے ہی ہیں، تم اگر ملنا چاہتے ہو تو ان کے پاس چلے جاؤ۔

حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا پیغام

وہ چرواہا چلا گیا اور حیرانی کے عالم میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے خیمے میں داخل ہوگیا۔ وہاں جا کر دیکھا تو نہ کوئی دربان، نہ کوئی چوکیدار، نہ کوئی روکنے والا اور سرکار دوعالم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سادگی کے ساتھ اس خیمے میں تشریف فرما ہیں۔ جب پہلی مرتبہ چہرے پر نظر پڑی تو چہرہ دیکھ کر دل کی دنیا بدلنے لگی۔ اس نے آ کر سوال کیا کہ آپ کیا پیغام لے کر آئے ہیں؟ اور خیبر پر حملہ کیوں کیا ہے؟ نبی کریم سرورِ دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے مختصراً اس کو بتایا کہ میرا پیغام یہ ہے کہ اس کائنات میں سوائے اللہ تعالیٰ کے کوئی اور معبود نہیں، لہٰذا تم اس کے علاوہ کسی کی عبادت نہ کرو، اسی کو اپنا معبود قرار دو، یہ شرک کرنا چھوڑ دو۔ وہ چرواہا سیدھا سادہ آدمی تھا، سرکار دوعالم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی زیارت اس طرح اچانک ہوئی اور آپ کے یہ کلمات کان میں پڑے اور دل میں اتر گئے اور دل کی دنیا بدلنے لگی۔

ایک مسلمان کے حقوق

پھر اس نے کہا کہ اچھا یہ بتائیں کہ اگر میں آپ کی بات مان لوں اور میں

یہ کلمہ "اشہد ان لا الہ الا اللہ و اشہد ان محمدا رسول اللہ" پڑھ لوں تو اس وقت میرے کیا حقوق ہوں گے؟ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ تمہارے حقوق یہ ہوں گے کہ ہم تمہیں سینے سے لگائیں گے اور تم ہمارے بھائی بن جاؤ گے اور جو حقوق دوسرے تمام مسلمانوں کو حاصل ہیں وہی حقوق تمہیں بھی حاصل ہوں گے۔ اس چرواہے نے کبھی یہ سوچا بھی نہیں تھا کہ کسی ملک کا بادشاہ اس سے یہ کہے کہ میں تمہیں سینے سے لگاؤں گا۔ اس نے کہا کہ آپ اتنے بڑے ملک کے بادشاہ ہیں اور آپ مجھ سے مذاق کر رہے ہیں؟ کیا آپ مجھے سینے سے لگائیں گے، جبکہ میں سیاہ فام ہوں، بدصورت ہوں اور میرے بدن سے بدبو اٹھ رہی ہے۔ اس حالت میں آپ مجھے کیسے سینے سے لگائیں گے؟ اور کس طرح آپ مجھے اپنے جیسا سمجھیں گے؟

سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ اسلام وہ دین ہے کہ اسلام لانے کے بعد تمام انسان برابر ہو جاتے ہیں۔ کسی کو کسی پر فوقیت نہیں رہتی۔ ہم واقعتاً تمہیں سینے سے لگائیں گے، تم جو کہتے ہو کہ میرا چہرہ سیاہ ہے، میں بدصورت ہوں، میرا جسم سیاہ ہے، تو میں اس بات کی گواہی دیتا ہوں کہ جب تم اللہ تعالیٰ کے سامنے پیش ہو گے تو اللہ تعالیٰ تمہارے چہرے کی سیاہی کو سفیدی سے بدل دیں گے۔ اور تم جو یہ کہہ رہے ہو کہ میرے جسم سے بدبو اٹھ رہی ہے تو جب تم اللہ تعالیٰ کے حضور پہنچو گے تو اللہ تعالیٰ تمہارے جسم کو خوشبوؤں سے مہکا دیں گے۔

تلواروں کے سائے میں ہونے والی عبادت

جب یہ باتیں سنیں تو چرواہے نے کہا کہ اگر یہ بات سچ کہہ رہے ہیں اور آپ اس کی گارنٹی لیتے ہیں تو پھر میں مسلمان ہوتا ہوں۔

"اشھد ان لا الہ الا اللہ و اشھد ان محمدا رسول اللہ"

یہ کہہ کر مسلمان ہوگیا۔ اللہ تعالیٰ نے ایمان کی توفیق عطا فرمادی۔ پھر اُس نے کہا اب میں آپ کے تابع ہوں جو آپ کہیں گے وہ میں کروں گا بتایئے میں کیا کروں؟ سرکارِ دوعالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ تم ایسے وقت مسلمان ہوئے ہو کہ اس وقت نہ تو نماز کا وقت ہے کہ میں تم سے نماز پڑھواؤں، نہ رمضان کا مہینہ ہے کہ تم سے روزہ رکھواؤں، نہ تم مالدار ہو کہ تم سے زکوٰۃ دلواؤں اور حج تو اس وقت فرض ہی نہیں ہوا تھا، لہٰذا اس وقت تو کسی اور عبادت کا تو موقع نہیں ہے، البتہ اس وقت اللہ تعالیٰ کی ایک عبادت ہو رہی ہے جو تلواروں کے سائے میں ادا کی جاتی ہے یعنی جہاد، لہٰذا تم بھی جہاد میں شامل ہو جاؤ۔

سیدھے جنت الفردوس میں جاؤ گے

اس نے کہا یارسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)! میں جہاد میں شامل تو ہو جاؤں لیکن جب آدمی جہاد میں شامل ہوتا ہے تو دونوں احتمال ہوتے ہیں یا غازی ہوگیا یا مرگیا، اب اگر میں اس جہاد میں مرگیا تو میرا انجام کیا ہوگا؟ سرکار دوعالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: "میں اس بات کی ضمانت دیتا ہوں کہ اگر تم اس جہاد میں کام آگئے تو اللہ تعالیٰ کے حکم سے سیدھے جنت الفردوس میں پہنچو گے اور تمہارے جسم کی سیاہی کو سفیدی سے بدل دیں گے اور تمہارے جسم کی بدبو کو خوشبو سے بدل دیں گے۔"

بکریاں واپس چھوڑ آؤ

اس نے کہا کہ یارسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)! میں یہ بکریاں لے آیا ہوں یہ

یہودیوں کی بکریاں میرے پاس ہیں ان کا کیا کروں؟ حضور اقدس ﷺ نے فرمایا کہ پہلے ان بکریوں کو لے جاکر شہر کے اندر چھوڑ دو تاکہ یہ بکریاں اپنے گھروں میں چلی جائیں، حالانکہ یہ جنگ کا زمانہ ہے اور یہودیوں کے ساتھ جنگ ہو رہی ہے اور حالتِ جنگ میں تو کافروں کا مال بھی قبضہ کر لینا جائز ہوتا ہے، لیکن یہ چرواہا وہ بکریاں بطور امانت لے کر آیا تھا اس لیے حضورِ اقدس ﷺ نے یہ حکم دیا کہ پہلے جاکر یہ بکریاں چھوڑ آؤ۔

حقوق العباد کی اتنی رعایت

یہ ہیں ''حقوق العباد''، یعنی بندوں کے حقوق۔ عین حالتِ جنگ میں بھی اس بات کو فراموش نہیں فرمایا کہ یہ بندے کا حق ہے اور کس بندے کا حق ہے؟ یہ اس بندے کا حق ہے جس کی جان لینے کے لیے گئے ہوئے ہیں، جس کے ساتھ لڑائی ہو رہی ہے، جس کے ساتھ جہاد ہو رہا ہے، جس پر حملہ کیا جا رہا ہے، یہ ان بندوں کا حق ہے۔ اس لیے آپ ﷺ نے فرمایا کہ پہلے یہ بکریاں چھوڑ کر آؤ، اس کے بعد جہاد میں شامل ہونا۔ چنانچہ وہ چرواہا واپس گیا اور بکریاں چھوڑ کر واپس آیا اور آکر جہاد میں شامل ہو گیا۔

تم نہیں پہچانتے، لیکن میں پہچانتا ہوں

جب جہاد ختم ہوا تو سرکارِ دو عالم ﷺ کا معمول تھا کہ جہاد ختم ہونے کے بعد جو حضرات زخمی ہوتے تھے یا شہید ہو جاتے تھے ان کے معائنے کے لیے تشریف لے جاتے تھے۔ حسبِ معمول حضورِ اقدس ﷺ معائنے کے لیے تشریف لے گئے۔ آپ نے جاکر دیکھا کہ ایک جگہ پر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا ہجوم

جمع ہے۔ آپ نے جا کر پوچھا کہ کیا قصہ ہے؟ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے فرمایا کہ یا رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)! یہاں پر ایک صاحب کی لاش نظر آ رہی ہے اور اس کو ہم میں سے کوئی نہیں پہچانتا کہ یہ کون ہیں؟ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے قریب جا کر دیکھا تو فرمایا تم اس کو نہیں پہچانتے، لیکن میں اس کو پہچانتا ہوں۔ یہ وہ اللہ کا بندہ ہے، جس نے اللہ کے راستے میں ایک سجدہ نہیں کیا، جس نے اللہ کے راستے میں ایک پیسہ خرچ نہیں کیا، لیکن میری آنکھیں دیکھ رہی ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اس کو سیدھا جنت الفردوس میں پہنچا دیا اور آپ نے فرمایا کہ میری آنکھیں دیکھ رہی ہیں کہ اس کو اللہ تعالیٰ کے یہاں مشک وعنبر سے غسل دیا جا رہا ہے اور اس کے جسم کو خوشبوؤں سے مہکایا جا رہا ہے۔ (1)

ایک مرتبہ اس کلمے کا اقرار کر لیجیے

بہرحال! یہ کلمہ ''لا الہ الا اللہ'' ایسا عجیب وغریب کلمہ ہے کہ اگر اس کلمے کے پڑھنے سے پہلے انسان مرجائے تو جہنم میں جائے گا اور اس کے پڑھنے کے بعد مرے، تو اللہ تعالیٰ اس کو جنت الفردوس عطا فرماتے ہیں۔ اس کلمے کی بدولت انسان ایک لمحہ میں کہاں سے کہاں پہنچ جاتا ہے۔ اس لیے حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنے چچا ابو طالب کے پاس ان کے مرض وفات میں گئے اور ان سے فرمایا کہ خدا کے لیے ایک مرتبہ ''لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ'' کا اقرار کر لیجیے آگے میں نمٹ لوں گا، لیکن چونکہ ایمان ان کے مقدر میں نہیں تھا اس لیے کلمہ پڑھنے کی توفیق نہ ہوئی اور اقرار کیے بغیر دنیا سے چلے گئے اور حضورِ اقدس سرورِ

(1) دلائل النبوۃ للبیہقی ج ٤ ص ٢٢٠ باب ما جاء فی قصۃ العبد الاسود الذی اسلم یوم خیبر علی باب خیبر وقتل۔

دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی انتہائی مدد کے باوجود ایمان نصیب نہ ہوا(۱)۔

یہ کلمہ ایک عہد اور ایک اقرار ہے

بہر حال! اب دیکھنے کی بات یہ ہے کہ یہ کیسا کلمہ ہے جو ایک لمحے میں انسان کو کفر سے اسلام کے اندر داخل کر دیتا ہے۔ جہنم سے جنت میں پہنچا دیتا ہے۔ مبغوض سے محبوب بنا دیتا ہے۔ کیا یہ کلمہ کوئی منتر ہے؟ کوئی جادو ہے کہ جس آدمی نے کلمہ پڑھا وہ فوراً جہنم پروف ہو گیا؟ حقیقت میں یہ کلمہ منتر اور جادو نہیں، بلکہ یہ کلمہ پڑھنے والے کی طرف سے ایک اقرار اور ایک عہد ہے کہ میں اس کائنات میں اگر بات مانوں گا تو صرف اللہ کی بات مانوں گا۔ اگر معبود مانوں گا تو صرف اللہ کو معبود مانوں گا اور معبود ماننے کا مطلب یہ ہے کہ میرے نزدیک اطاعت کے لائق اگر کوئی ذات ہے تو وہ صرف اللہ کی ذات ہے، اس کے مقابلے میں میں کسی کی بات نہیں مانوں گا چاہے وہ میرا باپ ہو یا میری ماں ہو یا میرا بیٹا ہو یا میرا دوست ہو یا میرا عزیز ہو یا میرے نفسانی جذبات آ جائیں، لیکن میں ان کی بات نہیں مانوں گا۔ میں صرف اللہ تعالیٰ کی بات مانوں گا۔ یہ ایک اقرار اور معاہدہ ہے جو ایک انسان لا الہ الا اللہ پڑھ کر کرتا ہے۔

اس کلمے کے ذریعے ساری مخلوقات کی نفی

اور صرف زبان سے ''لا الہ الا اللہ'' کہہ دینا کافی نہیں، بلکہ دل سے اقرار کرنا اور دل سے تصدیق کرنا اور اللہ تعالیٰ کے ساتھ یہ معاہدہ کرنا ہے کہ یا اللہ!

---

(۱) صحیح البخاری ۹۵/۲ (۱۳۶۰)۔

میں نے آج سے ہر مخلوق سے اطاعت کا تعلق کاٹ کر آپ کے ساتھ یہ تعلق جوڑ لیا ہے۔ ''لا الہ'' کے اندر نفی ہے اور عربی زبان کے قاعدے کے لحاظ سے یہ ''نفی جنس'' ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ میں ساری مخلوقات، ساری کائنات کی نفی کر رہا ہوں کہ وہ میرے معبود نہیں۔ وہ قابلِ اطاعت نہیں۔ اصل قابلِ اطاعت اور قابلِ عبادت صرف اللہ تعالیٰ کی ذات ہے۔ میں اسی کی بات مانوں گا اور اسی کی عبادت کروں گا۔ یہ اصل اقرار ہے جو انسان کو جہنم سے جنت میں پہنچا دیتا ہے اور جو انسان کو اللہ کے مبغوض ہونے سے نکال کر محبوب بنا دیتا ہے اور یہ اقرار انسان کو کفر سے ایمان میں لاتا ہے۔

اس کلمے میں کن باتوں کا اقرار ہے؟

بہرحال! اس کلمے میں اس بات کا اقرار ہے کہ میں اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کی عبادت نہیں کروں گا اور اس بات کا بھی اقرار ہے کہ میں اللہ تعالیٰ کے سوا کسی پر بھروسہ نہیں کروں گا۔ توکل اور بھروسہ صرف اللہ تعالیٰ پر کروں گا کسی مخلوق پر نہیں کروں گا۔ اس بات کا اقرار ہے کہ مجھے اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کا خوف نہیں ہوگا اور صحیح معنی میں محبت اللہ کے سوا کسی سے نہیں ہوگی۔ رضا جوئی اور خوشنودی سوائے اللہ کے کسی اور کی مقصود نہیں ہوگی۔ ان سب باتوں کے مجموعے کا نام ''توحید'' ہے۔ محض زبان سے کلمہ ''لا الہ الا اللہ'' ایک مرتبہ پڑھ دینا توحید کا مقام پیدا نہیں کرتا۔

مجھے میرا اللہ بچائے گا

اور جب دل میں ''توحید'' سما جاتی ہے تو پھر یہ حالت ہو جاتی ہے کہ ایک مرتبہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم ایک درخت کے نیچے آرام فرما رہے تھے، ایک دشمن چپکے سے وہاں پہنچ گیا اور تلوار اٹھا کر حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم پر حملہ آور ہوا اور کہا کہ اے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم)! بتاؤ اب تمہیں میرے ہاتھ سے کون بچائے گا؟ اس وقت سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نہتے ہیں اکیلے ہیں اور ایک دشمن حملہ آور ہے اور وہ دشمن پوزیشن لیے کھڑا ہے اور ایک لمحے میں آپ کا کام تمام کر سکتا ہے، لیکن اس وقت جو جملہ آپ کی زبانِ مبارک پر آتا ہے وہ یہ ہے کہ

''مجھے میرا اللہ بچائے گا''۔

یعنی اگر اللہ تعالیٰ کا مقدر کیا ہوا وقت آ گیا تو پھر مجھے کوئی نہیں بچا سکتا۔ اور اگر وہ وقت نہیں آیا تو پھر تم کیا، بلکہ ہزاروں افراد بھی تلوار لے کر آ جائیں تب بھی مجھے کچھ نقصان نہیں پہنچا سکتے۔ یہ ہے اصل مقام ''توحید'' کا کہ ڈر اللہ کے سوا کسی کا نہیں اور بھروسہ اللہ کے علاوہ کسی پر نہیں[1]۔

وہ خزانوں کو ٹھکرا دے گا

شیخ سعدی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں[2] ؎

موحد چہ در پائے ریزی زرش
چہ شمشیر ہندی نہی بر سرش

(۱) صحیح البخاری ۱۱۶/۵ (۴۱۳۹)۔

(۲) گلستان سعدی باب ہشتم در آداب صحبت حکمت نمبر ۱۰۳۔

امید و ہراسش نباشد زکس
بریں ست بنیادِ توحید و بس

فرمایا: موحّد وہ ہے کہ اس کے پاؤں پر سونے کے خزانے لا کر ڈھیر کر دو اور اس سے کہہ دو کہ یہ خزانے تمہیں اس وقت ملیں گے جب تم اللہ تعالیٰ کے اس حکم کے خلاف یہ کام کرلو تو وہ خزانوں کو ٹھکرادے گا۔ اس لیے کہ اس نے خزانوں کو اپنا معبود نہیں بنایا، بلکہ اللہ کو اپنا معبود بنایا ہے اور اگر تم موحّد کے سر پر تلوار سونت کر کھڑے ہوجاؤ کہ یہ کام کر، ورنہ تیرا کام تمام ہوتا ہے تو اس وقت بھی وہ اللہ تعالیٰ کے حکم کے خلاف کام نہیں کرے گا۔ مومن کو خدا کے سوا نہ کسی سے کوئی امید قائم ہوتی ہے اور نہ خدا کے سوا کسی کا خوف ہوتا ہے۔ بس انہی باتوں پر توحید کی بنیاد ہے۔

حضرت عبداللہ بن حذافہ رضی اللہ عنہ

حضرت عبداللہ بن حذافہ رضی اللہ عنہ ایک مشہور صحابی ہیں۔ امیر المؤمنین حضرت فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ نے ان کو ایک جہاد کے لیے سپہ سالار بنا کر کسی کافر بادشاہ کے خلاف بھیجا۔ جب لڑائی ہوئی تو مسلمان مغلوب ہوگئے اور اس نے سارے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو گرفتار کرلیا۔ حضرت عبداللہ بن حذافہ رضی اللہ عنہ جو لشکر کے سپہ سالار تھے وہ بھی گرفتار ہوگئے اور سارے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم گرفتار ہوگئے۔ گرفتار کرکے اس نے اس بات پر اصرار کیا کہ تم اسلام چھوڑ دو اور اگر تم میری بات نہیں مانو گے تو تمہیں اذیت ناک موت کا نشانہ بنایا جائے گا۔ ان صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے دلوں میں ایمان پختہ ہوچکا تھا انہوں نے جواب دیا کہ ہم اسلام نہیں چھوڑیں گے۔ پھر اس نے ایک آگ جلوائی اور اس کے اوپر تیل کی

بڑی کڑاہی چڑھائی اور تیل خوب گرم کیا، جب وہ گرم ہوگیا تو ایک آدمی جو ان کے پاس قید تھا اس کو اس گرم تیل میں ڈال دیا۔ تاریخ میں لکھا ہے کہ وہ تیل اتنا شدید گرم تھا کہ جیسے ہی اس کو ڈالا اس کے ہاتھ پاؤں اسی وقت الگ ہوگئے۔ اس کے بعد اس بادشاہ نے حضرت عبداللہ بن حذافہ رضی اللہ عنہ سے کہا کہ یہی انجام تمہارا بھی ہونے والا ہے، الّا یہ کہ توحید کے اقرار سے باز آجاؤ۔

تم مجھے انجام سے ڈراتے ہو؟

جب حضرت عبداللہ بن حذافہ رضی اللہ عنہ نے یہ منظر دیکھا تو جواب میں فرمایا کہ تم مجھے اس انجام سے ڈراتے ہو؟ ارے! میں وہ شخص ہوں کہ جب سے میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا جلوہ دیکھا ہے، اس وقت سے ہر نماز کے بعد یہ دعا کرتا ہوں کہ یا اللہ! مجھے اس وقت تک دنیا سے نہ اٹھایئے گا، جب تک میرے جسم کا ایک ایک عضو آپ کے راستے میں زخموں سے چُور نہ ہوجائے۔ تم مجھے اس بات سے ڈراتے ہو کہ تمہیں اس کڑاہی میں ڈال دوں گا، اگر تم ایسا کرنا چاہتے ہو تو یہ تو عین میری دعا کی قبولیت کا وقت آگیا ہے، اس بادشاہ نے بھی اپنی زندگی میں ایسا آدمی نہیں دیکھا تھا جو یہ کہے کہ میری خواہش یہ ہے کہ اللہ کے راستے میں میرا سارا جسم زخموں سے چور ہوجائے، اُس کے دل پر اِس بات کا رعب پڑا کہ یہ شخص کس مقام پر ہے، کیا اس کا دل ہے، کیا اس کے جذبات ہیں؟ چنانچہ اس کے دل میں کچھ نرمی آگئی۔

کلمۂ کفر کہنا کب جائز ہے؟

اس کافر بادشاہ نے کہا کہ اگر تم اپنے دین پر اتنے ڈٹے ہوئے ہو اور اس

کو چھوڑنا نہیں چاہتے تو چلو میں تمہارے ساتھ رعایت کرتا ہوں اور میں تم سے اس بات کا مطالبہ نہیں کرتا کہ ایمان چھوڑ دو۔ البتہ اگر تم ایک کام کراو تو میں تمہیں چھوڑ دوں گا اور آزاد کردوں گا۔ حضرت عبد اللہ بن حذافہ رضی اللہ عنہ نے پوچھا کہ کیا کام؟ اس نے کہا کہ تم اور تمہارے سب ساتھی میری پیشانی کا بوسہ دیں، جو بوسہ دیتا جائے گا، میں اس کو چھوڑ دوں گا۔ اب کافر اور مشرک کی پیشانی کو بوسہ دینا، یہ اس کی عظمت اور توقیر کے مترادف ہے، یہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم دین کی حدود کو پہچاننے والے تھے۔ وہ کہہ سکتے تھے کہ تو کافر اور مشرک ہے ہم تیری پیشانی پر کیوں بوسہ دیں، لیکن چونکہ شریعت کا حکم یہ ہے کہ اگر کوئی شخص تمہارے سینے پر تلوار رکھ کر یہ کہے کہ تم کافر ہوجاؤ اور اپنی زبان سے کفر کا کلمہ نکالو تو اس وقت کفر کا کلمہ زبان سے نکالنا جائز ہوجاتا ہے، بشرطیکہ دل ایمان پر مطمئن ہو،(۱) لیکن اس وقت بھی افضل یہ ہے کہ زبان سے کلمہ کفر نہ نکالے اور جان دے دے۔

اس وقت اس گناہ کا ارتکاب کرلے

لیکن اگر کوئی شخص تمہیں کسی گناہ کے ارتکاب پر مجبور کرے، مثلاً یہ کہے کہ تم شراب پیو ورنہ میں تمہیں قتل کردوں گا یا مثلاً کہے کہ سور کا گوشت کھاؤ، ورنہ تمہیں قتل کردوں گا۔ اس وقت میں شریعت کا حکم یہ ہے کہ اپنی جان بچانے کے لیے اس گناہ کا ارتکاب واجب ہوجاتا ہے، بلکہ اس وقت گناہ کا ارتکاب نہ کرنا حرام ہے۔ اس لیے اپنی جان کا حق یہ ہے کہ اس کو بچائے اور اس گناہ کا ارتکاب کرلے، اگر نہیں کرے گا تو گناہ گار ہوگا۔

(۱) ملاحظہ: وسورۃ النحل الآیۃ (۱۰۶).

کافر کی پیشانی کو بوسہ دینا

بہرحال! جب کافر بادشاہ نے کہا تھا کہ اپنا دین چھوڑ دو ورنہ تمہیں اس کڑاہی میں ڈال دوں گا اس وقت افضل راستہ یہی تھا کہ جان دے دیتے اور کلمہ کفر زبان سے نہ نکالتے۔ چنانچہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے کلمہ کفر نہیں نکالا۔ لیکن جب اس کافر بادشاہ نے یہ کہا کہ میری پیشانی پر بوسہ دے دو تو تمہیں چھوڑ دیں گے تو کافر کی تعظیم کرنا اور اس کی پیشانی پر بوسہ دینا کفر نہیں بلکہ گناہ ہے۔ اب شریعت کا حکم یہ تھا کہ اس بات کو مان لیا جائے۔ نہ کہ اس کی بات نہ مان کر اپنی جان کو اور اپنے ساتھیوں کی جان کو خطرے میں ڈالا جائے۔ چنانچہ حضرت عبداللہ بن حذافہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ ہاں مجھے یہ منظور ہے میں بھی تمہاری پیشانی پر بوسہ دوں گا اور میرے ساتھی بھی دیں گے۔

دین نام ہے حدود کو پہچاننے کا

درحقیقت دین نام ہے حدود پہچاننے کا، یہ نہیں کہ جب ایک جذبہ دل میں آگیا تو اب اس کے نتیجے میں شریعت کے دوسرے پہلو نظروں سے اوجھل ہوگئے مثلاً دل میں یہ جذبہ آگیا کہ اللہ کے راستے میں جان دینی ہے چاہے وہ جان دینا شریعت کے حکم کے مطابق ہو یا شریعت کے حکم کے مطابق نہ ہو۔ یہ بات درست نہیں۔ صحیح بات یہ ہے کہ اللہ کے راستے میں جان دینی ہے تو وہ بھی اللہ کے حکم کے مطابق دینی ہے۔ اللہ کے حکم کے خلاف نہیں دینی۔ اگر اللہ کا اور شریعت کا حکم آجائے کہ اس وقت جان مت دو تو اب نہیں دینی۔ اس لیے کہ یہ جان بھی بہت قیمتی ہے اور اللہ کا حکم یہ ہے کہ اپنی اس جان کی بھی حفاظت کرو۔

○ تم نے یہ کام شریعت کی اتباع میں کیا

بہر حال! حضرت عبد اللہ بن حذافہ رضی اللہ عنہ نے اس کافر بادشاہ کی پیشانی پر بوسہ دیا اور اپنے سب ساتھیوں سے کہا کہ بوسہ دو۔ چنانچہ سب نے بوسہ دیا اور بوسہ دے کر پورے لشکر کو بچا کر مدینے کی طرف روانہ ہوگئے۔ ادھر جب فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کو اطلاع ملی کہ یہ واقعہ پیش آیا اور حضرت عبد اللہ ابن حذافہ رضی اللہ عنہ نے اپنے ساتھیوں کے ساتھ مدینہ آرہے ہیں تو حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ صحابہ کرام کی جمعیت کو لے کر اُن کے استقبال کے لیے مدینہ منورہ سے باہر نکلے اور جب وہ لشکر مدینہ پہنچا تو حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے حضرت عبد اللہ بن حذافہ رضی اللہ عنہ اور لشکر کے ایک ایک ساتھی کی پیشانی پر خود بوسہ دیا اور فرمایا کہ چونکہ تم نے یہ کام شریعت کے حکم کے مطابق کیا اور شریعت کی اتباع میں کیا، اس لیے میں تمہاری پیشانی پر بوسہ دیتا ہوں [1]۔

○ اللہ کے حکم کے آگے سرِ تسلیم خم کردو

یہ ہے کلمہ ''لا الہ الا اللہ'' کا تقاضا اور یہ ہے ''توحید'' کہ جہاں اللہ تعالیٰ کا حکم آجائے تو وہاں جان کی بھی پرواہ نہیں۔ اب ایک طرف تو اللہ کے راستے میں شہادت حاصل کرنے کا اتنا شوق لگا ہوا ہے کہ ہر نماز میں یہ دعا مانگ رہے ہیں کہ یا اللہ! میں شہید ہوجاؤں۔ جب شہادت کا موقع آیا تو اللہ کے حکم کی خاطر شہادت کے اس موقع کو چھوڑ دیا کہ نہیں! اب مجھے اپنی جان کی حفاظت

(۱) شعب الایمان للبیہقی ۱۷۹/۲ (۱۵۲۲)۔

کرنی ہے۔ اس کا نام ہے ''توحید'' صرف زبان سے کلمہ ''لا الہ الا اللہ'' پڑھ لینا کافی نہیں، بلکہ درحقیقت یہ اس بات کا اقرار اور عہد ہے کہ اطاعت کسی کی نہیں کروں گا سوائے اللہ کے، عبادت کسی کی نہیں کروں گا سوائے اللہ کے، محبت کسی سے نہیں کروں گا سوائے اللہ کے۔ یعنی مخلوق میں سے جس کسی سے محبت ہوگی وہ اللہ تعالیٰ کے حکم کی وجہ سے ہوگی۔ مثلاً ماں باپ سے محبت کرو اس لیے کہ اللہ تعالیٰ کا حکم ہے، لیکن جہاں ماں باپ کی محبت میں اور اللہ تعالیٰ کی محبت میں تعارض ہوجائے تو اس وقت اللہ تعالیٰ کی محبت کو ترجیح ہوگی۔ اسی طرح بیوی اور شوہر سے محبت ہو تو وہ صرف اللہ کے لیے ہو۔ لیکن جہاں ان کی محبت کا اللہ تعالیٰ کی محبت سے تعارض ہوجائے تو وہاں اللہ تعالیٰ کی محبت کو ترجیح ہوگی۔

کلمہ ''لا الہ الا اللہ'' کا مطلب

اور کلمہ ''لا الہ الا اللہ'' کا مطلب یہ ہے کہ ''لا معبود إلا اللہ''، ''لا مقصود الا اللہ''، ''لا موجود الا اللہ'' ''لا مطلوب الا اللہ''، ''لا محبوب الا اللہ''۔

اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں، کوئی مقصود نہیں، کوئی موجود نہیں، کوئی مطلوب نہیں۔ کوئی محبوب نہیں۔ کوئی قابلِ اطاعت نہیں۔ اس لیے اس حدیث میں حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ''افضلها قول لا الہ الا اللہ'' کہ ایمان کے تمام شعبوں میں افضل ترین شعبہ لا الہ الا اللہ ہے۔

سب سے افضل ذکر ''لا الہ الا اللہ''

چونکہ یہ کلمہ اس عظیم اقرار اور عہد کی علامت ہے۔ اس لیے کہا گیا ہے کہ

تمام اذکار میں سب سے افضل ذکر "لا الہ الا اللہ" ہے۔ چنانچہ حدیث شریف میں حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"افضل الذکر لا الہ الا اللہ"(۱)

اس لیے یہ اتنا جامع ذکر ہے کہ اس میں سب کچھ آجاتا ہے اور یہ بات کہ ایک مسلمان کے دل میں بیٹھ جائے کہ اللہ کے سوا کوئی قابلِ اطاعت نہیں۔ اس کلمے کے ذکر کی برکت سے اللہ تعالیٰ یہ بات دل میں بٹھادیتے ہیں، اس لیے بزرگ فرماتے ہیں کہ لا الہ الا اللہ کا ذکر کثرت سے کرو۔ چلتے پھرتے، اٹھتے بیٹھتے یہ کلمہ زبان پر ہو۔ جب زبان سے کثرت سے یہ ذکر کروگے تو اس کی کیفیت دل کے اندر منتقل ہوگی اور اس کلمے کا نور اس کی برکات قلب کے اندر منتقل ہوں گی اور پھر وہ قلب اللہ تعالیٰ کی توحید کا رنگ اپنے اندر اپنا لے گا اور جس دن توحید کا یہ رنگ دل میں اور دماغ میں، اعضاء میں، جوارح میں سماگیا، اس دن دنیا کی تمام دولتیں اللہ تعالیٰ کی رضامندی کے آگے ہیچ نظر آئیں گی، اس لیے ایمان کا سب سے افضل شعبہ لا الہ الا اللہ کو قرار دیا ہے۔

حضرت مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا تکیہ کلام

اس کو حاصل کرنے کا راستہ یہ ہے کہ آدمی اس بات کو سوچتا رہے اور کثرت سے اس کلمہ کا ذکر کرتا رہے، چلتے پھرتے، اٹھتے بیٹھتے کلمہ پڑھنے کی عادت ڈالے۔ میں نے اپنے والدِ ماجد حضرت مفتی محمد شفیع صاحب قدس اللہ سرہ

---

(۱) سنن الترمذی ۳۲۵/۵ (۳۳۸۳) وقال هذا حديث حسن غريب لا نعرفه الا من حديث موسى بن ابراهيم۔

کو دیکھا کہ ان کا تکیہ کلام ہی یہ تھا ''لا الہ الا اللہ'' چلتے پھرتے بس یہی پڑھتے رہتے اور باتیں کرنے کے دوران بھی، جب درمیان میں رکے تو فوراً ''لا الہ الا اللہ'' پڑھتے۔

زبان سے جو کلمہ نکل رہا ہے اس کو بے حقیقت نہیں سمجھنا چاہیے۔ یہ زبان دل کو درست کرنے کی پہلی سیڑھی ہے۔ اگر زبان سے کثرت سے اس کا ذکر ہوتا رہے تو اللہ تعالیٰ رفتہ رفتہ اس کا رنگ دل کی طرف بھی منتقل فرما دیتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ اپنے فضل وکرم سے ہم سب کو ان باتوں پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین۔
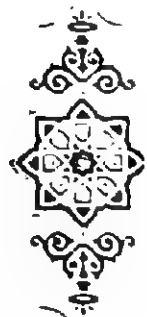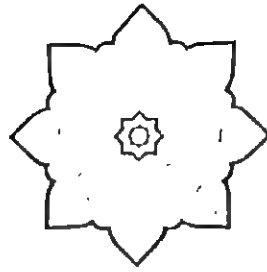
ایمانِ کامل کی چار علامتیں

(اصلاحی خطبات ج ۹ ص ۲۷)
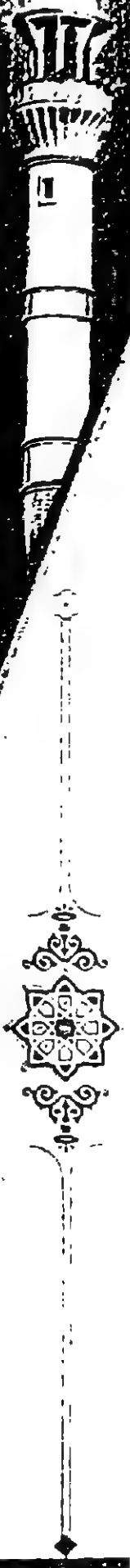
بسم اللہ الرحمن الرحیم

ایمانِ کامل کی چار علامتیں

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ نَحْمَدُہٗ وَنَسْتَعِیْنُہٗ وَنَسْتَغْفِرُہٗ وَنُؤْمِنُ بِہٖ وَنَتَوَکَّلُ عَلَیْہِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَیِّئَاتِ اَعْمَالِنَا، مَنْ یَّھْدِہِ اللّٰہُ فَلَا مُضِلَّ لَہٗ وَمَنْ یُّضْلِلْہُ فَلَاھَادِیَ لَہٗ وَاَشْھَدُ اَنْ لَّا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَاشَرِیْکَ لَہٗ وَاَشْھَدُ اَنَّ سَیِّدَنَا وَنَبِیَّنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَعَلٰی اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَبَارَکَ وَسَلَّمَ تَسْلِیْمًا کَثِیْرًا کَثِیْرًا۔

أَمَّا بَعْدُ!

" مَنْ أَعْطٰی لِلّٰہِ وَمَنَعَ لِلّٰہِ وَأَحَبَّ لِلّٰہِ وَأَبْغَضَ لِلّٰہِ

فَقَدِ اسْتَکْمَلَ اِیْمَانَهٗ"(۱)

جنابِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

"جو شخص کسی کو کچھ دے تو اللہ کے لیے دے، اور کسی کو دینے سے منع کرے تو اللہ کے لیے منع کرے، اگر کسی سے محبت کرے تو اللہ کے لیے کرے اور اگر کسی سے بغض اور عناد رکھے تو اللہ کے لیے رکھے، تو اس شخص کا ایمان کامل ہوگیا۔"

حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس کے ایمان کے کامل ہونے کی گواہی دی۔

پہلی علامت

ایمانِ کامل کی پہلی علامت یہ بیان فرمائی کہ وہ دے تو اللہ کے لیے دے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر کوئی شخص کسی موقع پر کچھ خرچ کر رہا ہے تو اس خرچ کرنے میں اللہ تعالیٰ کو راضی کرنے کی نیت ہو۔ انسان اپنی ذات پر بھی

(۱) سنن ابی داود ۲۲۰/٤ (٤٦٨١) من حدیث ابی امامه، وقال المنذری فی "مختصره" ۲۷۱/۳ (٤٥۲۰)-طبع مکتبة المعارف الریاض: وفی اسناده القاسم بن عبد الرحمن ابو عبد الرحمن الشامی، وقد تکلم فیه غیر واحد. وسنن الترمذی ۲۸۸/٤ (۲۵۲۰) من حدیث معاذ بن انس الجهنی، وقال الترمذی: هذا حدیث منکر وذکره المنذری فی "الترغیب والترہیب" ١٤/٤-طبع دار الکتب العلمیة، وقال رواه احمد والترمذی وقال حدیث منکر والحاکم وقال صحیح الاسناد والبیهقی وغیرهم. وذکره نجم الدین الغزی فی "حسن التنبه" ۲۸۲/۲-طبع دار النوادر، معزوا الی ابی داود وقال باسناد حسن۔

خرچ کرتا ہے، اپنے اہل وعیال پر بھی خرچ کرتا ہے اور صدقہ و خیرات بھی کرتا ہے تو ان تمام مواقع پر خرچ کرتے وقت اللہ تعالیٰ کو راضی کرنے کی نیت ہو۔ صدقہ خیرات میں تو یہ بات واضح ہے کہ اس کو دیتے وقت یہ نیت ہونی چاہیے کہ میں اللہ تعالیٰ کو راضی کرنے کے لیے صدقہ دے رہا ہوں اور اللہ تعالیٰ اپنے فضل وکرم سے اس کا ثواب مجھ کو عطا فرمادیں۔ اس صدقہ دینے میں احسان جتانا مقصود نہ ہو، نام ونمود مقصود نہ ہو، دکھاوا مقصود نہ ہو، تو یہ دینا اللہ کے لیے ہوا۔

خرید وفروخت کے وقت یہ نیت کرلیں

صدقہ خیرات کے علاوہ بھی جہاں خرچ کروتو وہاں بھی اللہ تعالیٰ کو راضی کرنے کی نیت کرلو۔ مثلاً فرض کریں کہ آپ نے کوئی چیز خریدی اور دکان دار کو پیسے دے دیے۔ اب بظاہر تو یہ ایک دنیاوی معاملہ ہے، لیکن اگر وہ چیز مثلاً گوشت، ترکاری خریدتے وقت یہ نیت کرلی کہ اللہ تعالیٰ نے میرے اہل وعیال کے جو حقوق میرے ذمے عائد کررکھے ہیں، ان حقوق کی ادائیگی کے لیے یہ خریداری کررہا ہوں اور اگر اسی طرح دوسری نیت یہ کرلی کہ میں دکاندار کے ساتھ خرید وفروخت کا جو معاملہ کررہا ہوں وہ اللہ تعالیٰ کے بتائے ہوئے اس حلال طریقے کے مطابق کررہا ہوں جو طریقہ اللہ تعالیٰ نے میرے لیے جائز کیا ہے اور حرام طریقے سے معاملہ نہیں کررہا ہوں۔ تو ان دو نیتوں کے ساتھ خریداری کا جو معاملہ کیا اور دکاندار کو جو پیسے دیے، یہ دینا اللہ کے لیے ہوا، اگرچہ بظاہر یہ نظر آرہا ہے کہ تم نے ایک دنیاوی لین دین کا معاملہ کیا اور گوشت خریدا یا کپڑا خریدا یا ترکاری خریدی، لیکن یہ دینا اللہ کے لیے ہوا۔

صرف زاویۂ نگاہ بدل لو

ہمارے حضرت ڈاکٹر عبدالحئی صاحب قدس اللہ سرہٗ فرمایا کرتے تھے کہ دین اور دنیا میں صرف زاویۂ نگاہ بدلنے کا فرق ہے۔ اگر زاویۂ نگاہ بدل لو، تو وہی دنیا تمہارے حق میں دین بن جائے گی۔ اس کا طریقہ یہ ہے کہ تم دنیا کے اندر جو کچھ کام کر رہے ہو، سونا، جاگنا، اُٹھنا، بیٹھنا، کھانا، پینا، یہ سب کرتے رہو، مگر ذرا سا زاویۂ نگاہ بدل لو، مثلاً کھانا کھانا ایک دنیاوی کام ہے، لیکن کھانا کھاتے وقت ذرا یہ سوچ لو کہ حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ

"ولنفسك عليك حقا"(۱)

یعنی تمہارے نفس کا بھی تمہارے اوپر کچھ حق ہے۔ اس حق کی ادائیگی کے لیے کھانا کھا رہا ہوں، اور یہ سوچ لو کہ حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے سامنے جب کھانا آتا تو آپ اس کو اللہ تعالیٰ کی نعمت سمجھ کر اس پر شکر کرتے ہوئے کھانا تناول فرمالیا کرتے تھے(۲)۔ میں بھی آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی اسی سنّت کی اتباع میں کھانا کھا رہا ہوں، تو اب یہی دنیا کا کام دین کا کام بن گیا، لہٰذا وہ سارے کام جن کو ہم دنیاوی کام سمجھتے ہیں، ان میں کوئی بھی کام ایسا نہیں ہے جن کو ہم زاویۂ نگاہ کی تبدیلی سے دین نہ بنا سکیں اور اس کو اللہ کے لیے نہ بنا سکیں۔ صبح سے لے کر شام تک کی زندگی میں جتنے کام ہم کرتے ہیں ان کے بارے میں ذرا سوچیں کہ ان کے اندر زاویۂ نگاہ بدل کر کس طرح ان کو دین بنا سکتا ہوں۔

(۱) صحیح البخاری ۳۸/۳ (۱۹۶۸) و ۲۲/۸ (۶۱۳۹)۔
(۲) ملاحظہ ہو زاد المعاد لابن القیم ۱۴۲/۱ فصل هدیه ﷺ فی الطعام، طبع الرسالة.

ہر نیک کام صدقہ ہے

لوگ سمجھتے ہیں کہ صدقہ کرنا صرف اس کا نام ہے کہ آدمی کسی ضرورت مند کو پیسے دے دے یا کسی غریب کو کھانا کھلا دے وغیرہ۔ بس یہ کام صدقہ ہے، اس کے علاوہ کوئی کام صدقہ نہیں، لیکن حدیث میں حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ نیک کام جو نیک نیت سے کیا جائے وہ صدقہ ہے۔(۱) یہاں تک فرمایا کہ کھانے کا وہ لقمہ جو انسان اپنی بیوی کے منہ میں ڈالے یہ بھی صدقہ ہے (۲)۔ یہ صدقہ اس لیے ہے کہ آدمی یہ کام اس لیے کر رہا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے میرے ذمے یہ حق عائد کیا ہے۔ اس حق کی ادائیگی کے لیے میں یہ کام کر رہا ہوں تو اللہ تعالیٰ اس کو اس کام پر صدقہ کا اجر و ثواب عطا فرمائیں گے۔ یہ سب کام اللہ کے لیے دینے میں داخل ہیں۔

دوسری علامت

دوسری علامت یہ بیان فرمائی کہ اگر روکے اور منع کرے تو اللہ کے لیے روکے، مثلاً کسی جگہ پر پیسہ خرچ کرنے سے بچایا تو وہ بچانا بھی اللہ کے لیے ہو، چونکہ اللہ اور اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ فضول خرچی نہ کرو۔(۳)۔ اس فضول خرچی سے بچنے کے لیے میں اپنا پیسہ بچا رہا ہوں۔ تو یہ بچانا اور روکنا اللہ کے لیے ہے یا مثلاً کوئی شخص آپ سے ایسے کام کے لیے پیسوں کا مطالبہ کر رہا ہے جو کام شرعاً ممنوع ہے۔ اب آپ نے اس کام کے لیے اس کو پیسے نہیں دیے تو یہ نہ دینا اللہ کے لیے ہوا۔

---

(۱) صحیح البخاری ۱۱/۸ (۶۰۲۱) بلفظ: "کُلُّ مَعْرُوفٍ صَدَقَةٌ"۔
(۲) صحیح البخاری ۳/۴ (۲۷۴۲) و ۶۸/۵ (۳۹۳۶)۔
(۳) سورۃ الإسراء، آیت (۲۷)۔

٥ رسم کے طور پر ہدیہ دینا

ہمارے معاشرے میں نہ جانے کیسے کیسے رسم و رواج پڑ گئے ہیں کہ اس موقع پر فلاں تحفہ دیا جاتا ہے، اس موقع پر فلاں تحفہ دیا جاتا ہے، اس موقع پر یہ رسم ہے، اگر اس موقع پر نہیں دیں گے تو ناک کٹ جائے گی۔ اب اس موقع پر تحفہ دینے کا نہ تو شریعت نے کوئی حکم دیا اور نہ اللہ اور اللہ کے رسول ﷺ نے کوئی حکم دیا، مثلاً تقریبات اور شادیوں میں ''نیوتہ'' دیا جاتا ہے، اس کو اس قدر لازمی سمجھا جاتا ہے کہ چاہے کسی کے پاس پیسے ہوں یا نہ ہوں، چاہے وہ قرض لے، چاہے وہ حرام طریقے سے کما کر دے یا رشوت لے کر دے، لیکن یہ ''نیوتہ'' ضرور دے، اگر نہیں دے گا تو معاشرے میں ناک کٹ جائے گی۔ اب ایک شخص کے پاس دینے کے لیے پیسے موجود ہیں اور معاشرے کی طرف سے دینے کا مطالبہ بھی ہے، لیکن وہ شخص صرف اس لیے نہیں دے رہا ہے کہ چاہے معاشرے کے اندر ناک کٹ جائے، لیکن میرا اللہ تعالیٰ تو راضی ہوگا۔ اب یہ روکنا اللہ کے لیے ہوگا۔ یہ بھی ایمانِ کامل کی علامت ہے۔

٥ تیسری علامت

تیسری علامت یہ بیان فرمائی کہ اگر محبت کرے تو اللہ کے لیے محبت کرے۔ دیکھیے! ایک محبت تو بغیر کسی شائبہ کے خالصتاً اللہ کے لیے ہوتی ہی ہے۔ جیسے کسی اللہ والے سے محبت ہے۔ ظاہر ہے اس سے محبت اس وجہ سے نہیں ہوتی کہ اس سے پیسے کمائیں گے بلکہ اس سے محبت اس نیت سے ہوتی ہے کہ اس سے محبت اور تعلق رکھیں گے تو ہمارے دین کو فائدہ ہوگا اور اللہ تعالیٰ راضی ہوں گے۔ یہ محبت اللہ کے لیے ہے اور بڑی برکت کی اور بڑے فائدے کی چیز ہے۔

دنیا کی خاطر اللہ والوں سے تعلق

بعض اوقات شیطان اور انسان کا نفس اس محبت میں بھی صحیح راستے سے گمراہ کردیتے ہیں۔ مثلاً اولیاء اللہ سے اس تعلق کے وقت شیطان یہ نیت دل میں ڈال دیتا ہے کہ اگر ہم ان کے مقرب بنیں گے تو دنیا والوں کی نگاہ میں ہماری قدر و قیمت بڑھ جائے گی۔ العیاذ باللہ۔ یا مثلاً لوگ یہ کہیں گے یہ صاحب تو فلاں بزرگ کے خاص آدمی ہیں، اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ جو محبت خالص اللہ کے لیے ہونی چاہیے تھی وہ اللہ کے لیے نہیں ہوتی، بلکہ وہ محبت دنیاداری کا ذریعہ بن جاتی ہے یا بعض لوگ کسی اللہ والے کے ساتھ اس لیے رابطہ جوڑ لیتے ہیں کہ ان کے پاس ہر قسم کے لوگ آتے ہیں، صاحبِ منصب اور صاحبِ اقتدار بھی آتے ہیں، اور بڑے بڑے مالدار لوگ بھی آتے ہیں۔ جب ہم ان بزرگ کے پاس جائیں گے تو ان لوگوں سے بھی تعلقات قائم ہوں گے اور پھر اس تعلق کے ذریعے ان سے اپنی ضروریات اور اپنے مقاصد پورے کریں گے۔ العیاذ باللہ۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ جو محبت اللہ کے لیے ہونی تھی وہ دنیا حاصل کرنے کے لیے ہوگئی، لیکن اگر کوئی شخص کسی اللہ والے کے پاس یا کسی استاذ کے پاس یا کسی شیخ کے پاس دین حاصل کرنے کے لیے جارہا ہے تو یہ محبت خالص اللہ کے لیے ہے اور حب فی اللہ میں داخل ہے اور اس محبت پر اللہ تعالیٰ نے بڑے ثمرات اور اجر و ثواب کا وعدہ فرمایا ہے۔

دنیاوی محبتوں کو اللہ کے لیے بنادو

لیکن اس محبت کے علاوہ جو دنیاوی محبتیں کہلاتی ہیں، مثلاً ماں سے محبت ہے

یا باپ سے محبت ہے یا بھائی بہن سے محبت ہے یا بیوی بچوں سے محبت ہے۔ رشتہ داروں سے محبت ہے، دوستوں سے محبت ہے۔ اگر انسان ذرا سا زاویۂ نگاہ بدل لے تو یہ محبتیں بھی اللہ تعالیٰ کے لیے ہوجاتی ہیں۔ مثلاً اگر کوئی شخص والدین سے محبت اس نیت سے کرے کہ اللہ اور اللہ کے رسول حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حکم دیا ہے کہ والدین سے محبت کرو۔ یہاں تک فرمادیا کہ اگر کوئی شخص والدین پر محبت سے ایک نظر ڈال لے تو اللہ تعالیٰ اس شخص کو ایک حج مبرور کا ثواب عطا فرمائیں گے[1]۔ اب بظاہر دیکھنے میں وہ شخص طبعی تقاضے کے نتیجے میں والدین سے محبت کررہا ہے، لیکن حقیقت میں وہ محبت اللہ کے لیے ہے۔

بیوی سے محبت اللہ کے لیے ہو

بیوی سے محبت ہے۔ اب بظاہر تو یہ محبت نفسانی تقاضے سے ہے، لیکن اس محبت میں اگر آدمی یہ نیت کرلے کہ اللہ اور اللہ کے رسول جنابِ محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس محبت کا حکم دیا ہے[2] اور میں حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سنت کی اتباع میں بیوی سے محبت کررہا ہوں تو یہی محبت اب اللہ کے لیے ہوگئی۔ اب اگر ایک شخص اللہ کے لیے بیوی سے محبت کررہا ہے اور دوسرا شخص اپنی نفسانی خواہشات کے لیے بیوی سے محبت کررہا ہے تو بظاہر دیکھنے میں دونوں محبتیں ایک جیسی نظر آئیں گی، کوئی فرق معلوم نہیں ہوگا، لیکن دونوں محبتوں میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔

---

(۱) مکارم الاخلاق لابن ابی الدنیا ص۷٤ (۲۱۵) طبع مکتبة القاہرة۔ وشعب الایمان للبیہقی ۶۵/۱۰ (۷٤۷۲) و(۷٤۷۵) ومعجم اسامی شیوخ ابی بکر الاسماعیلی ۳۲۰/۱ طبع مکتبة العلوم والحکم-المدینة المنورة. والحدیث الذی أخرجه الذهبی فی "السیر" ۲۰۸/۱۹ وقال: هذا منکر، طبع دار الرسالة.

(۲) کما جاء فی القرآن الکریم "وعاشروهن بالمعروف" النساء آیت (۱۹) وفی صحیح البخاری ۱۳۳/٤ (۳۳۳۱) "استوصوا بالنساء خیرا".

احادیث سے یہ بات ثابت ہے کہ حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنی ازواجِ مطہرات سے بڑی محبت فرماتے تھے اور ان کی دل داری کے لیے کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں فرماتے تھے۔

حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ازواجِ مطہرات کے ساتھ ایسے ایسے معاملات نظر آتے ہیں جو بعض اوقات ہم جیسے لوگوں کو حیرت انگیز معلوم ہوتے ہیں۔ مثلاً حدیث شریف میں ہے کہ حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک مرتبہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو گیارہ عورتوں کی کہانی سنائی کہ گیارہ عورتیں ایک جگہ جمع ہوئیں اور انہوں نے آپس میں یہ طے کیا کہ ہر عورت اپنے اپنے شوہر کا حال بیان کرے گی۔ پھر ایک عورت نے یہ کہا۔ دوسری عورت نے یہ کہا۔ تیسری نے یہ کہا۔ چوتھی نے یہ کہا وغیرہ۔[1] اب جس ذاتِ گرامی پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے وحی نازل ہو رہی ہے اور جس ذاتِ گرامی کا ہر وقت اللہ تعالیٰ سے رابطہ قائم ہے، وہ ذاتِ گرامی اپنی بیوی کو گیارہ عورتوں کا قصہ سنا رہی ہے۔ حدیث شریف میں آتا ہے کہ ایک مرتبہ حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سفر پر تشریف لے جا رہے تھے، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے فرمایا کہ دوڑ لگاؤ گی؟ انہوں نے عرض کیا کہ ہاں! چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے ساتھ اس میدان میں دوڑ لگائی۔[2] وہاں بے پردگی کا کوئی احتمال نہیں تھا۔ اس لیے کہ جنگل تھا اور کوئی دوسرا شخص بھی ساتھ نہیں تھا۔

---

(۱) صحیح البخاری ۲۷/۷ (۵۱۸۹) وصحیح مسلم ۱۸۹٦/٤ (۲٤٤۸)، ومسند إسحاق بن راهویه ۲۳۷/۲ (۷٤٤) طبع مكتبة الإيمان-المدينة المنورة، وسنن النسائي الكبرى ۲٤۸/۸ (۹۰۹۳) طبع مكتبة الرشد، والمعجم الكبير للطبراني ۱٦٤/۲۳ (۲٦۵) طبع مكتبة ابن تيمية-القاهرة

(۲) سنن ابی داود ۲۹/۳ (۲۵۷۸) ومسند احمد ۱٤٤/٤۰ (۲٤۱۱۸-۲٤۱۱۹) وذکره ابن الملقن فی "البدر المنیر" ٤۲٤/۹، وقال: ہذا الحدیث صحیح۔ طبع دار ہجرۃ الریاض۔

○ ہمارے کام نفسانی خواہش کے تابع

اب بظاہر یہ کام ایسے ہیں جن کا اللہ تعالیٰ سے یا اللہ کی عبادت سے کوئی تعلق نظر نہیں آتا۔ اسی طرح ہم میں سے کوئی شخص بیوی کی دلداری اور اس کی دلجوئی کے لیے اس قسم کا کوئی تفریح کا کام کرتا ہے تو وہ بھی بظاہر ایسا ہی لگتا ہے جیسے حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم دلجوئی کا معاملہ فرمایا کرتے تھے، لیکن ہمارے اس کام میں اور حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے اس کام میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ ہم اس کام کو اپنی نفسانی خواہش اور نفسانی تقاضے کی بنیاد پر کرتے ہیں اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اپنے مقامِ بلند سے نیچے اُتر کر اس کام کو اس لیے کر رہے تھے کہ اللہ تعالیٰ نے حکم دیا کہ بیوی کی دلداری کرو۔

○ ''عارف'' کون ہوتا ہے؟

صوفیائے کرام نے فرمایا کہ ''عارف'' یعنی جو اللہ کی معرفت اور شریعت و طریقت کی معرفت رکھتا ہو۔ وہ ''عارف'' مجموعہ اضداد ہوتا ہے، یعنی اس کی ذات میں اور اس کے عمل میں ایسی چیزیں جمع ہوتی ہیں جو بظاہر دیکھنے میں متضاد معلوم ہوتی ہیں۔ مثلاً ایک طرف اس کا رابطہ اللہ تعالیٰ سے جڑا ہوا ہے۔ تعلق مع اللہ بھی حاصل ہے اور ملکۂ یاد داشت بھی حاصل ہے۔ یعنی ہر وقت اللہ تعالیٰ کا ذکر و فکر اور اس کی یاد دل میں بسی ہوئی ہے اور دوسری طرف لوگوں کے ساتھ اور گھر والوں کے ساتھ ہنس رہا ہے، بول بھی رہا ہے، کھا بھی رہا ہے، پی بھی رہا ہے۔ اس لیے ایسا شخص مجموعہ اضداد ہوتا ہے۔

مبتدی اور منتہی کے درمیان فرق

اسی طرح صوفیاءِ کرام نے فرمایا کہ جو آدمی مبتدی ہوتا ہے یعنی جس نے ابھی طریقت کے راستے پر چلنا شروع کیا ہے اور دوسرا آدمی جو منتہی ہوتا ہے یعنی جو طریقت کا پورا راستہ طے کر کے آخری انجام تک پہنچ گیا ہے۔ ان دونوں کی ظاہری حالت ایک جیسی ہوتی ہے۔ بظاہر دونوں ایک جیسے نظر آتے ہیں اور جو آدمی درمیان میں ہوتا ہے اس کی حالت علیحدہ ہوتی ہے۔

مثلاً ایک شخص ہم جیسا مبتدی ہے جس نے ابھی دین کے راستے پر چلنا شروع کیا تو وہ دنیا کے سارے کام کر رہا ہے۔ کھا رہا ہے، پی رہا ہے، ہنس بول رہا ہے، خرید و فروخت کر رہا ہے، بیوی بچوں کے ساتھ ہنسی مذاق کر رہا ہے۔ دوسری طرف حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہیں کہ آپ بازار میں خرید و فروخت بھی کر رہے ہیں، مزدوری بھی کر رہے ہیں، بیوی بچوں کے ساتھ ہنس بول بھی رہے ہیں، جب کہ آپ منتہی ہیں۔ اب بظاہر مبتدی اور منتہی کی حالت ایک جیسی نظر آ رہی ہے، لیکن حقیقت میں دونوں میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ ایک تیسرا آدمی ہے جو مبتدی سے ذرا آگے بڑھ گیا ہے اور درمیان راستے میں ہے۔ اس کی حالت الگ ہوتی ہے وہ یہ کہ نہ تو بازار میں جاتا ہے، نہ بیوی بچوں کے ساتھ ہنستا بولتا ہے اور ہر وقت اللہ کی یاد اور استغراق میں لگا ہوا ہے۔ صبح سے شام تک اس کے علاوہ اس کا کوئی مشغلہ نہیں ہے۔ یہ درمیان والا شخص ہے۔

مبتدی اور منتہی کی مثال

حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے ان تینوں

اشخاص کو ایک مثال کے ذریعے سمجھاتے ہوئے فرمایا کہ جیسے ایک دریا ہے، ایک آدمی دریا کے اس کنارے پر کھڑا ہے اور دوسرا آدمی دریا پار کر کے دوسرے کنارے پر کھڑا ہے اور تیسرا آدمی دریا کے اندر ہے، دریا پار کر رہا ہے اور ہاتھ پاؤں چلا رہا ہے۔ اب بظاہر وہ شخص جو اس کنارے پر کھڑا ہے اور وہ شخص جو دوسرے کنارے پر کھڑا ہے، دونوں کی ظاہری حالت ایک جیسی ہے۔ یہ بھی ساحل پر کھڑا ہے اور وہ بھی ساحل پر کھڑا ہے، لیکن جو اس ساحل پر کھڑا ہے وہ ابھی تک دریا میں داخل ہی نہیں ہوا اور ابھی تک اس نے دریا کی موجوں کا مقابلہ نہیں کیا، لیکن جو شخص دوسرے ساحل پر کھڑا ہے وہ دریا پار کر کے اور دریا کی موجوں کا مقابلہ کر کے دوسرے ساحل پر پہنچ چکا ہے اور تیسرا شخص ابھی دریا میں غوطے لگا رہا ہے اور دوسرے ساحل پر پہنچنے کی کوشش کر رہا ہے اور موجوں سے لڑ رہا ہے۔

اب بظاہر یہ نظر آ رہا ہے کہ یہ تیسرا شخص بڑا بہادر ہے جو دریا کی موجوں سے کھیل رہا ہے اور طوفانوں کا مقابلہ کر رہا ہے، لیکن حقیقتاً بہادر وہ ہے جو ان موجوں اور طوفانوں کا مقابلہ کر کے دوسرے کنارے پر پہنچ چکا ہے، اور اب اس کی حالت اس شخص جیسی ہوگئی ہے جو ابھی تک دریا میں داخل ہی نہیں ہوا۔ اس وجہ سے مبتدی اور منتہی کی حالت ایک جیسی نظر آتی ہے، لیکن حقیقت میں دونوں کے درمیان زمین و آسمان کا فرق ہوتا ہے۔

○ حُبّ فی اللہ کے لیے مشق کی ضرورت

اب یہ کہ دنیاوی محبتیں بھی اللہ کے لیے ہوجائیں، یہ درجہ حاصل کرنے کے لیے انسان کو کچھ مشق کرنی پڑتی ہے۔ بزرگانِ دین اور صوفیائے کرام کے

پاس جب کوئی شخص اپنی اصلاح کرانے کے لیے جاتا ہے تو یہ حضرات مشق کراتے ہیں کہ یہ ساری محبتیں اسی طرح رہیں، لیکن ان محبتوں کا زاویہ بدل جائے اور ان کا طریقہ اس طرح بدل جائے کہ یہ محبتیں حقیقت میں اللہ کے لیے ہوجائیں۔ ہمارے حضرت ڈاکٹر عبدالحئی صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ میں نے ان محبتوں کو بدلنے کی سالہا سال تک مشق کی ہے تب جا کر اس میں کامیابی ہوئی اور اس طرح مشق کی ہے کہ مثلاً گھر میں داخل ہوئے، کھانے کا وقت ہے بھوک لگی ہوئی ہے اب کھانا کھانے کے لیے بیٹھے اور کھانا سامنے آیا۔ اب دل چاہ رہا ہے کہ جلدی سے کھانا شروع کردیں، لیکن ایک لمحے کے لیے رُک گئے اور دل میں یہ خیال لائے کہ نفس کے تقاضے سے کھانا نہیں کھائیں گے۔ پھر یہ سوچا کہ اللہ تعالیٰ نے میرے نفس کا مجھ پر حق رکھا ہے اور حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی عادت یہ تھی کہ آپ کے سامنے جب کھانا آتا تو آپ شکر ادا کرتے ہوئے اور اس کھانے کی طرف اپنی احتیاج ظاہر کرتے ہوئے کھانا کھالیا کرتے تھے۔[1] مجھے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اس سنت کی اتباع کرنی چاہیے، لہٰذا آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اتباع میں کھانا کھاتا ہوں، پھر کھانا شروع کیا۔ اس طرح زاویۂ نگاہ بدل گیا۔

بچوں کے ساتھ اللہ کے لیے محبت

اسی طرح گھر میں داخل ہوئے۔ دیکھا کہ بچہ کھیل رہا ہے اور وہ بچہ کھیلتا ہوا، اچھا لگا اور دل چاہا کہ اس کو گود میں اُٹھا کر اس کو پیار کروں، اس کے ساتھ کھیلوں، لیکن ایک لمحے کے لیے رُک گئے اور یہ سوچا کہ اپنے نفس کے تقاضے سے بچے سے پیار نہیں کریں گے۔ پھر دوسرے لمحے دل میں خیال لائے کہ

(۱) ملاحظہ ہو زاد المعاد لابن القیم ۱۴۲/۱ فصل فی ھدیہ ﷺ فی الطعام۔

حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت یہ تھی کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم بچوں سے محبت فرمایا کرتے تھے۔ ایک مرتبہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم جمعہ کے روز مسجدِ نبوی میں جمعہ کا خطبہ دے رہے تھے۔ اتنے میں حضرت حسن یا حضرت حسین رضی اللہ عنہما گرتے پڑتے مسجد نبوی میں پہنچ گئے۔ جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو آتا دیکھا تو فوراً منبر سے اُترے اور ان کو گود میں اُٹھالیا۔(۱) ایک مرتبہ آپ نوافل پڑھ رہے تھے۔ حضرت امامہ رضی اللہ عنہا جو بچی تھیں وہ آکر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے کندھے پر کسی طرح سوار ہوگئیں۔ جب آپ رکوع میں جانے لگے، تو آپ نے ان کو آہستہ سے اُٹھا کر نیچے اُتار دیا۔ جب آپ سجدے میں گئے تو پھر وہ آپ کے اوپر سوار ہوگئیں(۲)۔ بہر حال! بچوں کے ساتھ پیار کرنا، محبت کرنا، ان کے ساتھ کھیلنا، یہ حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت ہے۔(۳) اس سنت کی اتباع میں، میں بھی بچے کو پیار کرتا ہوں اور ان کے ساتھ کھیلتا ہوں۔ یہ تصوّر کر کے بچے کو اُٹھالیا اور سنت کا استحضار کرلیا۔ شروع شروع میں آدمی تکلّف سے یہ کام کرتا ہے، لیکن بار بار کرنے کے نتیجے میں تکلف باقی نہیں رہتا بلکہ وہ کام طبیعت بن جاتا ہے اور پھر اس کے بعد ساری محبتیں اللہ کے لیے ہوجاتی ہیں۔ چاہے بیوی سے محبت ہو یا بچوں سے محبت ہو یا والدین سے محبت ہو۔

یہ نسخہ تو بہت آسان ہے۔ اس سے زیادہ آسان نسخہ اور کیا ہوگا کہ سب کام جو تم کرتے ہو اسی طرح کرتے رہو، صرف زاویۂ نگاہ بدل لو اور نیتوں کے اندر تبدیلی لے آؤ، لیکن اس آسان نسخہ پر عمل اس وقت ہوگا جب انسان اس کے

(۱) سنن ابی داود ۲۹۰/۱ (۱۱۰۹) وسنن الترمذی ۱۱۷/۶ (۳۷۷۴) وقال: هذا حديث حسن غريب، انما نعرفه من حديث الحسين بن واقد۔
(۲) صحيح البخاری ۱۰۹/۱ (۵۱۶) و ۷/۸ (۵۹۹۶)۔
(۳) صحيح البخاری ۷/۸ (۵۹۹۸) وصحيح مسلم ۱۸۰۸/۴ (۲۳۱۷)۔

لیے تھوڑی سی محنت اور مشقت کرے اور ہر ہر قدم پر اس مشق کو کرنے کی کوشش کرے پھر ایک وقت ایسا آئے گا کہ یہ ساری محبتیں اللہ کے لیے ہو جائیں گی۔

حب فی اللہ کی علامت

اب دیکھنا یہ ہے کہ اللہ کے لیے محبت ہونے کی علامت کیا ہے؟ اس کی علامت یہ ہے کہ اگر کسی وقت اللہ کی محبت کا یہ تقاضا ہو کہ میں ان محبتوں کو خیرباد کہہ دوں اور چھوڑ دوں تو اس وقت انسان کی طبیعت پر ناقابلِ برداشت بوجھ نہ ہو، یہ اس بات کی علامت ہے کہ یہ محبت اللہ کے لیے ہے۔

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کا ایک واقعہ

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کی ایک بات یاد آ گئی۔ وہ یہ کہ ایک مرتبہ آپ نے حاضرینِ مجلس سے فرمایا کہ آج اللہ تعالیٰ نے اپنے امتحان کا ایک عجیب وغریب موقع عطا فرمایا۔ وہ یہ کہ جب میں گھر گیا اور اہلیہ سے بات ہوئی تو اہلیہ نے تلخ لہجے میں کوئی بات کہہ دی۔ اس وقت میرے منہ سے یہ نکلا کہ ''بی بی مجھے اس لہجے کی برداشت نہیں اور اگر تم کہو تو میں یہ کرنے کے لیے تیار ہوں کہ اپنی چارپائی اُٹھا کر خانقاہ میں ڈال لوں اور ساری عمر وہیں گزار دوں، لیکن مجھے اس لہجے کی برداشت نہیں۔'' حضرت نے فرمایا کہ میں نے اپنی اہلیہ سے یہ بات کہہ تو دی، لیکن بعد میں، میں نے سوچا اور اپنا جائزہ لیا کہ بڑی بات کہہ دی کہ چارپائی اُٹھا کر خانقاہ میں ڈال دوں اور ساری عمر اسی طرح گزار دوں۔ کیا تم اس کام کے کرنے پر قادر بھی ہو؟ اگر اہلیہ کہہ دے کہ چلو ایسا کرلو تو کیا ایسا کرلو گے؟ اور ساری عمر خانقاہ میں گزار دو گے یا ویسے ہی جھوٹا دعویٰ کر دیا؟ لیکن

جائزہ لینے کے بعد یہ محسوس ہوا کہ الحمد للہ میں اس کام پر قادر ہوں۔ چونکہ ساری محبتیں اللہ کے لیے ہوگئی ہیں، اس لیے اب اگر کسی وقت اللہ کی محبت کی خاطر دوسری محبت کو چھوڑنا پڑے تو اس وقت کوئی ناقابل برداشت بوجھ نہیں ہوگا، کیونکہ وہ محبت تبدیل ہوکر اللہ کے لیے محبت بن گئی ہے۔

لیکن یہ مقام اتنی آسانی سے حاصل نہیں ہوتا بلکہ اس کے لیے محنت اور مشق کرنی پڑتی ہے اور یہ محنت اور مشق ایسی چیز نہیں ہے جو ناممکن ہو بلکہ ہر انسان کرسکتا ہے۔ پھر اس محنت اور مشق کے نتیجے میں اللہ تعالیٰ مقام عطا فرمادیتے ہیں وہ کرکے دیکھنے کی بات ہے۔ یہ سب ''اَحَبَّ لِلّٰہ'' یعنی اللہ تعالیٰ کے لیے محبت میں داخل ہے۔

چوتھی علامت

چوتھی علامت یہ ''وَاَبْغَضَ لِلّٰہ'' بغض اور غصہ بھی اللہ کے لیے ہو، یعنی جس کسی پر غصہ ہے یا جس کسی سے بغض ہے، وہ اس کی ذات سے نہیں ہے، بلکہ اس کے کسی بُرے عمل سے ہے یا اس کی کسی ایسی بات سے ہے جو مالکِ حقیقی کی ناراضگی کا سبب ہے تو یہ غصہ اور ناراضگی اللہ تعالیٰ کے لیے ہے۔

ذات سے نفرت نہ کریں

اس لیے بزرگوں نے ایک بات فرمائی جو ہمیشہ یادرکھنے کی ہے۔ وہ یہ ہے کہ نفرت اور بغض کافر سے نہیں بلکہ اس کے کفر سے ہے، فاسق سے بغض نہیں، بلکہ اس کے فسق سے بغض ہے۔ نفرت اور بغض گناہ گار سے نہیں، بلکہ گناہ سے ہے۔ جو آدمی فسق و فجور اور گناہ کے اندر مبتلا ہے اس کی ذات غصے کا محل نہیں،

بلکہ اس کا فعل غصہ کا محل ہے۔ اس لیے کہ ذات تو قابلِ رحم ہے۔ وہ بے چارہ بیمار ہے، کفر کی بیماری میں مبتلا ہے، فسق کی بیماری میں مبتلا ہے اور نفرت بیمار سے نہیں ہوتی، بلکہ بیماری سے ہوتی ہے۔ اس لیے کہ اگر بیمار سے نفرت کرو گے تو پھر اس کی کون دیکھ بھال کرے گا؟ لہٰذا فسق و فجور سے اور کفر سے نفرت ہوگی، اس کی ذات سے نہیں ہوگی۔ یہی وجہ ہے کہ اگر اس کی ذات فسق و فجور سے باز آجائے تو وہ ذات گلے لگانے کے لائق ہے۔ اس لیے کہ ذات کے اعتبار سے اس سے کوئی پرخاش اور کوئی ضد نہیں۔

اس بارے میں حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا طرزِ عمل

حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے عمل کو دیکھیے، وہ ذات جس نے آپ کے محبوب چچا حضرت امیر حمزہ رضی اللہ عنہ کا کلیجہ نکال کر کچا چبایا، یعنی حضرت ہندہ رضی اللہ عنہا اور جو اس کے سبب بنے یعنی حضرت وحشی رضی اللہ عنہ جب یہ دونوں اسلام کے دائرے میں داخل ہوگئے اور اسلام قبول کرلیا، تو اب وہ آپ کے اسلامی بہن اور بھائی بن گئے۔ آج حضرت وحشی کے نام کے ساتھ ''رضی اللہ تعالیٰ عنہ'' کہتے ہیں۔ ہندہ جنہوں نے کلیجہ چبایا تھا آج ان کے نام کے ساتھ ''رضی اللہ تعالیٰ عنہا'' کہا جاتا ہے۔ بات اصل یہ تھی کہ ان کی ذات سے کوئی نفرت نہیں تھی، بلکہ ان کے فعل اور ان کے اعتقاد سے نفرت تھی، پھر جب سچی توبہ کے ساتھ وہ برا فعل اور برا اعتقاد ختم ہوگیا، تو اب ان سے نفرت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔[1]

(۱) صحیح البخاری ۱۰۰/۵ (۴۰۷۲) و مسند احمد ۴۸۰/۲۵ (۱۶۰۷۷) نیز ملاحظہ ہو نضرۃ النعیم فی مکارم اخلاق الرسول الکریم ۴۴۱/۱ ذکر الکمالات و الخصائص التی انفرد بہا رسول اللہ صلی اللہ علیہ و سلم - طبع دار الوسیلۃ جدۃ۔

خواجہ نظام الدین اولیاء رحمۃ اللہ علیہ کا ایک واقعہ

حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء رحمۃ اللہ علیہ، اولیاء اللہ میں اونچا مقام رکھتے ہیں۔ ان کے زمانے میں ایک بڑے عالم اور فقیہ اور مفتی مولانا حکیم ضیاء الدین صاحب رحمۃ اللہ علیہ بھی موجود تھے۔ حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء رحمۃ اللہ علیہ بحیثیت ''صوفی'' مشہور تھے اور یہ بڑے ''عالم''، ''مفتی'' اور ''فقیہ'' کی حیثیت سے مشہور تھے۔ حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء رحمۃ اللہ علیہ ''سماع'' کو جائز کہتے تھے۔ بہت سے صوفیاء کے یہاں سماع کا رواج تھا۔ ''سماع'' کا مطلب ہے کہ موسیقی کے آلات کے بغیر حمد ونعت وغیرہ کے مضامین کے اشعار ترنم سے یا بغیر ترنم کے محض خوش آواز سے کسی کا پڑھنا اور دوسروں کا اسے خوش عقیدگی اور محبت سے سننا۔ بعض صوفیاء اس کی اجازت دیتے تھے اور بہت سے فقہاء اور مفتی حضرات اس سماع کو بھی جائز نہیں کہتے تھے بلکہ ''بدعت'' قرار دیتے تھے، چنانچہ ان کے زمانے کے مولانا حکیم ضیاء الدین صاحب نے بھی ''سماع'' کے ناجائز ہونے کا فتویٰ دیا تھا اور حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء رحمۃ اللہ علیہ ''سماع'' سنتے تھے۔

جب مولانا حکیم ضیاء الدین صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی وفات کا وقت قریب آیا تو حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء رحمۃ اللہ علیہ حضرت کی عیادت اور مزاج پرسی کے لیے تشریف لے گئے اور اطلاع کروائی کہ جاکر حکیم ضیاء الدین صاحب سے عرض کیا جائے نظام الدین مزاج پرسی کے لیے حاضر ہوا ہے۔ اندر سے حکیم ضیاء الدین صاحب نے جواب دیا کہ ان کو باہر روک دیں۔ میں کسی بدعتی کی صورت دیکھنا نہیں چاہتا۔ حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء رحمۃ اللہ علیہ نے جواب بھجوایا کہ ان سے

عرض کر دو کہ بدعتی بدعت سے توبہ کرنے کے لیے حاضر ہوا ہے، اسی وقت مولانا حکیم ضیاء الدین رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی پگڑی بھیجی کہ اسے بچھا کر خواجہ صاحب اس کے اوپر قدم رکھتے ہوئے آئیں اور جوتے سے قدم رکھیں، ننگے پاؤں نہ آئیں۔ خواجہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے پگڑی کو اُٹھا کر سر پر رکھا اور کہا کہ یہ میرے لیے دستارِ فضیلت ہے، اس شان سے اندر تشریف لے گئے، آ کر مصافحہ کیا اور بیٹھ گئے اور حکیم ضیاء الدین رحمۃ اللہ علیہ کی طرف متوجہ رہے، پھر خواجہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی موجودگی میں حکیم ضیاء الدین صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی وفات کا وقت آ گیا۔ خواجہ صاحب نے فرمایا کہ الحمد للہ حکیم ضیاء الدین صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو اللہ تعالیٰ نے قبول فرمالیا کہ ترقی مدارج کے ساتھ ان کا انتقال ہوا۔

غصہ بھی اللہ کے لیے ہو

بہر حال! جو بغض اور غصہ اللہ کے لیے ہوتا ہے وہ کبھی ذاتی دشمنیاں پیدا نہیں کرتا، وہ عداوتیں پیدا نہیں کرتا، وہ فتنے پیدا نہیں کرتا، کیونکہ جس آدمی سے بغض کیا جا رہا ہے اور جس پر غصہ کیا جا رہا ہے وہ بھی جانتا ہے کہ اس کو میری ذات سے دشمنی نہیں ہے، بلکہ میرے خاص فعل سے اور خاص حرکت سے ہے۔ اسی وجہ سے وہ اس کی بات کا برا نہیں مانتا۔ اس لیے کہ جانتا ہے کہ یہ جو کچھ کہہ رہا ہے اللہ کے لیے کہہ رہا ہے۔ اس کو فرماتے ہیں:

"من احب للّٰہ و ابغض للّٰہ"

یعنی جس سے تعلق اور محبت ہے تو وہ بھی اللہ کے لیے ہے اور جس سے بغض اور نفرت ہے تو وہ بھی اللہ کے لیے ہے۔ تو یہ غصے کا بہترین محل ہے،

بشرطیکہ یہ غصہ شرعی حد کے اندر ہو۔ اللہ تعالیٰ یہ نعمت ہم کو عطا فرمادے کہ محبت ہوتو اللہ کے لیے ہو۔ غصہ اور بغض ہوتو وہ اللہ کے لیے ہو۔

لیکن یہ غصہ ایسا ہونا چاہیے کہ اس کے منہ میں لگام پڑی ہوئی ہو کہ جہاں اللہ کے لیے غصہ کرنا ہے وہاں تو ہو اور جہاں غصہ نہیں کرنا وہاں لگام ڈال کر اس کو روک دو۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ کا واقعہ

حضرت علی رضی اللہ عنہ کو دیکھیے کہ ایک معرکے میں ایک کافر کو پکڑ کر اوپر اٹھایا اور پھر زمین پر پٹخ دیا اور اس کے سینے پر سوار ہوگئے۔ جب اس کافر نے یہ دیکھا کہ اب میرا قابو تو ان کے اوپر نہیں چل رہا، تو اس نے لیٹے لیٹے حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے منہ پر تھوک دیا۔ جیسے کہاوت ہے کہ "کھسیانی بلی کھمبا نوچے"، لیکن جیسے ہی اس کافر نے تھوکا، آپ کرم اللہ وجہہ فوراً اس کو چھوڑ کر الگ ہوگئے۔ آپ سے اسے چھوڑنے کا سبب پوچھا گیا تو آپ کرم اللہ وجہہ نے فرمایا کہ بات اصل میں یہ ہے کہ پہلے اس پر جو میں نے حملہ کیا تھا اور اس کو مارنے کا ارادہ کیا تھا وہ اللہ تعالیٰ کے لیے تھا اور پھر جب اس نے میرے منہ پر تھوک دیا تو اب مجھے اور زیادہ غصہ آیا، لیکن اب اگر میں اس غصے پر عمل کرتے ہوئے اس سے بدلہ لیتا تو یہ بدلہ لینا اللہ تعالیٰ کے لیے نہ ہوتا، بلکہ اپنی ذات کے لیے ہوتا اور اس وجہ سے ہوتا کہ چونکہ اس نے میرے منہ پر تھوکا ہے، لہٰذا میں اس کو اور زیادہ ماروں تو اس صورت میں یہ غصہ اللہ اور رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لیے نہ ہوتا، بلکہ اپنی ذات کے لیے ہوتا۔ اس وجہ سے میں اس کو چھوڑ کر الگ ہوگیا اور وہ کافر حضرت علی رضی اللہ عنہ

کے اس طرزِ عمل سے متاثر ہو کر مسلمان ہو گیا[1]۔

یہ درحقیقت اس حدیث

"مَنْ اَحَبَّ لِلّٰہِ وَاَبْغَضَ لِلّٰہِ"

پر عمل فرما کر دکھا دیا۔ گویا کہ غصّے کے منہ میں لگام دے رکھی ہے کہ جہاں تک اس غصہ کا شرعی اور جائز موقع ہے، بس وہاں تک تو غصہ کرنا ہے اور جہاں اس غصہ کا جائز موقع ختم ہو جائے تو اس کے بعد آدمی اس غصے سے اس طرح دور ہو جائے کہ جیسے اس سے کوئی تعلق ہی نہیں۔ انہی حضرات کے بارے میں یہ کہا جاتا ہے کہ

"کان وقافا عند حدود اللّٰہ"

یعنی یہ اللہ کی حدود کے آگے ٹھہر جانے والے لوگ تھے۔

۵ حضرت فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ کا واقعہ

حضرت فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ ایک مرتبہ مسجدِ نبوی میں داخل ہوئے تو دیکھا کہ حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے چچا حضرت عباس رضی اللہ عنہ کے گھر کا پرنالہ مسجدِ نبوی کی طرف لگا ہوا ہے، بارش وغیرہ کا پانی مسجدِ نبوی کے اندر گرتا تھا، گویا کہ مسجد کی فضا میں وہ پرنالہ لگا ہوا تھا۔ حضرت فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ نے سوچا کہ مسجد تو اللہ تعالیٰ کا گھر ہے اور کسی شخص کے ذاتی گھر کا پرنالہ مسجد کے اندر آ رہا ہو تو یہ اللہ کے حکم کے خلاف ہے، چنانچہ آپ نے اس پرنالے کو توڑنے کا حکم دے دیا اور توڑ دیا گیا۔ اب دیکھیے کہ آپ نے اس پرنالے کو توڑنے کا جو حکم دیا یہ غصے کی وجہ سے تو دیا، لیکن غصہ اس بات پر آیا کہ یہ کام مسجد کے احکام اور آداب

(۱) مرقاۃ المفاتیح شرح مشکاۃ المصابیح لملا علی القاری ۷/۱۲ (طبع دار الفکر).

کے خلاف ہے۔ جب حضرت عباس رضی اللہ عنہ کو پتہ چلا کہ میرے گھر کا پرنالہ توڑ دیا گیا ہے تو حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کے پاس آئے اور ان سے فرمایا کہ آپ نے یہ پرنالہ کیوں توڑ دیا؟ حضرت فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ یہ جگہ تو مسجد کی ہے، کسی کی ذاتی جگہ نہیں ہے۔ مسجد کی جگہ میں کسی کا پرنالہ آنا شریعت کے حکم کے خلاف تھا، اس لیے میں نے توڑ دیا۔

حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ آپ کو پتہ بھی ہے کہ یہ پرنالہ یہاں پر کس طرح لگا تھا؟ یہ پرنالہ حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانے میں لگا تھا اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اجازت سے میں نے لگایا تھا۔ آپ اس کو توڑنے والے کون ہوتے ہیں؟ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے پوچھا کہ ''حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اجازت دی تھی؟'' انہوں نے فرمایا کہ ''ہاں! اجازت دی تھی''۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت عباس رضی اللہ عنہ سے فرمایا کہ خدا کے لیے میرے ساتھ آؤ، چنانچہ اس پرنالے کی جگہ کے پاس گئے اور وہاں جا کر خود رکوع کی حالت میں کھڑے ہو گئے اور حضرت عباس رضی اللہ عنہ سے فرمایا کہ اب میری کمر پر کھڑے ہو کر یہ پرنالہ دوبارہ لگاؤ۔ حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ میں دوسروں سے لگوالوں گا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ عمر کی یہ مجال کہ وہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لگائے ہوئے پرنالے کو توڑ دے۔ مجھ سے یہ اتنا بڑا جرم سرزد ہوا اس کی کم سے کم سزا یہ ہے کہ میں رکوع میں کھڑا ہوتا ہوں اور تم میری کمر پر کھڑے ہو کر یہ پرنالہ لگاؤ، چنانچہ حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے ان کی کمر پر کھڑے ہو کر وہ پرنالہ اس کی جگہ پر واپس لگا دیا۔ (۱)

---

(۱) مسند احمد ۳۰۸/۳ (۱۷۹۰) وذکرہ الہیثمی فی ''مجمع الزوائد'' ۲۰۶/٤ (۷۰۷۰)- طبع مکتبۃ القدسی القاہرہ- وقال: رواہ احمد، ورجالہ ثقات ،إلا ان ہشام بن سعد لم یسمع من عبید اللہ بن عباس، واللہ اعلم- وذکر الشیخ شعیب الارناووط فی حاشیۃ المسند طرقاعدیدۃ ثم قال وہی بمجموع ہذہ الطرق تتقوی فتحسن۔

وہ پرنالہ آج بھی مسجدِ نبوی میں لگا ہوا ہے۔ اللہ تعالیٰ ان لوگوں کو جزائے خیر دے جن لوگوں نے مسجدِ نبوی کی تعمیر کی ہے، انہوں نے اب بھی اس جگہ پر پرنالہ لگادیا ہے۔ اگرچہ اب اس پرنالے کا بظاہر کوئی مصرف نہیں ہے، لیکن یادگار کے طور پر لگادیا ہے۔ یہ درحقیقت اس حدیث پر عمل ہے "من احب للّٰہ و ابغض للّٰہ" پہلے جو غصہ اور بغض ہوا تو وہ اللہ کے لیے ہوا تھا اور اب جو محبت ہے وہ بھی اللہ کے لیے ہے۔ جو شخص یہ کام کرلے اس نے اپنا ایمان کامل بنالیا۔ یہ ایمان کے کامل ہونے کی علامت ہے۔

مصنوعی غصّہ کرکے ڈانٹ لیں

بہرحال! اس "بغض فی اللہ" کی وجہ سے بعض اوقات غصے کا اظہار کرنا پڑتا ہے۔ خاص طور پر ان لوگوں پر غصّہ کا اظہار کرنا پڑتا ہے جو زیرِ تربیت ہوتے ہیں۔ جیسے استاذ ہے اس کو اپنے شاگردوں پر غصّہ کرنا پڑتا ہے۔ باپ کو اپنی اولاد پر غصّہ کرنا پڑتا ہے۔ شیخ کو اپنے مریدوں پر غصّہ کرنا پڑتا ہے، لیکن یہ غصّہ اس حد تک ہونا چاہیے جتنا اس کی اصلاح کے لیے ضروری ہو، اس سے آگے نہ بڑھے۔ جیسا کہ ابھی عرض کیا کہ اس کا طریقہ یہ ہے کہ جب انسان کی طبیعت میں اشتعال ہو، اس وقت غصّہ نہ کرے۔ مثلاً استاذ کو شاگرد پر غصّہ آ گیا اور اشتعال پیدا ہوگیا، اس اشتعال اور غصّے کے وقت ڈانٹ ڈپٹ اور مارپیٹ نہ کرے، بلکہ جب طبیعت میں وہ اشتعال اور غصّہ ختم ہوجائے، اس وقت مصنوعی غصّہ کرکے ڈانٹ ڈپٹ کرلے، تاکہ یہ ڈانٹ ڈپٹ حد سے متجاوز نہ ہو۔ یہ کام ذرا مشکل ہے، کیونکہ انسان غصّے کے وقت بے قابو ہوجاتا ہے، لیکن جب تک اس کی مشق نہیں کرے گا اس وقت تک اس غصّے کے مفاسد اور برائیوں سے نجات نہیں ملے گی۔

چھوٹوں پر زیادتی کا نتیجہ

اور پھر جو زیرِ تربیت افراد ہوتے ہیں جیسے اولاد، شاگرد، مرید، ان پر اگر غصے کے وقت حد سے تجاوز ہوجائے تو بعض صورتوں میں یہ بات بڑی خطرناک ہوجاتی ہے، کیونکہ جس پر غصہ کیا جارہا ہے وہ اگر آپ سے بڑا ہے یا برابر کا ہے تو آپ کے غصہ کرنے کے نتیجے میں اس کو جو ناگواری ہوگی اس کا اظہار بھی کردے گا اور وہ بتادے گا کہ تمہاری یہ بات مجھے اچھی نہیں لگی یا کم از کم بدلہ لے لے گا، لیکن جو تمہارا ماتحت اور چھوٹا ہے وہ تم سے بدلہ لینے پر تو قادر نہیں ہے، بلکہ اپنی ناگواری کے اظہار پر بھی قادر نہیں، چنانچہ کوئی بیٹا اپنے باپ سے یا شاگرد اپنے اُستاد سے یا مرید اپنے شیخ سے یہ نہیں کہے گا کہ آپ نے فلاں وقت جو بات کہی تھی وہ مجھے ناگوار ہوئی۔ اس لیے آپ کو پتہ ہی نہیں چلے گا کہ آپ نے اس کی کتنی دل شکنی کی ہے اور جب پتہ نہیں چلے گا تو معافی مانگنا بھی آسان نہیں ہوگا۔ اس لیے یہ بہت نازک معاملہ ہے اور خاص طور سے جو چھوٹے بچوں کو پڑھانے والے اساتذہ ہوتے ہیں، ان کے بارے میں حکیم الامت حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ان کا معاملہ تو بہت ہی نازک ہے، اس لیے کہ وہ نابالغ بچے ہیں اور نابالغ کا معاملہ یہ ہے کہ اگر وہ معاف بھی کردے تو معافی نہیں ہوتی، کیونکہ نابالغ کی معافی معتبر نہیں۔

خلاصہ

بہرحال! آج کی مجلس کا خلاصہ یہ ہے کہ اپنے غصے پر قابو پانے کی کوشش کرنی چاہیے، اس لیے کہ یہ غصہ بے شمار برائیوں کی جڑ ہے اور اس کے ذریعے

بے شمار باطنی امراض پیدا ہوتے ہیں۔ ابتداء میں تو یہ کوشش کرے کہ غصے کا اظہار بالکل نہ ہو، بعد میں جب یہ غصہ قابو میں آجائے تو اس وقت یہ دیکھے کہ کہاں غصے کا موقع ہے اور کہاں غصے کا موقع نہیں، جہاں غصے کا جائز محل ہو، بس وہاں جائز حد تک غصہ کرے، اس سے زیادہ نہ کرے۔

غصہ کا غلط استعمال

جیسا کہ ابھی میں نے بتایا کہ "بغض فی اللہ" یعنی اللہ کے لیے غصہ کرنا چاہیے، لیکن بعض لوگ اس کا انتہائی غلط استعمال کرتے ہیں، چنانچہ زبان سے تو یہ کہتے ہیں کہ ہمارا یہ غصہ اللہ کے لیے ہے، لیکن حقیقت میں وہ غصہ نفسانیت اور تکبّر اور دوسرے کی حقارت کی وجہ سے ہوتا ہے۔ مثلاً جب اللہ تعالیٰ نے ذرا سی دین پر چلنے کی توفیق دے دی اور دین پر ابھی چلنا شروع کیا تو اب ساری دنیا کے لوگوں کو حقیر سمجھنے لگے۔ میرا باپ بھی حقیر ہے، میری ماں بھی حقیر ہے، میرا بھائی بھی حقیر ہے، میری بہن بھی حقیر ہے، میرے سارے گھر والے حقیر ہیں، ان سب کو حقیر سمجھنا شروع کر دیا اور یہ سمجھنے لگا کہ یہ سب تو جہنمی ہیں، میں جنتی ہوں اور مجھے اللہ تعالیٰ نے ان جہنمیوں کی اصلاح کے لیے پیدا کیا ہے۔ اب ان کی اصلاح کے لیے ان پر غصہ کرنا اور ان کے لیے نازیبا الفاظ استعمال کرنا اور ان کی تحقیر کرنی اور ان کے حقوق تلف کرنا شروع کر دیا، پھر شیطان یہ سبق پڑھاتا ہے کہ میں جو کچھ کر رہا ہوں یہ "بغض فی اللہ" کے ماتحت کر رہا ہوں۔ حالانکہ حقیقت میں یہ سب نفسانیت کے تحت کرتا ہے۔

چنانچہ جو لوگ دین پر نئے نئے چلنے والے ہوتے ہیں، شیطان ان کو اس طرح بہکاتا ہے کہ ان کو "بغض فی اللہ" کا سبق پڑھا کر ان سے دوسرے

مسلمانوں کی تحقیر اور تذلیل کراتا ہے اور اس کے نتیجے میں لڑائیاں، جھگڑے اور فساد ہوتے ہیں۔ بات بات پر لوگوں پر غصہ کرتے ہیں۔ بات بات پر لوگوں کو ٹوک دیتے ہیں۔ اس کے نتیجے میں فساد پھیل رہا ہے۔

علامہ شبیر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ کا ایک جملہ

حضرت علامہ شبیر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ کا ایک جملہ ہمیشہ یاد رکھنا چاہیے۔ وہ فرمایا کرتے تھے کہ حق بات، حق نیت سے، حق طریقے سے کہی جائے تو وہ کبھی بے اثر نہیں رہتی اور کبھی فتنہ و فساد پیدا نہیں کرتی۔ گویا کہ تین شرطیں بیان فرمادیں۔ نمبر ایک: بات حق ہو، نمبر دو: نیت حق ہو، نمبر تین: طریقہ حق ہو۔ مثلاً ایک شخص کسی برائی کے اندر مبتلا ہے، اب اس پر ترس کھا کر نرمی اور شفقت سے اس کو سمجھائے تاکہ وہ اس برائی سے کسی طرح نکل جائے۔ یہ نیت ہو، اس میں اپنی بڑائی مقصود نہ ہو اور دوسروں کو ذلیل کرنا مقصود نہ ہو اور طریقہ بھی حق ہو، یعنی نرمی اور محبت سے بات کہے۔ اگر یہ تین شرطیں پائی جائیں تو فتنہ پیدا نہیں ہوتا اور جہاں کہیں یہ دیکھو کہ حق بات کہنے کے نتیجے میں فتنہ کھڑا ہوگیا تو غالب گمان یہ ہے کہ اس کا سبب یہ ہے کہ ان تینوں باتوں میں سے کوئی ایک بات موجود نہیں تھی یا تو بات حق نہ تھی یا نیت حق نہیں تھی یا طریقہ حق نہیں تھا۔

تم خدائی فوجدار نہیں ہو

یہ بات یاد رکھیں کہ تم خدائی فوجدار بن کر دنیا میں نہیں آئے۔ تمہارا کام صرف اتنا ہے کہ حق بات حق نیت اور حق طریقے سے دوسروں کو پہنچاؤ اور

مناسب طریقے سے مسلسل پہنچاتے رہو۔ اس کام سے کبھی مت اُکتاؤ، لیکن ایسا کوئی کام مت کرو جس سے فتنہ پیدا ہو۔

اللہ تعالیٰ اپنی رحمت سے اور اپنے فضل و کرم سے ہم سب کو ان باتوں پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

وَاٰخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ
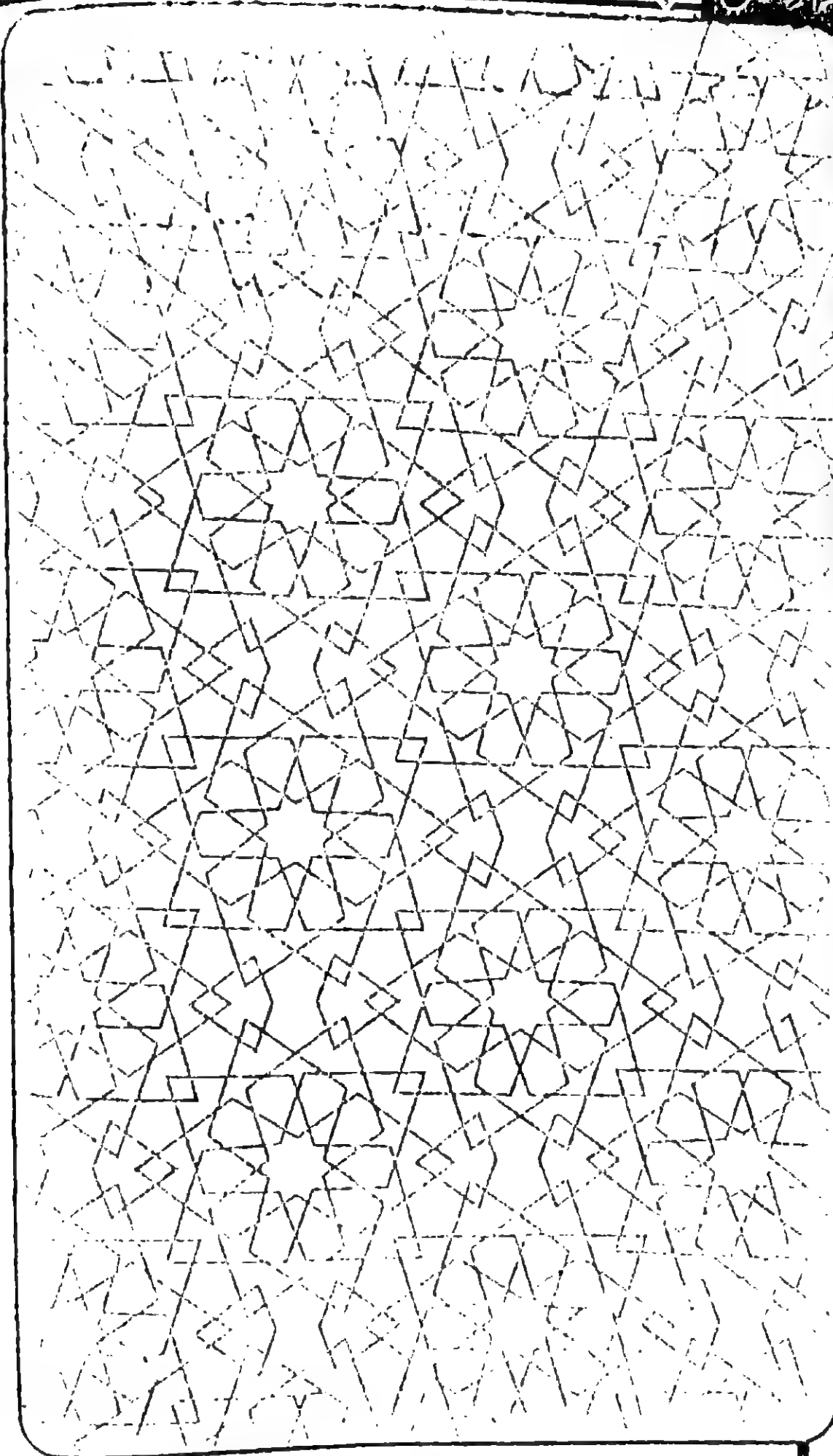
کامیاب مؤمن کون؟

(اصلاحی خطبات ج ۱۴ ص ۱۷۵)
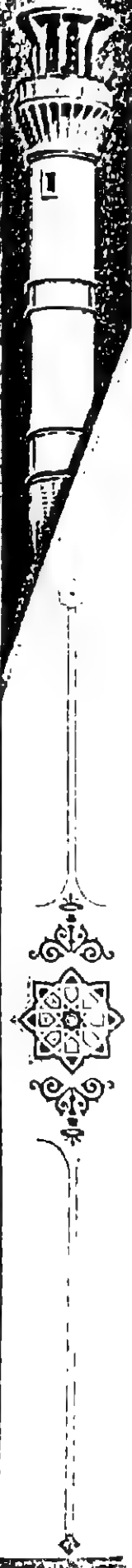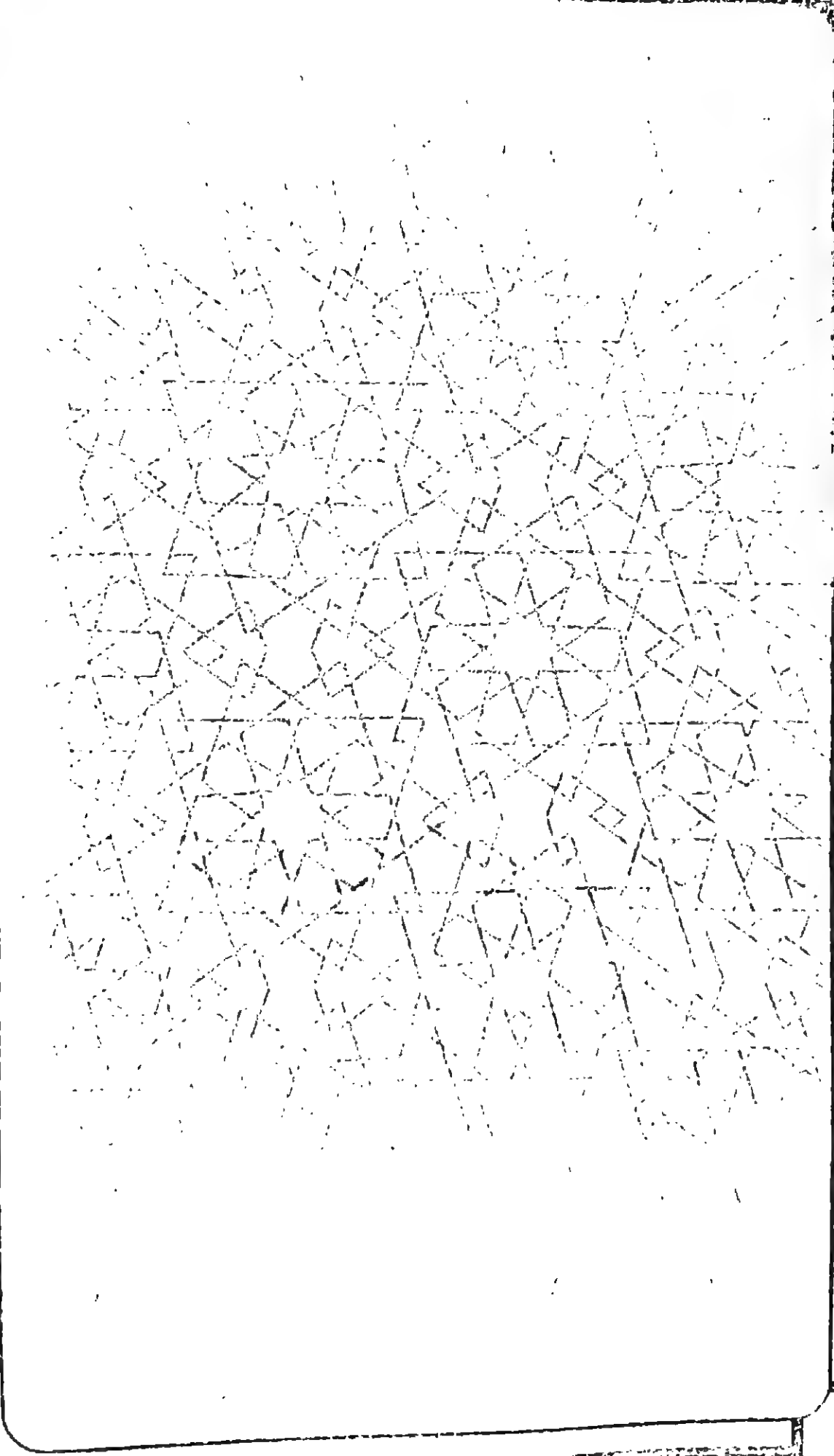
بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

کامیاب مؤمن کون؟

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَنَسْتَعِيْنُهٗ وَنَسْتَغْفِرُهٗ وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّئَاتِ اَعْمَالِنَا، مَنْ يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهٗ وَمَنْ يُّضْلِلْهُ فَلَا هَادِيَ لَهٗ، وَأَشْهَدُ اَنْ لَّا إِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ وَأَشْهَدُ اَنَّ سَيِّدَنَا وَنَبِيَّنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَعَلٰى اٰلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ وَبَارَكَ وَسَلَّمَ تَسْلِيْمًا كَثِيْرًا كَثِيْرًا۔ أَمَّا بَعْدُ!

فَاَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ ۙ﴿۱﴾ الَّذِيْنَ هُمْ فِيْ صَلَاتِهِمْ خٰشِعُوْنَ ۙ﴿۲﴾ وَالَّذِيْنَ هُمْ عَنِ اللَّغْوِ مُعْرِضُوْنَ ۙ﴿۳﴾ وَالَّذِيْنَ

هُمْ لِلزَّكٰوةِ فٰعِلُوْنَ ۝ وَ الَّذِيْنَ هُمْ لِفُرُوْجِهِمْ حٰفِظُوْنَ ۝ اِلَّا عَلٰٓى اَزْوَاجِهِمْ اَوْ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُمْ فَاِنَّهُمْ غَيْرُ مَلُوْمِيْنَ ۝ فَمَنِ ابْتَغٰى وَرَآءَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْعٰدُوْنَ ۝ (۱)

امنت باللّٰہ صدق اللّٰہ مولانا العظیم، و صدق رسولہ النبی الکریم ونحن علی ذلک من الشاھدین والشاکرین والحمد للّٰہ ربّ العالمین

حقیقی مؤمن کون؟

بزرگانِ محترم وبرادرانِ عزیز! میں نے ابھی آپ کے سامنے ''سورة المؤمنون'' کی ابتدائی آیتیں تلاوت کی ہیں، یہ آیتیں اٹھارویں پارے کے بالکل شروع میں آئی ہیں، ان آیات میں اللہ تبارک وتعالیٰ نے ''مؤمنین'' کی صفات بیان فرمائی ہیں کہ صحیح معنیٰ میں ''مؤمن'' کون لوگ ہیں؟ ان کی صفات کیا ہیں؟ وہ کیا کام کرتے ہیں اور کن کاموں سے بچتے ہیں؟ ساتھ میں اللہ تعالیٰ نے یہ بھی بیان فرمایا کہ جو مؤمنین ان صفات کے حامل ہوں گے، ان کو فلاح حاصل ہوگی۔

کامیابی کا مدار عمل پر ہے

ان آیات کی ابتداء ہی ان الفاظ سے فرمائی:

---

(۱) سورة المومنون آیت (۱تا۷)۔

قَدۡ اَفۡلَحَ الۡمُؤۡمِنُوۡنَ

یعنی ان مؤمنین نے فلاح پائی جن کے اندر یہ صفات ہیں۔ اس سے اس بات کی طرف اشارہ فرمایا کہ اگر مسلمان فلاح چاہتے ہیں تو ان اعمال کو اختیار کرنا ہوگا، یہ صفات اپنانی ہوں گی اور اس بات کی پوری کوشش کرنی ہوگی کہ جو باتیں یہاں بیان کی جارہی ہیں ان کو اپنی زندگی کے اندر داخل کریں، کیونکہ اسی پر مسلمانوں کی فلاح کا دارومدار ہے اور اسی پر فلاح موقوف ہے۔

فلاح کا مطلب

پہلے یہاں یہ بات سمجھ لیں کہ ''فلاح'' کا کیا مطلب ہے؟ جب ہم اردو زبان میں ''فلاح'' کا ترجمہ کرتے ہیں تو عام طور پر اس کا ترجمہ ''کامیابی'' سے کیا جاتا ہے، اس لیے کہ ہمارے پاس اردو زبان میں اس کے معنی ادا کرنے کے لیے کوئی اور لفظ موجود نہیں، اس وجہ سے مجبوراً اس کا ترجمہ ''کامیابی'' سے کردیا جاتا ہے، لیکن حقیقت میں عربی زبان کے لحاظ سے اور قرآنِ کریم کی اصطلاح کے لحاظ سے ''فلاح'' کا مفہوم اس سے بہت زیادہ وسیع اور عام ہے، اس لفظ کے اصل معنی یہ ہیں ''دنیا وآخرت میں خوشحال ہونا'' دنیا وآخرت دونوں کی خوشحالی کے مجموعے کو ''فلاح'' کہا جاتا ہے، چنانچہ اذان میں ایک کلمہ کہا جاتا ہے: ''حَیَّ عَلَی الْفَلَاح'' آؤ فلاح کی طرف، اذان کے اس کلمے سے بھی یہ بات بتائی جارہی ہے کہ اگر تم دنیا وآخرت دونوں کی خوشحالی چاہتے ہو تو نماز کے لیے آؤ اور مسجد پہنچو۔ بہرحال! ''فلاح'' کا لفظ بڑا ہی جامع اور مانع لفظ ہے۔

قرآنِ کریم میں ''سورۂ بقرہ'' کی ابتداء میں بھی فلاح کا لفظ استعمال ہوا ہے:

الٓمّٓ ذٰلِكَ الۡكِتٰبُ لَا رَيۡبَ فِيۡهِ.... اُولٰٓئِكَ عَلٰى هُدًى مِّنۡ

رَبِّهِمْ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ (۱)

یعنی جو لوگ تقویٰ اختیار کرنے والے ہیں اور آخرت پر ایمان رکھنے والے ہیں قرآنِ کریم پر اور قرآنِ کریم سے پہلے نازل ہونے والی تمام کتابوں پر ایمان رکھنے والے ہیں، یہی لوگ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہدایت یافتہ ہیں اور یہی لوگ فلاح پانے والے ہیں، لہٰذا ''فلاح'' کا لفظ بڑا جامع ہے اور دنیا وآخرت کی تمام خوشحالیوں کو شامل ہے۔

کامیاب مؤمن کی صفات

اس ''سورۃ المؤمنون'' میں یہ کہا جارہا ہے کہ وہ مؤمن فلاح پائیں گے جن کے اندر وہ صفات ہوں گی جو آگے مذکور ہیں، پھر ایک ایک صفت کو بیان فرمایا کہ وہ مؤمن فلاح پائیں گے جو اپنی نماز میں خشوع اختیار کرنے والے ہیں اور بیہودہ اور فضول باتوں سے اعراض کرنے والے ہیں اور زکوٰۃ دیتے ہیں اور زکوٰۃ کے حکم پر عمل کرنے والے ہیں اور اپنی شرم گاہوں کی حفاظت کرنے والے ہیں اور اپنی امانتیں اور اپنے عہد کو پورا کرنے والے ہیں۔ یہ ساری صفات ان آیاتِ کریمہ میں بیان فرمائی ہیں۔ ان میں سے ہر صفت تفصیل اور تشریح چاہتی ہے، ان صفات کا مطلب سمجھنے کی ضرورت ہے، اگر ان صفات کا صحیح مطلب اللہ تعالیٰ ہمارے ذہنوں میں بٹھادیں اور ان صفات کی اہمیت ہمارے ذہنوں میں پیدا فرمادیں اور ان صفات پر عمل کی توفیق عطا فرمادیں تو ان شاء اللہ ہم

(۱) سورۃ البقرۃ آیت (۱تا۵)۔

سب فلاح یافتہ ہیں۔ اس لیے خیال آیا کہ ان صفات کو تفصیل سے بیان کر دیا جائے، ہوسکتا ہے کہ ان کے بیان میں چند ہفتے لگ جائیں، ایک ایک صفت کا بیان ایک ایک جمعہ ہوتا جائے گا تو ساری صفات کا ان شاء اللہ بیان ہو جائے گا۔

پہلی صفت خشوع

پہلی صفت یہ بیان فرمائی کہ وہ مؤمن فلاح یافتہ ہیں جو اپنی نماز میں خشوع اختیار کرنے والے ہیں۔ گویا کہ فلاح کی اولین شرط اور فلاح کا سب سے پہلا راستہ یہ ہے کہ انسان نہ صرف یہ کہ نماز پڑھے، بلکہ نماز میں خشوع اختیار کرے، کیونکہ نماز ایسی چیز ہے کہ قرآنِ کریم میں اللہ تعالیٰ نے ۶۲ سے زیادہ مقامات پر اس کا حکم فرمایا، حالانکہ اگر اللہ تعالیٰ ایک مرتبہ حکم دے دیتے تو بھی کافی تھا، کیونکہ اگر ایک مرتبہ بھی قرآنِ کریم میں کسی کام کا حکم آجائے تو اس کام کو کرنا انسان کے ذمہ فرض ہو جاتا ہے، لیکن نماز کے بارے میں باسٹھ مرتبہ یہ حکم دیا کہ نماز قائم کرو۔ اس کے ذریعے اس حکم کی اہمیت بتانا مقصود ہے کہ نماز کو معمولی کام مت سمجھو، اور یہ نہ سمجھو کہ یہ روز مرہ کی روٹین کی ایک معمولی چیز ہے، بلکہ مؤمن کے لیے دنیا و آخرت میں کامیابی کے لیے سب سے اہم کام نماز پڑھنا ہے، نماز کی حفاظت کرنا ہے اور نماز کو اس کے احکام اور آداب کے ساتھ بجالانا ہے۔

حضرت فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ کا دورِ خلافت

حضرت فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ جو حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے دوسرے خلیفہ ہیں،

ان کے زمانۂ خلافت میں مسلمانوں کو فتوحات بہت زیادہ ہوئیں، اللہ تعالیٰ نے ان ہی کے ہاتھوں قیصر وکسریٰ کی شوکتوں کا پرچم سرنگوں کیا، قیصر وکسریٰ کے محلات مسلمانوں کے قبضے میں آئے۔ ایک دن میں نے حساب لگایا تو یہ بات سامنے آئی کہ حضرت فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ کے زیر نگیں ممالک کا کل رقبہ آج کے پندرہ ملکوں کے برابر ہے، یعنی آج پندرہ ممالک ان جگہوں پر قائم ہیں جہاں حضرت فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ کی حکومت تھی۔ یہ ایسے امیر المؤمنین تھے کہ فرماتے تھے کہ اگر دریائے فرات کے کنارے کوئی بکری بھی بھوکی مرجائے تو مجھے ڈر ہے کہ مجھ سے آخرت میں یہ سوال ہوگا کہ اے عمر! تیری حکومت میں ایک بکری بھوکی مرگئی تھی، اتنی زیادہ ذمہ داری کا احساس کرنے والے تھے [۱]۔ ان کے زمانے میں اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو خوش حالی بھی عطا فرمائی، کوئی شخص ان کی حکومت میں بھوکا نہیں تھا، سب کو انصاف مہیّا تھا، عدل و انصاف کا دور دورہ تھا، مسلمانوں کے ساتھ، غیر مسلموں کے ساتھ، مردوں کے ساتھ، عورتوں کے ساتھ، بوڑھوں کے ساتھ، بچوں کے ساتھ انصاف کا عظیم نمونہ حضرت فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ کی حکومت نے پیش کیا۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا سرکاری فرمان

اتنی بڑی حکومت کے جتنے فرماں رواں تھے اور مختلف صوبوں میں جتنے گورنر مقرر تھے اور مختلف شہروں میں جو حاکم مقرر تھے، ان سب کے نام حضرت

(۱) اس بارے میں روایات مختلف ہیں بعض میں بکری یا بکری کے بچے اور بعض میں اونٹنی کے بچے کا ذکر ہے۔ ان سب طرق کو علامہ ابن عبد الہادی نے اپنے رسالہ ''ایضاح طرق الاستقامۃ فی بیان احکام الولایۃ والامامۃ'' ص ۱۵۱ میں جمع کیا ہے۔ اور مشہور مقولہ جس میں کتے کا ذکر ہے اس کے بارے میں کوئی روایت نہیں ملی ۔ واللہ اعلم۔ مرتب

فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ نے ایک سرکاری فرمان بھیجا، یہ فرمان حضرت امام مالک رحمہ اللہ نے اپنی کتاب ''موطا'' میں لفظ بہ لفظ روایت کیا ہے، اس فرمان میں حضرت فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

''اِنَّ أَهَمَّ أَمْرِكُمْ عِنْدِيْ الصَّلَاةُ فَمَنْ حَفِظَهَا وَحَافَظَ عَلَيْهَا حَفِظَ دِيْنَهُ وَمَنْ ضَيَّعَهَا فَهُوَ لِمَا سِوَاهَا أَضْيَعُ''(۱)

میرے نزدیک تمہارے کاموں میں سب سے اہم کام نماز ہے، جس شخص نے نماز کی حفاظت کی اور اس پر مداومت کی، اس نے اپنے دین کی حفاظت کی اور جس شخص نے نماز کو ضائع کیا، وہ اور چیزوں کو زیادہ ضائع کرے گا۔

ضائع کرنے کے معنی یہ بھی ہیں کہ وہ نماز نہیں پڑھے گا اور یہ معنی بھی ہیں کہ نماز پڑھے گا، لیکن غلط طریقے سے پڑھے گا اور ضائع کرنے کے معنی یہ بھی ہیں کہ نماز پڑھنے میں لاپرواہی سے کام لے گا۔

نماز کو ضائع کرنے سے دوسرے امور کا ضیاع

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے اپنے حکام کو یہ فرمان اس لیے لکھ کر بھیجا کہ عام طور پر حاکم کے دل میں یہ بات ہوتی ہے کہ میرے سر پر تو قوم کی بہت بڑی ذمہ داریاں ہیں، لہٰذا اگر میں ان ذمے داریوں کی خاطر کسی وقت کی نماز قربان بھی کردوں تو کوئی حرج نہ ہوگا، کیونکہ میں بڑے فریضے کو ادا کر رہا ہوں۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ حاکموں کی اس غلط فہمی کو دور فرما رہے ہیں کہ تم یہ مت سمجھنا کہ

---

(۱) موطا امام مالک ۹/۲ (۹) طبع موسسہ زاید بن سلطان ابو ظبی۔

حاکم بننے کے بعد تمہاری ذمہ داریاں نماز سے زیادہ فوقیت رکھتی ہیں، بلکہ میرے نزدیک سب سے اہم کام یہ ہے کہ تمہاری نماز صحیح ہونی چاہیے، اگر اس نماز کی حفاظت کرو گے تو اللہ تعالیٰ کی حفاظت میں رہو گے اور اگر تم نے نماز کو ضائع کردیا تو تمہارے دوسرے کام اس سے زیادہ ضائع ہوں گے اور پھر حکومت کا کام تم سے ٹھیک نہیں چلے گا کیونکہ جب تم نے اللہ تعالیٰ کے حکم کو توڑ دیا اور اللہ تعالیٰ کی توفیق تمہارے شامل حال نہ رہی تو پھر تمہارے کام کیسے درست ہوں گے۔

آج کل کی ایک گمراہانہ فکر

آج کل ہمارے معاشرے میں ایک گمراہی پھیل گئی ہے، وہ یہ کہ لوگوں کے دماغ میں یہ بات آگئی ہے کہ بہت سے کام ایسے ہیں جو نماز سے زیادہ فوقیت رکھتے ہیں۔ خاص طور پر یہ بات ان لوگوں کے اندر پیدا ہوگئی ہے جو دین کے کام میں مشغول ہیں، دعوت وتبلیغ کا کام کر رہے ہیں، جہاد کا کام کر رہے ہیں، سیاست کا کام کر رہے ہیں، یہ حضرات یہ سمجھتے ہیں کہ ہم بہت بڑا کام کر رہے ہیں، لہٰذا چونکہ ہم بڑا کام کر رہے ہیں، اس لیے اگر کبھی اس بڑے کام کی خاطر نماز چھوٹ گئی یا نماز میں کمی آگئی یا نماز میں کوئی نقص واقع ہوگیا تو کوئی حرج کی بات نہیں، کیونکہ ہم اس بڑے کام میں لگے ہوئے ہیں، ہم دعوت وتبلیغ کے کام میں اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے کام میں لگے ہوئے ہیں، جہاد کے کام میں لگے ہوئے ہیں اور سیاست کے کام میں یعنی دین کو اس دنیا میں برپا کرنے اور اقامتِ دین کے کام میں لگے ہوئے ہیں، اس لیے اگر ہماری جماعت چھوٹ

جائے گی تو ہم گھر میں نماز پڑھ لیں گے اور اگر نماز کا وقت نکل گیا تو قضاء پڑھ لیں گے یاد رکھیے! یہ بڑی گمراہانہ فکر ہے۔

حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ اور گمراہی کا علاج

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ سے زیادہ دین کا کام کرنے والا کون ہوگا؟ ان سے بڑا سیاست کا علَم بردار کون ہوگا؟ ان سے بڑا جہاد کرنے والا کون ہوگا؟ ان سے بڑا داعی اور مبلغ کون ہوگا؟ لیکن وہ اپنے تمام فرمانرواؤں کو باقاعدہ یہ سرکاری فرمان جاری کر رہے ہیں کہ میرے نزدیک تمہارے سب کاموں میں سب سے اہم چیز نماز ہے، اگر تم نے اس کی حفاظت کی تو تمہارے اور کام بھی درست ہوں گے اور اگر اس کو ضائع کر دیا تو تمہارے اور کام بھی خراب ہوں گے۔

خود کو کافروں پر قیاس مت کرنا

تم اپنے آپ کو کافروں پر قیاس مت کرنا، غیر مسلموں پر قیاس مت کرنا اور یہ مت سوچنا کہ غیر مسلم بھی تو نماز نہیں پڑھ رہے ہیں مگر ترقی کر رہے ہیں، دنیا میں ان کا ڈنکا بج رہا ہے، خوشحالی ان کا مقدر بنی ہوئی ہے اور دنیا کے اندر ان کی ترقی کے ترانے پڑھے جا رہے ہیں یاد رکھو! تم اپنے آپ کو ان پر قیاس مت کرنا، اللہ تعالیٰ نے مؤمن کا مزاج اور مؤمن کا طریقۂ زندگی کافر کے مقابلہ میں بالکل مختلف قرار دیا ہے، قرآنِ کریم کا کہنا یہ ہے کہ مؤمن کو فلاح نہیں ہوسکتی جب تک وہ ان کاموں پر عمل نہ کرے جو یہاں بیان کیے گئے ہیں، ان میں سب سے پہلا کام نماز ہے۔

نماز میں خشوع مطلوب ہے

لہٰذا اگر تم فلاح چاہتے ہو تو اس کی پہلی شرط نماز کی حفاظت ہے۔ پھر یہاں پر یہ نہیں فرمایا کہ وہ لوگ فلاح پائیں گے جو نماز پڑھتے ہیں بلکہ یہ فرمایا کہ وہ مؤمن فلاح پائیں گے جو اپنی نماز میں ''خشوع'' اختیار کرنے والے ہیں۔ خشوع کا کیا مطلب ہے؟ اس کو اچھی طرح سمجھ لیجیے۔ اللہ تعالیٰ اپنے فضل سے ہم سب کو ''خشوع'' عطا فرمادے۔ آمین۔

''خضوع'' کے معنی

دیکھیے! دو لفظ ہیں جو عام طور پر ایک ساتھ بولے جاتے ہیں، ایک ''خشوع'' دوسرا ''خضوع'' چنانچہ کہا جاتا ہے کہ فلاں نے بڑے خشوع خضوع کے ساتھ نماز پڑھی۔ خشوع ''ش'' سے ہے اور خضوع ''ض'' سے ہے۔ دونوں کے معنی میں تھوڑا سا فرق ہے، خضوع کے معنی ہیں ''جسم کو اللہ تعالیٰ کے آگے جھکا دینا'' یعنی جب نماز میں کھڑے ہوئے تو جسم کو اللہ جل شانہ کے آگے جھکا دیا۔ جسم کو جھکا دینے کا مطلب یہ ہے کہ جب نماز میں کھڑے ہوئے تو تمام آداب کا لحاظ رکھتے ہوئے کھڑے ہوئے، رکوع کیا تو اس کے آداب کے ساتھ رکوع کیا، سجدہ کیا تو اس کے آداب کے ساتھ سجدہ کیا، گویا کہ ''اپنے ظاہری اعضا کو اللہ تعالیٰ کے سامنے جھکا دینا'' یہ معنی ہیں خضوع کے، لہٰذا خضوع کا تقاضا یہ ہے کہ جب آدمی نماز میں کھڑا ہو تو اس کے تمام اعضاء ساکن و ساکت ہوں اور ان کے اندر حرکت نہ ہو۔ قرآنِ کریم میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَقُومُوا لِلّٰہِ قٰنِتِیۡنَ (۱)

یعنی نماز میں اللہ تعالیٰ کے لیے کھڑے ہوں تو قانت بن کر کھڑے ہوں۔ ''قانت'' کے معنی ہیں سکون کے ساتھ کھڑا ہونا، لہٰذا نماز میں بلاوجہ اپنے جسم کو ہلانا، بلاوجہ بار بار ہاتھ اٹھا کر اپنے جسم یا سر کو کھجانا، کپڑے درست کرنا، یہ سب باتیں خضوع کے خلاف ہیں۔

نماز میں اعضاء کو حرکت دینا

فقہائے کرام (۲) نے تو یہاں تک لکھا ہے کہ اگر کوئی شخص نماز کے ایک رکن مثلاً قیام میں تین مرتبہ بار بار بلا ضرورت اپنے ہاتھ کو حرکت دے کر کوئی کام کرے گا تو اس کی نماز ہی ٹوٹ جائے گی اور اگر تین مرتبہ سے کم کیا تو نماز نہیں ٹوٹے گی، لیکن نماز کی جو شان ہے اور جو سنت طریقہ ہے وہ حاصل نہیں ہوگا، نماز کی برکت حاصل نہیں ہوگی۔ آج کل ہماری نمازوں میں یہ خرابی کثرت سے پائی جاتی ہے کہ جب نماز میں کھڑے ہوتے ہیں تو اپنے جسم کو بلاوجہ حرکت دیتے ہیں، یہ بلاوجہ حرکت دینا خضوع کے خلاف ہے اور سنت کے اور نماز کے آداب کے خلاف ہے۔

تم شاہی دربار میں حاضر ہو

جب تم نماز میں کھڑے ہوتے ہو تو اللہ تعالیٰ کے دربار میں کھڑے ہوتے

---

(۱) سورۃ البقرۃ آیت (۲۳۸)۔

(۲) ملاحظہ ہو الدر المختار مع رد المحتار ۶۴۰/۱ کتاب الصلاۃ، باب ما یفسد الصلاۃ و ما یکرہ فیہا، طبع سعید۔

ہو۔ اگر کسی سربراہِ مملکت کا دربار ہو اور اس دربار میں پریڈ ہو رہی ہو تو اس پریڈ میں جو شریک ہوتا ہے وہ پریڈ کے آداب کی پوری پابندی کے ساتھ کھڑا ہوتا ہے، وہ یہ نہیں کرتا کہ کبھی سر کھجا رہا ہے، کبھی ہاتھ کھجا رہا ہے، کبھی کپڑے درست کر رہا ہے، کیونکہ کسی بادشاہ کے دربار میں یہ حرکتیں نہیں کی جاتیں۔ جب دنیا کے عام بادشاہوں کا یہ حال ہے تو تم تو احکم الحاکمین کے دربار میں کھڑے ہو جو سارے بادشاہوں کا بادشاہ ہے، اس کے دربار میں کھڑے ہو کر ایسی بے جا حرکتیں کرنا بالکل مناسب نہیں ہے، بلکہ اس کے دربار کے تمام آداب کا لحاظ کر کے کھڑا ہونا چاہیے۔

حضرت ابوعبداللہ محمد بن نصر المروزی رحمۃ اللہ علیہ اور خضوع

حضرت ابوعبداللہ محمد بن نصر المروزی رحمۃ اللہ علیہ کے بارے میں روایات میں آتا ہے کہ وہ نماز اس طرح پڑھا کرتے تھے کہ دیکھنے والے ان کو دیکھ کر کہا کرتے تھے کہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جیسے کوئی لکڑی کھڑی ہے جس میں کوئی حرکت نہیں ہوتی [1]، لہٰذا جب اللہ تعالیٰ کے دربار میں کھڑے ہوں تو قانت بن کر اور اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ کے دربار میں حاضر سمجھ کر کھڑے ہوں۔

گردن جھکانا خضوع نہیں

نماز میں کھڑے ہونے کا جو سنت طریقہ ہے، اس کے مطابق کھڑا ہونا ہی خضوع ہے۔ بعض لوگ خضوع پر عمل کرتے ہوئے قیام کی حالت میں بہت

---

(۱) شعب الایمان للبیہقی ۵۱۴/۴ (۲۹۰۶) طبع الرشد۔

جھک جاتے ہیں اور سینہ بھی جھکا لیتے ہیں، یہ طریقہ سنت کے خلاف ہے۔ سنت طریقہ یہ ہے کہ قیام کی حالت میں آدمی سیدھا کھڑا ہو اور گردن اس حد تک نیچی ہو کہ نگاہ سجدہ کی جگہ پر ہو، اس سے زیادہ گردن کو جھکا لینا کہ ٹھوڑی سینے سے لگ جائے، یہ سنت کے خلاف ہے اور بلاوجہ نماز کے اندر حرکت کرنا بھی خلافِ سنت ہے، ہاں! اگر کبھی بہت زیادہ خارش ہو رہی ہو تو کھجانا جائز ہے، لیکن بلاوجہ حرکت کرنا سنت کے خلاف ہے۔ بہر حال! خضوع کے معنی ہیں ''اپنے جسم کو اللہ تعالیٰ کے لیے جھکا لینا۔''

خشوع کے معنی

دوسرا لفظ ہے ''خشوع'' اس کے معنی ہیں ''دل کو اللہ تعالیٰ کے لیے جھکا لینا''، یعنی دل کو اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ کر لینا۔ دونوں کا مجموعہ خشوع خضوع کہلاتا ہے، اس لیے کہا جاتا ہے کہ نماز خشوع خضوع کے ساتھ پڑھو، یہ دونوں کام ضروری ہیں۔

خضوع کا خلاصہ

آج میں نے مختصراً ''خضوع'' کے بارے میں عرض کر دیا، اس کا خلاصہ یہ ہے کہ نماز میں جو سنت طریقہ ہے، اس کے مطابق اپنے اعضاء کو لے آؤ، بلا ضرورت اپنے اعضاء کو حرکت نہ دو۔ اب سوال یہ ہے کہ کس طرح سنت کے مطابق اعضاء کو لائیں، اس کے لیے میرا ایک چھوٹا سا رسالہ ہے جو ''نمازیں سنت کے مطابق پڑھیے'' کے نام سے شائع ہو گیا ہے، انگریزی[1] میں بھی اس

(۱) انگریزی زبان میں اس کا ترجمہ ''Perform Salah Correctly'' کے نام سے مکتبہ معارف القرآن کراچی سے چھپ چکا ہے۔

کا ترجمہ ہو گیا ہے، اس رسالے کو سامنے رکھیے اور دیکھیے کہ اپنے اعضاء کو نماز کے اندر رکھنے کے کیا آداب ہیں، اگر اس پر عمل کرلیا جائے تو ان شاء اللہ خشوع حاصل ہوجائے گا۔ خشوع کس طرح حاصل ہوگا؟ اس کے بارے میں ان شاء اللہ آئندہ جمعہ میں عرض کروں گا[1]۔ اللہ تعالیٰ مجھے اور آپ سب کو اس پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

وَاٰخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ

(۱) اس کے لیے مواعظِ عثمانی حصہ عبادات ملاحظہ فرمائیں۔ از مرتب
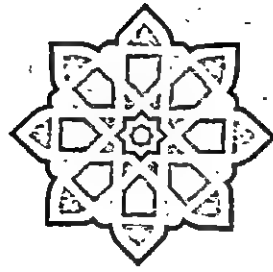
مومن زندگی کیسے گزارتا ہے

(درسِ شعب الایمان ج ۱ ص ۱۰۷)
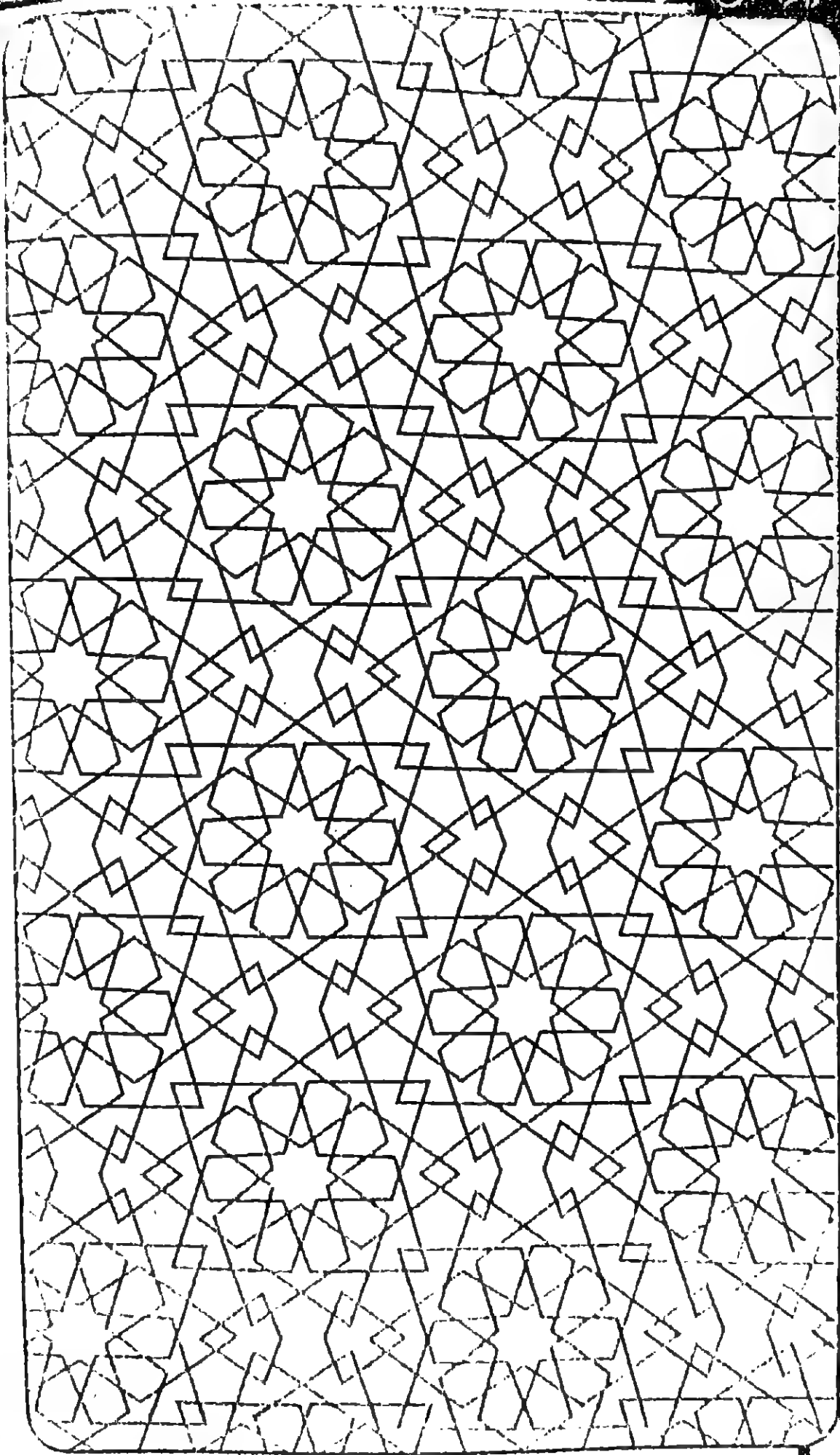
بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مومن زندگی کیسے گزارتا ہے؟

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ نَحْمَدُہٗ وَنَسْتَعِیْنُہٗ وَنَسْتَغْفِرُہٗ وَنُؤْمِنُ بِہٖ وَنَتَوَکَّلُ عَلَیْہِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَیِّئَاتِ اَعْمَالِنَا، مَنْ یَّھْدِہِ اللّٰہُ فَلَا مُضِلَّ لَہٗ وَمَنْ یُّضْلِلْہُ فَلَاھَادِیَ لَہٗ وَأَشْھَدُ اَنْ لَّا إِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ وَحْدَہٗ لَاشَرِیْکَ لَہٗ وَأَشْھَدُ اَنَّ سَیِّدَنَا وَنَبِیَّنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ صَلَّی اللّٰہ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَعَلٰی اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَبَارَکَ وَسَلَّمَ تَسْلِیْمًا کَثِیْرًا کَثِیْرًا أما بعد!

عن سعد بن أبی وقاص رضی اللہ عنہ عنه قال قال رسول الله ﷺ: «عجبت للمومن ان اعطى قال الحمد لله فشكر وإن ابتلى قال الحمد لله فصبر فالمومن يوجر على كل حال حتى اللقمة يرفعها إلى فيه»(۱)

(۱) شعب الایمان للبیهقی ۲۷۵/٦ (٤١٦٨) طبع الرشد۔ ومسند احمد ۸٦/۳ (۱٤۹۲) واصله فی صحیح البخاری ۳/٤ (۲۷٤۲) ضمن حدیث طویل۔

مؤمن کے حال پر تعجب

بزرگان محترم اور برادرانِ عزیز! حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم سرور دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ

مجھے مؤمن کی اس حالت پر تعجب ہوتا ہے (یعنی جو شخص صحیح معنیٰ میں ایمان رکھنے والا ہو اس کے حالات پر مجھے تعجب ہوتا ہے) اس لیے کہ اگر اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے اسے کوئی نعمت ملے تو وہ الحمد للہ کہہ کر شکر ادا کرتا ہے اور کبھی اس پر کوئی آزمائش آجائے، کوئی تنگی آجائے، کوئی تکلیف آجائے تو اس پر بھی وہ الحمد للہ کہہ کر صبر کرتا ہے، تو وہ دونوں حالتوں میں اللہ تبارک وتعالیٰ کی حمد کرتا ہے اور الحمد للہ کہتا ہے۔ "فالمؤمن یؤجَز علیٰ کل حال" تو مومن کو ہر حالت میں اجر ملتا ہے۔ اچھی حالت ہو تب بھی شکر ادا کر کے اجر ملے گا اور بری حالت ہو تو تب بھی صبر کر کے اجر ملے گا۔ تو مومن کا کسی بھی حال میں گھاٹا نہیں۔ اس کا تو فائدہ ہی فائدہ ہے۔ "حتّی اللقمۃ یرفعھا إلی فیہ" یہاں تک کہ جو لقمہ اٹھا کر وہ اپنے منہ میں لے جاتا ہے اس پر بھی اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے اجر ملتا ہے، یعنی اگر وہ اس کو اللہ تعالیٰ کی نعمت سمجھ کر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کر کے کھائے تو اس پر بھی اجر ملے گا۔

کافر اور مومن میں فرق

یعنی سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم یہ فرمارہے ہیں کہ مومن کا حال یہ ہے کہ وہ اپنی زندگی کے ہر لمحہ میں، ہر حال میں اور ہر فعل وحرکت میں اپنے لیے ثواب کے خزانے جمع کرسکتا ہے۔ بس ذرا سا زاویہ نگاہ بدلنے کی بات ہے، وہی ایک بات کافر کو بھی پیش آسکتی ہے اور جو انسان غفلت کی زندگی گزار رہا ہے اس کو بھی پیش آسکتی ہے وہی بات ایک مومن کو بھی پیش آسکتی ہے، لیکن دونوں میں زمین اور آسمان کا فرق یہ ہے کہ پہلا شخص یا تو ایمان نہیں رکھتا یا غفلت کی حالت میں زندگی گزار رہا ہے تو اس کا کوئی بھی حال ایسا نہیں جو اس کی نیکیوں میں اضافہ کرے، اس کے احسانات میں اضافہ کرے، اس کے ثواب اور اجر میں اضافہ کرے۔ بس زندگی گزری چلی جارہی ہے اور کوئی آخرت کا سامان جمع نہیں ہو رہا، لیکن وہی چیز اور وہی حالات جب ایک مومن کو پیش آرہے ہیں تو اس کی ہر ہر نقل وحرکت پر اللہ تبارک وتعالیٰ کے ہاں نیکیاں لکھی جارہی ہیں، ثواب لکھا جارہا ہے اور آخرت میں خزانے جمع ہو رہے ہیں۔

بظاہر ایک جیسے کام ہیں

کام تو بظاہر دونوں کے ایک جیسے ہیں، یہ بھی کھاتا ہے، وہ بھی کھاتا ہے، یہ بھی پیتا ہے، وہ بھی پیتا ہے، یہ بھی روزی کماتا ہے، وہ بھی روزی کماتا ہے۔ یہ اپنے گھر والوں سے ملتا ہے، وہ بھی اپنے گھر والوں سے ملتا ہے۔ یہ بھی دوست احباب سے ملاقات کرتا ہے، وہ بھی دوست احباب سے ملاقاتیں کرتا ہے۔ اس کو بھی خوشیاں ملتی ہیں، اُس کو بھی خوشیاں ملتی ہیں، اِس پر بھی تکلیفیں آتی ہیں،

اُس پر بھی تکلیفیں آتی ہیں، لیکن دونوں کے حالات میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ یہ سارے حالات جو گزر رہے ہیں، یہ کافر اور غافل مومن کے حق میں بالکل ایسے ہیں جیسے مٹی۔ اس کا کوئی فائدہ نہیں اور اس کا کوئی ثواب نہیں۔

زاویۂ نگاہ درست کرنے میں فائدہ

اور وہ مومن جس کا زاویۂ نگاہ درست ہو گیا ہو، جس کی سوچ درست ہوگئی ہو تو اس کی ہر ہر نقل و حرکت اللہ تبارک وتعالیٰ کے ہاں ایک عظیم اجر وثواب کا سبب بن رہی ہے، مومن کوئی قدم نہیں اٹھاتا مگر اس قدم پر اس کو ثواب ملتا ہے، انبیاء علیہم السلام کے وارثین علماءِ کرام، اولیاءِ کرام اور بزگان دین ہیں۔ ان کی صحبت سے یہ چیز حاصل ہوتی ہے کہ آدمی کا زاویۂ نگاہ بدل جاتا ہے، سوچنے کا انداز بدل جاتا ہے اور اس سوچ کے بدلنے کے انداز سے انسان جہنم سے جنت کی طرف آجاتا ہے اور اس کا ہر ہر لمحہ اللہ تبارک وتعالیٰ کے ہاں عبادت بن جاتا ہے، اس لیے حضور اکرم سرور دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم فرمارہے ہیں کہ ''مجھے مومن کے حال پر تعجب ہوتا ہے کہ اس کو کسی بھی حالت میں گھاٹا نہیں ہے''۔

ایمان کا استحضار کرتے رہو

یہ ایمان بڑی دولت ہے اور اس ایمان کا استحضار بھی بڑی نعمت ہے جس کی وجہ سے زندگی کا ہر ہر لمحہ عبادت بن رہا ہے، اللہ تعالیٰ کی رضا کا ذریعہ بن رہا ہے اور اجر وثواب کا ذریعہ بن رہا ہے، میں نے اپنے والدِ ماجد رحمۃ اللہ علیہ سے سنا۔ اللہ تعالیٰ ان کے درجات بلند فرمائے۔ حضرت مولانا مفتی محمد حسن صاحب رحمۃ اللہ علیہ جو حضرت حکیم الامت قدس اللہ سرہٗ کے اجل خلفاء میں سے تھے اور حضرت

حکیم الامت قدس اللہ سرہٗ کے عاشق زار تھے۔ وہ بڑے ہی والہانہ انداز میں فرمایا کرتے تھے کہ دیکھو! یہ ایمان بڑی دولت ہے۔ اس ایمان کو بچا بچا کر قبر تک لے جاؤ تو آگے جیت ہی جیت ہے اور کامیابی ہی کامیابی ہے۔ یعنی دل میں ایمان کا استحضار ہو کہ میں اللہ تبارک وتعالیٰ کی ذات پر ایمان رکھتا ہوں۔ اللہ تبارک وتعالیٰ مجھے ہر آن دیکھ رہے ہیں۔ یہ بات مستحضر ہو جائے تو اس کو بچا بچا کر قبر تک لے جاؤ پھر آگے جیت ہی جیت ہے۔

ایمان کی عجیب خاصیت

نبی کریم سرورِ دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس ایمان کی خاصیت یہ بتائی ہے کہ جب اللہ تعالیٰ کی ذات پر ایمان ہوتا ہے تو حال اچھا ہو یا برا ہو، دونوں صورتوں میں بندہ اپنے اللہ جل جلالہ کا شکر ادا کرتا ہے، الحمد للہ کہتا ہے۔ اس لیے جب کوئی نعمت ملے شکر ادا کرو، الحمد للہ کہو۔

کثرتِ شکر کی ضرورت

اور اگر کوئی تکلیف آئے تو بھی کہو۔ ”الحمد لله علٰی کلِ حال“، ہر حالت میں ہم اللہ تبارک وتعالیٰ کا شکر ادا کرتے ہیں، کیونکہ جو بظاہر تکلیف کی صورت نظر آرہی ہے عین اس وقت میں بھی انسان اللہ جل جلالہ کی لاکھوں نعمتوں میں ڈوبا ہوا ہوتا ہے۔ تو شکر کی عادت ڈالنے کی اور اس کی رٹ لگانے کی ضرورت ہے، ہمارے حضرت والا فرمایا کرتے تھے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ کا شکر ادا کرنے کی رٹ لگاؤ اور چلتے پھرتے، اٹھتے بیٹھتے ہر حال میں جو اچھی بات نظر آئے اس پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرنے کی عادت ڈالو۔

حضرت نوح علیہ السلام کتنے شکر گزار تھے!

قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے حضرت نوح علیہ السلام کے بارے میں فرمایا:

اِنَّهٗ كَانَ عَبۡدًا شَكُوۡرًا (۱)

وہ بڑے شکر گزار بندے تھے۔

یہ آیت حضرت نوح علیہ السلام کے بارے میں نازل ہوئی، اللہ تعالیٰ نے حضرت نوح علیہ السلام کے بارے میں فرمایا کہ وہ ہمارے شکر گزار بندے تھے، تو حضراتِ انبیاء کرام علیہم السلام سارے ہی شکر گزار تھے۔ کوئی نبی ایسا نہیں ہے جو شکر گزار نہ ہو، سب ہی شکر گزار تھے، لیکن حضرت نوح علیہ السلام کے بارے میں خاص طور پر کہا گیا ہے کہ یہ ہمارے شکر گزار بندے تھے۔ اس کی توجیہ میں متعدد صحابہ کرام اور تابعین رضی اللہ عنہم سے یہ بات مروی ہے کہ ان کی خصوصیت یہ تھی کہ ان کی زبان پر ہر وقت اللہ تبارک وتعالیٰ کا شکر رہتا تھا، جو قدم اٹھاتے تھے تو اٹھانے کے بعد کہتے تھے کہ اے اللہ! تیرا کرم ہے کہ یہ قدم اٹھ گیا۔ کھاتے ہوئے شکر، پیتے ہوئے شکر، لوگوں سے ملتے ہوئے شکر، بیت الخلاء سے فارغ ہوکر شکر ادا کرتے تھے۔ (۲)

---

(۱) سورۃ الاسراء آیت (۳)۔

(۲) تفسیر الطبری ۴۵۲/۱۴ و ۴۵۳۔ والمعجم الکبیر للطبرانی ۳۲/۶ (۵۴۲۰) مختصراً، وذکرہ الهیثمی فی "مجمع الزوئد" ۲۹/۵ (۷۹۴۹) وقال: رواہ الطبرانی، وتابعیہ لم اعرفہ، وبقیۃ رجالہ رجال الصحیح۔ ومصنف ابن ابی شیبۃ ۱۱۴/۶ (۲۹۹۰۵)۔

بیت الخلاء سے نکلنے کی دعا

حدیث میں آتا ہے کہ یہ جو بیت الخلاء سے نکلنے کی دعا حضور اقدس سرور دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے مروی ہے:

"اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ أَذْهَبَ عَنِّی الْأَذٰی وَعَافَانِیْ" (۱)

اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ جس نے مجھ سے گندگی کو دور کر دیا
اور مجھے عافیت عطا فرمائی۔

اسی مفہوم کی دعا حضرت نوح علیہ السلام سے بھی مروی ہے۔ حضرت نوح علیہ السلام کا بھی اس موقع پر دعا پڑھنے کا معمول تھا۔ تو کوئی اچھی حالت ہو یا بُری حالت ہو، لیکن ان کی زبان پر ہر دم شکر رہتا تھا، اسی لیے اللہ جل جلالہ نے ان کو "اِنَّه كَانَ عَبْدًا شَكُوْرًا" فرمایا کہ یہ ہمارے شکر گزار بندے تھے، کیونکہ ہر لمحہ ان کی زبان پر شکر رہتا تھا۔

آل داود کا شکر

اور ایک مرتبہ حضرت داود علیہ السلام کے گھر والوں سے اللہ تبارک وتعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

---

(۱) سنن ابن ماجه ۲٦۹/۱ (۳۰۱) من حديث انس بن مالك رضى الله عنه، قال ابن الملقن فى "تحفة المحتاج" ۱٦۸/۱ (۵۰): رواه ابن ماجه، وفى اسناده اسماعيل بن مسلم المخزومى، وهو ضعيف، لكنه من فضائل الاعمال۔ طبع دار حراء مكة المكرمة۔ والسنن الكبرى للنسائى ۳۵/۹ (۹۸۲۵) من حديث ابى ذر رضى الله عنه۔

اِعْمَلُوْٓا اٰلَ دَاوٗدَ شُكْرًا وَ قَلِيْلٌ مِّنْ عِبَادِيَ الشَّكُوْرُ[1]

اے داود کے خاندان کے لوگو! شکر کو اپنا معمول بناؤ اور میرے بندوں میں شکر گزار بہت کم ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے شکایت فرمائی کہ میرے بندوں میں شکر کرنے والے بہت کم ہیں۔ میں نے اپنے بندوں کو جتنی نعمتوں سے نوازا ہے وہ اتنی ہی ناشکری میں مبتلا ہیں، لہٰذا تم ایسا نہ کرنا، تم شکر کو اپنا معمول بنالو۔

سب سے زیادہ آسان عبادت

اگر دیکھا جائے تو شکر سب سے زیادہ آسان عبادت ہے۔ اس سے زیادہ آسان عبادت کوئی اور نہیں ہوگی۔ کیوں؟ اس لیے کہ شکر کرنے میں کچھ روپیہ پیسہ خرچ ہوتا ہے؟ کچھ محنت لگتی ہے؟ جو ذرا سی بات اچھی لگی اور طبیعت کو پسند آئی تو اس کے اوپر کہہ دیا:

”اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ، اَللّٰھُمَّ لَكَ الْحَمْدُ وَلَكَ الشُّكْرُ“

اے اللہ! آپ کا شکر ہے، آپ کی حمد ہے، کوئی محنت نہیں، کوئی مشقت نہیں، کوئی روپیہ نہیں، کوئی پیسہ نہیں، کوئی خرچہ نہیں اور اگر زبان سے بھی نہیں کرتا، دل میں شکر ادا کرلیا، دل میں کہہ دیا کہ یا اللہ! تیرا شکر ہے۔ تو یہ بھی شکر ادا ہوگیا اور ایک حدیث میں آتا ہے کہ اگر بندہ اللہ تبارک وتعالیٰ کی نعمت کا صرف ذکر کردے، چاہے زبان سے کرے اور چاہے دل میں کرلے، یعنی یہ احساس کرلے کہ یہ مجھ پر اللہ تبارک وتعالیٰ کی نعمت ہے تو اس احساس کی وجہ

(۱) سورۃ سبا آیت (۱۳)۔

سے بھی اللہ تعالیٰ اس کو شکر میں شمار فرماتے ہیں اور اس کو شکر کی فضیلت حاصل ہوتی ہے [1]، تو یہ آسان بھی بہت ہے اور یہ بہت فضیلت کی چیز ہے۔ شکر کی کثرت کے راستے سے اللہ جل جلالہ کے ساتھ تعلق میں مضبوطی پیدا ہوتی ہے، تعلق مع اللہ مضبوط ہوتا ہے اور جب ایک مرتبہ تعلق مع اللہ مضبوط ہوگیا تو بس سمجھو کہ بیڑا پار ہوگیا اور یہ اللہ تبارک وتعالیٰ تک پہنچنے کا بہترین راستہ ہے۔

یا اللہ! شکر کے مواقع دیجیے

اور ایک بزرگ کا قول دیکھا کہ انہوں نے فرمایا کہ یا اللہ! یوں تو کوئی نعمت آتی ہے تو وہ بھی آپ کی نعمت ہے اور اگر کوئی تکلیف آتی ہے تو حقیقت میں وہ بھی آپ ہی کی نعمت ہوتی ہے اور ثواب حاصل کرنے کے دونوں راستے ہیں، نعمت پر شکر ادا کروں گا تو ثواب ملے گا اور تکلیف پر صبر کروں گا تو ثواب ملے گا، لیکن اے اللہ! میں کمزور ہوں۔ اس لیے میں آپ سے التجا کرتا ہوں کہ مجھے صبر کے مقابلے میں شکر کے مواقع زیادہ عطا فرمادیجیے یعنی اس بات کا موقع مجھے زیادہ ملے کہ میں آپ کی نعمتوں سے بہرآور ہوتا رہوں، ان پر شکرادا کرتا ہوں اور صبر کے مواقع کم ہوں۔ اللہ تبارک وتعالیٰ سے یہ بھی مانگنا چاہیے۔

---

(۱) حدیث شریف کے الفاظ یہ ہیں "والتحدث بنعمة الله شكر وتركها كفر" ملاحظہ ہو مسند احمد ۳۹۰/۳۰ (۱۸٤٤۹) ومسند البزار ۲۲٦/۸ (۳۲۸۲) والمعجم الکبیر للطبرانی ۸۵/۲۱ (۸٤) قال الهیثمی فی "مجمع الزوائد" ۲۱۸/۵ (۹۰۹۷): رواہ عبد اللہ بن احمد، والبزار، والطبرانی، ورجالہما ثقات۔

مصیبت میں مومن کا طرزِ عمل

تو غرض نبی کریم سرورِ دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں کہ مومن کا کسی حال میں گھاٹا نہیں ہے، ہر حال میں اجر ہے، شکر میں اجر اور پھر اگر کوئی تکلیف پہنچے تو اس پر صبر کرنے میں اجر، پچھلی مرتبہ [1] صبر سے متعلق بات شروع کی تھی کہ صبر کے معنی ہیں۔ ''کسی ناگوار حالت کو برداشت کرنا''، ایسی بات جو طبیعت کو ناگوار ہے، ناپسند ہے، وہ پیش آگئی تو اس کو براداشت کرلینا۔ بعض اوقات تکلیف کو کافر بھی برداشت کرلیتا ہے۔ مومن اس لحاظ سے تکلیف برداشت کرتا ہے کہ میرے اللہ جل جلالہ کی طرف سے یہ تکلیف آئی ہے تو اُس کا فیصلہ برحق ہے، اس کی مشیت برحق ہے۔ جو تکلیف بھی آئی ہے، یقیناً اس میں اللہ تبارک وتعالیٰ کی کوئی نہ کوئی حکمت ہے۔ اس لیے مجھے یہ تکلیف پہنچی ہے۔ ہاں! میں کمزور ہوں۔ اس لیے اس تکلیف کو دور کرنے کی دعا کروں گا، اللہ تبارک وتعالیٰ سے مانگوں گا، اللہ تبارک وتعالیٰ سے تکلیف کا ذکر بھی کروں گا، لیکن اس بات پر مکمل ایمان ہے کہ اللہ جل جلالہ کی مشیت برحق ہے، اس کے اوپر مجھے کوئی شکوہ نہیں ہے۔ اس پر مجھے کوئی گلہ نہیں ہے۔ یہ ہے صبر کی حقیقت۔

گناہ سے بچنے میں صبر

اور ناگوار باتوں کو برداشت کرنے کی اعلیٰ صورتیں تین ہیں: صبر عن المعصیۃ، صبر علی الطاعۃ اور صبر عن المعصیۃ۔

(۱) صبر سے متعلق تفصیلی مضامین کے لیے مواعظ عثمانی حصہ ''خطباتِ رمضان'' کی مراجعت مفید رہے گی۔ از مرتب

صبر عن المعصیۃ کے معنیٰ یہ ہیں کہ اپنے آپ کو معصیت سے بچانے میں صبر۔ دل میں معصیت کا تقاضا پیدا ہو رہا ہے، کوئی منظر ایسا سامنے ہے جس کو دیکھنا ناجائز ہے، لیکن دل میں شوق پیدا ہو رہا ہے، امنگ پیدا ہو رہی ہے، دل چاہ رہا ہے، دل مچل رہا ہے، اب اس کو روکنے سے طبیعت کو ناگواری ہوگی، مشقت محسوس ہوگی اور تکلیف ہوگی، لیکن اس تکلیف اور مشقت کو اللہ کے لیے برداشت کر لے تو یہ صبر کا اعلیٰ ترین مقام ہے۔

غیبت سے بچنا بھی صبر ہے

کسی مجلس میں بیٹھے ہیں اور وہاں غیبت شروع ہوگئی تو غیبت کے اندر مزہ آتا ہے اور جب کسی مجلس میں غیبت شروع ہو جاتی ہے تو بس پھر آدمی کا دل چاہتا ہے کہ میں بھی اس میں بڑھ چڑھ کر حصہ لوں۔ تو اب تو دل چاہ رہا ہے کہ میں غیبت کروں۔ یا کم از کم جو غیبت ہو رہی ہے تو اس کو سنوں اور اس سے مزہ لوں۔ یہ ہمارے مجلس کی عام حالت ہے، تو اب ساری مجلس جمی بیٹھی ہے۔ کسی کا ذکر ہو رہا ہے، کسی کا مذاق اڑایا جا رہا ہے، کسی کی برائی بیان ہو رہی ہے، تو اس وقت آدمی کا غیبت کرنے سے اور سننے سے رک جانا نفس کو بڑا شاق معلوم ہوتا ہے، یہ نفس پر بڑا گراں ہے، لیکن اگر اللہ جل جلالہ کی رضا کی خاطر آدمی نے اپنے آپ کو اس سے روک لیا، اپنی زبان کو روک لیا۔ تو یہ صبر کا بڑا اونچا مقام ہے۔

صبر کا بدلہ

وَجَزٰهُمْ بِمَا صَبَرُوْا جَنَّةً وَّحَرِيْرًا (۱)

---

(۱) سورۃ الدھر آیت (۱۲)۔

اور انہوں نے جو صبر سے کام لیا تھا، اس کے بدلے میں
(اللہ تعالیٰ) انہیں جنت اور ریشمی لباس عطا فرمائے گا۔

اللہ تعالیٰ جو جنت دیں گے وہ کس کے عوض میں دیں گے؟ کس کے بدلے میں دیں گے؟ صبر کے بدلے میں دیں گے۔ میرے بندوں نے اس وقت صبر کیا تھا جب ان کا کسی گناہ کرنے کے لیے دل مچل رہا تھا۔ انہوں نے میری خاطر اپنے اس دل کی خواہش کو قربان کر دیا اور اس گناہ سے بچ گئے اور شکر والا معاملہ تو آسان ہے کہ نعمت ملی اور شکر ادا کرلیا، لیکن یہ "صبر عن المعصية" گناہ سے اپنے آپ کو روک لینا ہے، یہ مجاہدہ ہے اور اس میں واقعی مشقت ہے۔

۵ خواہشات سے بچنے کا صلہ

اور اسی کو قرآنِ کریم میں فرمایا:

وَ اَمَّا مَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ وَنَهَى النَّفْسَ عَنِ الْهَوٰى ۝ فَاِنَّ الْجَنَّةَ هِىَ الْمَاْوٰى ۝ (۱)

وہ جو اپنے پروردگار کے سامنے کھڑا ہونے کا خوف رکھتا تھا اور اپنے نفس کو بری خواہشات سے روکتا تھا تو جنت ہی اس کا ٹھکانہ ہوگی۔

جس نے اپنے پروردگار کے سامنے کھڑا ہونے کا خوف دل میں رکھا کہ ایک دن مجھے اللہ جل جلالہ کے سامنے پیش ہونا ہے اور اپنے ایک ایک قول و فعل کا جواب دینا ہے یہ خوف دل میں رکھا اور اس خوف کی وجہ سے "وَنَهَى النَّفْسَ عَنِ

---

(۱) سورۃ النازعات آیت (۴۰-۴۱)۔

الْهَوٰی" نفس کو خواہشات پر عمل کرنے روک لیا "فَاِنَّ الْجَنَّةَ هِیَ الْمَاْوٰی" تو اس کا ٹھکانہ جنت ہے۔ یہ قرآنِ کریم فرماتا ہے۔ کیوں؟ اس لیے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے اپنے بندوں کے لیے یہی آزمائش رکھی ہے کہ آیا خواہشات کے بہاؤ پر بہتا چلا جاتا ہے یا اس نے خواہشات کے اوپر کوئی روک بھی عائد کی ہے؟ ہمارے احکام کی روک عائد کی ہے یا نہیں؟ یہ ساری آزمائش ہے۔ دنیا کی پیدائش کا یہی مقصد ہے جس کے لیے بندہ کو پیدا کیا گیا۔ یہ ہے صبر عن المعصية.

تکلیف تو ضرور آئے گی

اب سوچنے کی بات یہ ہے کہ اس دنیا کے اندر کوئی بھی بندہ ایسا نہیں ملے گا جس کو ساری زندگی کبھی کوئی ناگوار بات پیش نہ آئی ہو۔ ایسا کوئی ہے جسے کبھی تکلیف نہ پہنچی ہو، جس کو کبھی مشقت پیش نہ آئی ہو، جس کے ساتھ خلافِ طبیعت معاملہ نہ ہوا ہو؟ کوئی بھی نہیں، پیغمبر ہو، مومن ہو، ولی ہو، متقی ہو، فاسق ہو، کافر ہو، ہر ایک کو ناگوار باتیں پیش آتی ہیں، بڑے بڑے حکمران، بڑے بڑے سرمایہ دار، بڑے بڑے دولتمند کو بھی زندگی میں ایسے مواقع پیش آتے ہیں جو اس کی طبیعت کے خلاف ہوتے ہیں مگر کیا کرنا پڑتا ہے؟ برداشت کرنا پڑتا ہے۔ تو ناگوار بات تو پیش آئے گی اور خلاف طبع باتیں ہوں گی۔

اللہ کے لیے برداشت کرو

لیکن اگر تم نے ان تکلیف کی باتوں کو اور ان خلافِ طبیعت باتوں کو ایک

محض مجبوری سمجھ کر اختیار کرلیا کہ مجبوری تھی اور کچھ بھی نہیں تو اس کا کوئی فائدہ نہ ہوا، لیکن اگر ناگوار بات کو اللہ کے لیے برداشت کرلیا، طبیعت کے خلاف بات تھی، مزاج کے خلاف تھی، دل کی پسند کے خلاف تھی، لیکن تم نے اس لیے اس گناہ کو چھوڑ دیا کہ یہ اللہ جل جلالہ کا حکم ہے۔ تو ناگوار بات اس کو بھی پیش آئی مگر کچھ فائدہ نہ ہوا، اس ناگوار بات کو تم نے اللہ کے لیے برداشت کرلیا تو اس کا اجر بیان فرمایا:

اِنَّمَا یُوَفَّی الصّٰبِرُوْنَ اَجْرَهُمْ بِغَیْرِ حِسَابٍ (۱)

جو لوگ صبر سے کام لیتے ہیں، ان کا ثواب انہیں بے حساب دیا جائے گا۔

ایسا اجر ملے گا جس کی کوئی گنتی نہیں، جس کا کوئی شمار نہیں، جس کا کوئی حساب نہیں۔

○ اللہ کے لیے چوٹیں لگاؤ

اللہ تبارک وتعالیٰ نے ایک ایسا عجیب نظام رکھا ہے کہ وہی تکلیف مجبوری سمجھ کر اور دل مسوس کر برداشت کرلو کہ بھئی یہ تو مجبوری ہے اور اسی تکلیف کو اللہ کے لیے برداشت کرلو تو دونوں میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ اللہ کے لیے برداشت کرنے کے نتیجے میں اللہ تبارک وتعالیٰ کا قرب حاصل ہوتا ہے، اس کی رضا حاصل ہوتی ہے اور اجر وثواب حاصل ہوتا ہے، تو بھائی دل پر چوٹیں تو پڑتی ہیں، کافروں پر بھی پڑتی ہیں، مسلمانوں پر بھی پڑتی ہیں، فاسق لوگوں پر بھی پڑتی ہیں، نیک لوگوں پر بھی پڑتی ہیں، لیکن اگر وہ چوٹ اللہ کے لیے لگادی تو وہ

(۱) سورۃ الزمر آیت (۱۰)۔

چوٹ تمہارے لیے اتنا عظیم سرمایہ بنے گی کہ اللہ تبارک وتعالیٰ کے فضل وکرم سے اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل ہوگا، تجلیات حاصل ہوں گی۔

اقبال مرحوم کا عجیب شعر

تو بچا بچا کے نہ رکھ اسے ترا آئنہ ہے وہ آئنہ
کہ شکستہ ہو تو عزیز تر ہے نگاہِ آئنہ ساز میں

یہ آئینہ دل کا آئینہ ایسا ہے کہ اس کو بچا بچا کے نہ رکھو، نہ رکھ سکتے ہو، اس کے دل کے اوپر چوٹیں تو پڑیں گی، خواہشات تو لازماً پامال ہوں گی، چاہو تو ہوں گی، نہ چاہو تو ہوں گی، لیکن اگر تم نے یہ چوٹیں اللہ تعالیٰ کی رضا کی خاطر برداشت کرلیں اور یہ سوچا کہ شیشہ بنانے والے نے یہ ایسا شیشہ بنایا ہے کہ اس کو جتنی چوٹیں پڑیں گی تو اتنا ہی وہ راضی ہوگا، ''کہ شکستہ ہو تو عزیز تر ہے نگاہِ آئینہ ساز میں'' جتنا یہ دل ٹوٹے گا اتنا ہی اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں عزیز ہوگا۔

ٹوٹے ہوئے دلوں کا ساتھی

روایت میں فرمایا گیا:

''ان اللہ مع القلوب المنکسرۃ''(۱)

اللہ تعالیٰ ٹوٹے ہوئے دلوں کا ساتھی ہے۔

یعنی اللہ تبارک وتعالیٰ کے لیے جس نے دل توڑا، دل کی خواہشات کو پامال

(۱) الزهد لاحمد بن حنبل ٦٤ (٣٩١) طبع دار الكتب العلمية. وحلية الاولياء ٦/١٧٧ كلاهما من طريق سيار، ثنا جعفر، ثنا عمران القصير، قال: قال موسى علیہ السلام: يا رب اين ابغيك ؟قال: ابغني عند المنكسرة قلوبهم فاني ادنوا منهم كل يوم باعا، لولا ذلك لتهدموا

کیا اور اللہ تبارک وتعالیٰ کی خاطر اپنی خواہشات کی قربانی دی تو اللہ تعالیٰ اس کا ساتھی بن جاتا ہے اور اُس کے دل کے اندر اللہ تبارک وتعالیٰ آکر مکین ہوتے ہیں، یہ اللہ تبارک وتعالیٰ کی سنت ہے تو یہ صبر عن المعصیۃ ہے کہ گناہ کا داعیہ پیدا ہوا اور پھر تم اس کو اللہ کے لیے کچل دو، یہ اعلیٰ درجے کا صبر ہے۔

حضرت یوسف علیہ السلام کو بھی خیال آیا

دیکھو! انبیاء کرام علیہم السلام کو اللہ تعالیٰ نے انسان اور بشر بنا کر بھیجا کہ ان میں خواہشات وہی ہوتی ہیں، ان کے اندر بھی جذبات وہی ہوتے ہیں، لیکن وہ عمل کر کے دکھاتے ہیں کہ جذبات کو کس طرح کچلا جاتا ہے، خواہشات کو کس طرح پامال کیا جاتا ہے اور اس کے نتیجے میں بندہ اللہ تبارک وتعالیٰ کا قرب کیسے حاصل کرتا ہے۔

حضرت یوسف علیہ السلام کا واقعہ قرآنِ کریم میں مذکور ہے۔ ہر مسلمان جانتا ہے کہ قرآن کریم میں کوئی واقعہ یا کوئی قصہ محض قصہ گوئی کے لیے بیان نہیں ہوا، سبق لینے کے لیے بیان ہوا ہے، زلیخا نے حضرت یوسف علیہ السلام کو گناہ کی دعوت دی تو قرآن نے فرمایا:

وَلَقَدْ هَمَّتْ بِهٖ وَهَمَّ بِهَا (۱)

اس عورت نے تو واضح طور پر یوسف کے ساتھ برائی کا ارادہ کرلیا تھا اور یوسف کے دل میں بھی اس عورت کا خیال چلا آیا۔

---

(۱) سورۃ یوسف آیت (۲٤)۔

خیال آنے کی وجہ

اس بات کو قرآن نے خاص طور پر ذکر فرمایا کہ یہ نہ سمجھنا کہ پیغمبر تھے تو فرشتے تھے، تو ان کے دل میں گناہ کا خیال نہیں آتا تھا، ان کے دل میں بھی خیال آیا۔ یہ قرآنِ کریم میں اس لیے بتایا تاکہ سب سمجھ لیں جس طرح تم انسان ہو وہ بھی ایسے ہی انسان تھے، جذبات والے، خواہشات والے، امنگوں والے۔

اب اندازہ کرو کہ مدتوں سے گھر سے بچھڑے ہوئے ہیں اور ایسے ماحول میں ہیں کہ جس کے گھر میں رہ رہے ہیں وہ عورت دعوتِ گناہ دے رہی ہیں، دروازے بند کیے ہوئے ہیں، تالے ڈالے ہوئے ہیں اور اس وقت میں یہ انسان ہیں، بشر ہیں، بھرپور جوانی ہے، حسن و جمال کا پیکر ہیں اور اس وقت دعوتِ گناہ دی جارہی ہے، اس لیے ان کے دل میں خیال آچلا تھا۔

وہ گناہ سے کیسے بچے؟

آگے قرآن فرماتا ہے:

لَوْلَا أَنْ رَّاٰ بُرْهَانَ رَبِّهٖ [1]

اگر انہوں نے پروردگار کی دلیل نہ دیکھ لی ہوتی تو پتہ نہیں کیسے مبتلا ہوتے، لیکن جب ان کے دل میں خیال آیا تو انہوں نے اپنے جذبات کو اس طرح کچلا، جذبات کی قربانی اس طرح پیش کی کہ

---

(۱) سورۃ یوسف آیت (۲٤)۔

قَالَ مَعَاذَ اللّٰہِ اِنَّہٗ رَبِّیْٓ اَحْسَنَ مَثْوَایَ[1]

(یوسف نے) کہا اللہ کی پناہ! وہ میرا پروردگار ہے، اس نے مجھے اچھی طرح رکھا ہے (لہٰذا میں پروردگار کی ناشکری نہیں کرسکتا)۔

یعنی میں اس پروردگار کی ناشکری نہیں کرسکتا کہ میں اس گناہ میں مبتلا ہوجاؤں۔ اس لیے انہوں نے اپنے آپ کو بچانے کی پوری کوشش کی۔

دروازے تک بھاگنے کی کوشش

اور کوشش کیا کی؟ قرآنِ کریم میں ہے کہ جب زلیخا نے گناہ کی دعوت دی تھی تو دروازوں پر تالے ڈال دیے تھے تاکہ بھاگ کر کہیں نہ جاسکیں۔ حضرت یوسف علیہ السلام بھی دیکھ رہے تھے کہ دروازوں پر تالے پڑے ہوئے ہیں، لیکن یہ سوچا کہ میرے بس میں اتنا ہی ہے کہ میں بھاگ کر دروازے تک چلا جاؤں اور پھر اپنے رب کو پکاروں کہ معاذ اللہ! اللہ کی پناہ! یا اللہ! مجھے اس مصیبت سے بچالے۔ دروازے تک بھاگے تو اللہ تعالیٰ نے اپنی رحمت کا معجزہ دکھا دیا کہ جب وہ وہاں پہنچے تو دروازے کے تالے ٹوٹ چکے تھے اور اس عورت کا شوہر کھڑا ہوا نظر آ گیا۔ تو جب خواہش دل میں پیدا ہوئی تو اس کو کچل کر، اس کو پامال کر کے جتنا ان کے بس میں تھا، جہاں تک بھاگ سکتے تھے، بھاگے اور اللہ کو پکارا۔

---

(۱) سورۂ یوسف آیت (۲۳)۔

مولانا رومی رحمۃ اللہ علیہ کی عجیب نصیحت

بس جب بندہ اپنے حصے کا کام کرلے تو اللہ تعالیٰ اپنے حصے کا کام کردیتے ہیں۔ مولانا رومی رحمۃ اللہ علیہ اپنی مثنوی میں اسی واقعے کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔ ؎

گرچہ رخنہ نیست عالم را پدید
خیرہ یوسف وار می باید دوید

یعنی اگرچہ اس فسق و فجور کی دنیا میں معصیتوں کی آگ بھڑک رہی ہے اور تمہیں بچنے کا کوئی راستہ نظر نہیں آرہا، لیکن مولانا فرماتے ہیں کہ اسی طرح بھاگو جیسا کہ حضرت یوسف علیہ السلام بھاگے، تو جتنا بھاگ سکتے ہو اتنا بھاگ جاؤ اور پھر اللہ تعالیٰ کو پکارو کہ یا اللہ! میرے بس میں اتنا تھا، اب آپ اپنے فضل وکرم سے اپنا کرم فرمادیجیے تو پھر اللہ تعالیٰ کی طرف سے رحمت ہو ہی جاتی ہے۔

گناہ سے بچنے کے لیے دو کام

اسی لیے ہمارے حضرت والا فرمایا کرتے تھے کہ جب کبھی دل میں گناہ کا داعیہ پیدا ہو، دل میں شوق پیدا ہو، گناہ کی خواہش ابھرے تو دو کام کرلو، ایک یہ بچنے کے جتنے سامان ہوسکتے ہیں وہ اپنے اختیار سے کرلو اور پھر اللہ تبارک وتعالیٰ پکارو کہ یا اللہ! آپ مجھے اس سے بچالیجیے۔

اور ہمارے حضرت یہ بھی فرمایا کرتے تھے کہ اللہ میاں سے بے تکلفی سے باتیں کیا کرو۔ اللہ تعالیٰ سے یہ کہو کہ یا اللہ! یہ گناہ کا موقع آرہا ہے اور مجھے اپنے نفس سے خطرہ ہے کہ میں کہیں بھٹک نہ جاؤں، کہیں بہک نہ جاؤں۔ یا اللہ!

میں کمزور ہوں، ناتواں ہوں، اپنی خواہشات کا غلام بنا ہوا ہوں، میں تھوڑی بہت کوشش کر رہا ہوں، لیکن مجھے بھروسہ نہیں ہے کہ تھوڑی بہت کوشش کرنے سے اپنے آپ کو بچالوں گا۔ اے اللہ! جتنا میرے بس میں ہے وہ کروں گا، لیکن بچانا آپ کے قبضے میں ہے، مجھے اس گناہ سے بچالیجیے یا پھر مجھ سے مؤاخذہ نہ فرمایئے گا۔ مجھے اس کے اوپر گناہ نہ دیجیے گا۔ اللہ میاں سے ایسی باتیں کیا کرو کہ جیسے اپنے مہربان پروردگار سے کرنی چاہئیں، تو اللہ تبارک وتعالیٰ کی رحمت سے امید ہے کہ ان شاء اللہ بچالیں گے۔

گناہ سے بچنے کے لیے کوشش ضروری ہے

میں یہ بات بار بار اس لیے عرض کیا کرتا ہوں کہ ہم سب ایک کشتی کے سوار ہیں، آج کل کے ماحول میں چاروں طرف گناہوں کی آگ بھڑک رہی ہے اور اس سے اپنے آپ کو بچانا مشکل لگنے لگا ہے، لیکن کوئی کام اس وقت تک نہیں ہوتا جب تک کہ آدمی اس کی اہمیت محسوس نہ کرے، اس کو اپنی زندگی کا مقصد نہ بنائے اور اس کے لیے کچھ محنت کرے تو اس لیے ہر گناہ سے بچنے کے سلسلے میں کوشش کرنا ضروری ہے، چاہے وہ آنکھ کا گناہ ہو، چاہے زبان کا گناہ ہو، چاہے کان کا گناہ ہو، کسی بھی طرح کا گناہ ہو، یہ محنت تو کرنی ہوگی۔ اگر ہم چاہتے ہیں کہ اللہ تبارک وتعالیٰ کی رضا حاصل ہو اور اس عذاب سے نجات ملے تو یہ کوشش کرنی پڑے گی، جتنا بس میں ہو وہ کر گزرو اور پھر اللہ تبارک وتعالیٰ سے مانگو اور مانگتے رہو۔ اے اللہ! مجھے بچالیجیے، اس طرح سے مانگتے رہو تو ان شاء اللہ، اللہ تعالیٰ کی رحمت سے مکمل امید ہے کہ وہ بچالیں گے۔

اگر پھسل گئے تو!

اور پھر بھی اس کے باوجود کبھی آدمی پھسل جائے تو جو شخص اللہ تبارک وتعالیٰ سے مسلسل مانگتا رہتا ہے، مانگتا رہتا ہے اور اپنی سی کوشش بھی جاری رکھتا ہے تو ایسی صورت میں اللہ تعالیٰ اس کو کبھی نہ کبھی توفیق بھی دے دیتے ہیں، اگر گناہ ہوا بھی تو توبہ کی توفیق مل جائے گی اور کسی نہ کسی وقت اس گناہ سے ان شاء اللہ بچ جائے گا، لیکن یہ جو غفلت ہے، یہ بری بلا ہے کہ آدمی غفلت کی حالت میں زندگی گزار رہا ہے، نہ حلال کی پرواہ ہے، نہ حرام کی پرواہ ہے، یہ بہت بری چیز ہے۔

یہ خیال صحیح نہیں ہے

اور یہ جو دماغ میں بٹھالیا ہے کہ ہم تو ایسے ماحول کے اندر ہیں کہ اپنے آپ کو گناہ سے بچانا مشکل ہے، ہم اپنے آپ کو گناہ سے نہیں بچا سکتے۔ آدمی جب یہ ہوا ذہن میں سوار کر کے بیٹھ جاتا ہے اور بے پرواہ ہو کر کام کرتا رہتا ہے، کوئی خلش دل میں پیدا نہیں ہوتی، کوئی کھٹک پیدا نہیں ہوتی تو یہ خطرناک بلا ہے۔ یہ مصیبت ہے۔ اس سے اللہ تعالیٰ ہر مسلمان کو محفوظ رکھے۔ آمین! یہ کھٹک دل میں پیدا ہو اور بار بار اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرتا رہے، مانگتا رہے، تو ممکن نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کو رد فرما دیں۔

گناہوں سے بچنا کتنا ضروری ہے!

گناہوں سے بچنا سارے نوافل، سارے اذکار، ساری تسبیحات سے زیادہ

ضروری ہے۔ لوگ اس کا تو اہتمام کر لیتے ہیں کہ نفلیں پڑھ لیں، معمولات بنا لیے، تسبیحات پڑھ لیں اور قرآنِ کریم کی تلاوت کر لی، لیکن گناہوں سے بچنے کا اہتمام اس درجے کا نہیں ہوتا۔ نتیجہ یہ کہ زبان سے جھوٹ نکل رہا ہے، غیبت نکل رہی ہے، کسی کی دل آزاری ہو رہی ہے، کس کا دل دُکھایا جا رہا ہے، کسی کو طعنے دیے جا رہے ہیں، کسی پر الزام لگایا جا رہا ہے، بہتان باندھا جا رہا ہے، بے تحقیق باتیں کی جا رہی ہیں۔ حدیثِ مبارک میں سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے بھی جھوٹ کا حصہ قرار دیا[1]۔ یہ زبان اس طرح چل رہی ہے اور پرواہ نہیں ہے۔ یہ ہے بلا، عذاب اور مصیبت، اس سے اپنے آپ کو بچانے کے لیے اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف رجوع کرنے کا اہتمام ہو تو اللہ تبارک وتعالیٰ "صبر عن المعصية" عطا فرما دیں گے۔

○ طاعت کے اوپر صبر

صبر کی دوسری قسم ہے "صبر علی الطاعة" طاعت کے اوپر صبر، یعنی جو طاعت اور جو عبادت اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے ضروری ہے اس ضروری طاعت اور عبادات کو انجام دینے میں جو تکلیف اور ناگواری ہو رہی ہے، اس کو برداشت کرنا اور صبر کرنا، اسے کہتے ہیں: "صبر علی الطاعة"۔

○ نمازِ فجر کے لیے اٹھنا

جیسے فجر کے وقت نماز کے لیے بیدار ہونا مشکل لگتا ہے، میٹھی نیند آ رہی

---

(۱) صحیح مسلم ۱/۱۰ ولفظه: "كفى بالمرء كذبا ان يحدث بكل ما سمع"۔

ہے، بستر آرام دہ ہے، اس وقت نماز فجر کے لیے اپنے آپ کو اٹھانا طبیعت کو بڑا ناگوار ہوتا ہے، طبیعت کو بڑا ناپسند ہے، لیکن آدمی اس ناگواری کو برداشت کر کے اپنے آپ پر زبردستی کرے اور اپنے آپ کو بستر سے اٹھائے تو یہ "صبر علی الطاعة" ہے۔

نماز باجماعت کی ادائیگی

دیکھیے! مسجد سے اذان کی آواز آگئی اور نماز باجماعت کا وقت ہوگیا اور آدمی اپنے کسی ایسے مشغلے میں لگا ہوا ہے، جس میں اس کا دل مشغول ہے، اس وقت اس مشغلے کو چھوڑ کر مسجد کی طرف چل پڑنا، نفس کو ناگوار ہوتا ہے، لیکن اس نفس کی ناگواری کو برداشت کر کے آدمی مسجد کی طرف چل پڑے تو یہ "صبر علی الطاعة" ہے، اللہ تعالیٰ کی اطاعت پر ناگواری کو برداشت کرتے رہنا، بڑی عظیم نعمت ہے۔ اللہ تعالیٰ ہر مسلمان کو عطا فرمائے۔ آمین! جب اس ناگواری کو برداشت کر کے کوئی بندہ طاعت کرتا ہے، معصیت سے رُکتا ہے تو اُسے تعلق مع اللہ پیدا ہوتا ہے۔

حضرت حکیم الامت رحمۃ اللہ علیہ کی شان

ہمارے حضرت حکیم الامت رحمۃ اللہ علیہ کی بات یاد آئی، اللہ تعالیٰ ان کے درجات بلند فرمائے۔ آمین۔ پہلے بھی میں آپ حضرات کو کئی مرتبہ یہ جملہ سنا چکا ہوں اور اپنے حضرت ڈاکٹر صاحب قدس اللہ سرہٗ سے پتہ نہیں کتنی مرتبہ سنا ہے اور حقیقت یہ ہے کہ یہ بار بار سننے اور کہنے کی بات ہے۔ ذرا سمجھیے کہ کون کہہ رہا

ہے؟ وہ مجدد الملت جس نے تصوف کی وادیوں کی سیاحی میں پوری عمر صرف کی ہے اور جو یہ فرماتے ہیں بھئی علماء کی تو بڑی شان ہے، میں تو طالب علم ہوں، وہ اپنے آپ کو طالب علم کہا کرتے تھے، لیکن ساتھ ساتھ یہ فرمایا کرتے تھے کہ ''دو فن ایسے ہیں جن سے الحمد للہ، اللہ تعالیٰ نے مجھے نسبت عطا فرمائی ہے، ایک تفسیر اور ایک تصوف،'' انہوں نے تصوف کی کتابیں پڑھیں، پڑھائیں اور ساری دنیا کو نہال کیا۔

سارے تصوف کا حاصل

وہ ساری تصوف کی وادیوں کی سیر کرنے کے بعد فرمارہے ہیں کہ ''وہ ذرا سی بات جو حاصل ہے تصوف کا، وہ یہ ہے کہ جب کسی طاعت کے کرنے کے وقت سستی ہو تو اس سستی کا مقابلہ کر کے اس طاعت کو کرے اور جب کسی معصیت کا تقاضا ہو تو اس تقاضے کو دبا کر اور کچل کر اس معصیت سے زبردستی کر کے بچے۔'' پھر فرمایا کہ اسی سے تعلق مع اللہ پیدا ہوتا ہے۔ اسی سے تعلق مع اللہ کی حفاظت ہوتی ہے اور اسی سے تعلق مع اللہ ترقی کرتا ہے۔ سارے تصوف کا حاصل تعلق مع اللہ کی مضبوطی ہے، تو سارے تصوف کا حاصل کیا نکلا؟ صبر علی الطاعۃ اور صبر عن المعصیۃ کہ ناگواری پر صبر کر کے طاعت کو کرے اور ناگواری پر صبر کر کے معصیت سے بچے، یہ خلاصہ ہے ساری تصوف کی ریاضتوں اور مجاہدوں کا۔

عزمِ مصمم کرنے کی ضرورت

اور یہ مشق کرنے سے حاصل ہوتا ہے۔ یہ نہیں کہ ایک مرتبہ کہہ دینے اور

ایک مرتبہ عمل کرنے سے یہ بات حاصل ہوگئی۔ اس کے لیے مشق کرنی پڑتی ہے اور مشق کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ سب سے پہلے اپنے آپ کو اس بات پر آمادہ کرے اور اپنے دل میں یہ بات انسان ٹھان لے کہ چاہے دل پر آرے چل جائیں، لیکن مجھے طاعت کرنی ہے اور چاہے دل پر آرے چل جائیں مجھے اس معصیت سے بچنا ہے۔ آدمی ایک مرتبہ یہ عزمِ مصمّم کرلے اور اللہ تعالیٰ سے دعا کرے کہ یا اللہ! میں نے عزم مصمّم کرلیا، لیکن آپ مجھے اس عزم کو پورا کرنے کی توفیق عطا فرمادیجیے، بس یہ کرتا جائے تو پھر رفتہ رفتہ اللہ تبارک وتعالیٰ اپنے فضل وکرم سے منزل تک پہنچادیں گے۔

خطوط میں سستی کا ذکر

بہت سے لوگ مجھے خط لکھتے رہتے ہیں کہ ہم سے معمولات میں سستی ہوجاتی ہے، ادائیگی نہیں ہوتی اور جو نظام الاوقات بناتے ہیں وہ ٹوٹ جاتے ہیں اور جو تلاوت، ذکر اور تسبیحات کے معمولات مقرر کیے ہوتے ہیں، ان کی ادائیگی میں سستی ہوتی ہے، تو اس سستی کو دور کرنے کا کوئی علاج بتادو۔ تو شاید ان کے دماغ میں یہ بات ہے کہ کوئی گولی کھلادی جائے گی، کوئی انجکشن لگادیا جائے گا، اس گولی کھلانے سے اور انجکشن سے سستی دور ہوجائے گی یا کوئی ایسی جھاڑ پھونک کردی جائے کہ اس جھاڑ پھونک کے نتیجے میں سستی دور ہوجائے گی اور چستی پیدا ہوجائے گی۔

دوسرا کوئی حل نہیں

ہمارے حضرت والا حکیم الامت قدس اللہ تعالیٰ سرہٗ فرماتے ہیں کہ سستی کا

علاج بجز چستی کے نہیں ہے۔ سستی کا کوئی علاج نہیں ہے، اس کا حل خود ہی نکالنا پڑے گا اور یہ طے کرنا پڑے گا کہ اپنے اوپر زبردستی کروں گا، چاہے کتنا ہی دل مچل رہا ہو اور دل پر آرے چل رہے ہوں، لیکن زبردستی کروں گا۔ جو وقت جس کام کے لیے مقرر ہے وہ وقت اسی کام میں خرچ کروں گا، چاہے کچھ ہوجائے، دنیا اِدھر سے اُدھر ہوجائے، جب تک ایک مرتبہ دل میں یہ نہیں ٹھان لوگے اس وقت تک سستی زائل نہیں ہوگی۔

مجلس کا خلاصہ

سستی کا علاج چستی ہے اور جب کوئی آدمی دل میں ٹھان لیتا ہے تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے مدد بھی ہوتی ہے، اللہ تعالیٰ کی طرف سے نصرت ہوتی ہے، اللہ تعالیٰ اس کو پہنچادیتے ہیں، لیکن اپنے آپ کو ڈھیلا ڈھالا چھوڑا ہوا ہے اور جو دل کی خواہشات ہیں، انہی کے پیچھے چل رہا ہے، تو پھر اگر اسی طرح چلنا ہے تو ساری عمر یہی رونا رہے گا کہ بہت سستی ہوری ہے اور عزم و ارادہ ٹوٹ جاتا ہے۔ بس ایک مرتبہ اپنے ارادہ کو پختہ کر کے، مضبوطی کے ساتھ یہ طے کرلو کہ کچھ بھی ہوجائے، دل پر آرے چل جائیں، لیکن یہ کام کروں گا، تو پھر اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے مدد و نصرت ہوگی اور اگر پھر بھی کہیں سستی ہوجائے تو اللہ تعالیٰ اپنی طرف لوٹنے کی توفیق عطا فرمادیتے ہیں، یہ اللہ تعالیٰ کی سنت ہے۔

اللہ تعالیٰ ہم سب کو توفیق عطا فرمائے۔ آمین!
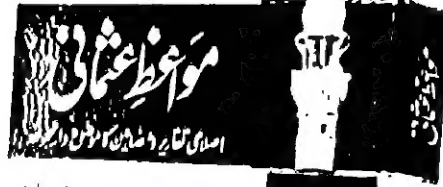
وآخر دعوانا أن الحمد للہ رب العالمین

اصلاحی تقاریر ومضامین کا
موضوع وار مجموعہ

شیخ الاسلام حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب دامت برکاتہم کے جملہ مواعظ، خطبات اور تحریرات کا تخریج شدہ جامع اور مستند ترین موضوع وار مجموعہ ہے، اس مجموعہ میں حضرت مفتی صاحب دامت برکاتہم کی درج ذیل کتب کا استیعاب کیا گیا ہے:

❁ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ❁ اصلاحی خطبات ❁ اصلاحی مواعظ ❁ اصلاحی مجالس
❁ خطباتِ عثمانی ❁ خطبات دورۂ ہند ❁ درسِ شعب الایمان ❁ نشری تقریریں
❁ فردکی اصلاح ❁ اصلاحِ معاشرہ ❁ تربیتی بیانات ❁ ذکر و فکر
❁ the Islamic Months

❁ اس کے علاوہ

❁ آسان ترجمہ قرآن ❁ اسلام اور ہماری زندگی ❁ انعام الباری
❁ تقریرِ ترمذی ❁ جہانِ دیدہ ❁ سفر در سفر
❁ دنیا مرے آگے ❁ اسلام اور جدید معاشی مسائل ❁ ہمارا معاشی نظام

کے منتخب مضامین، ماہنامہ البلاغ اور دیگر مجموعوں اور رسائل میں شامل شدہ، اور بعض صوتی صورتوں میں محفوظ شدہ حضرت والا دامت برکاتہم کے بیانات وخطبات کو شامل کیا گیا ہے، جس سے علماء، طلباء، خطباء اور عام پڑھے لکھے حضرات بآسانی استفادہ کر سکتے ہیں۔